عالم پناہ

رفیعہ منظور الامین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

عالم پناہ

رفیعہ منظور الامین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Alam Panah
by
Rafia Manzoorul Ameen
Rs.95/-



صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/95 روپے
ISBN:978-81-7587-854-9 سلسلۂ مطبوعات: 1679

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
بائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی 110020

انتساب

منظور الامین

کے نام

جن کے ساتھ حیاتؔ

حیات جاوداں بن گئی

ڈیوڑھی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے ایمن ہچکچائی ۔ اس کو شک ہوا کہ کہیں وہ غلط پتے پر تو نہیں پہنچ گئی ہے اس نے اپنے بیگ سے انٹرویو کال کا کاغذ نکالا اور غور سے پڑھا۔

"فرمان" ـــــ گولکنڈہ روڈ نمبر ۴

پتا بالکل صحیح تھا ۔ اور وہ بڑی مشکل سے یہاں پہنچ پائی تی ۔ اسٹیشن سے یہاں تک پہنچنے کے لیے ٹیکسی والے نے اس سے بیس روپے وصول کر لیے تھے ۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ۔ ٹیکسی والا اب بھی ٹیکسی کے دروازے پر ہاتھ رکھے اسے گھور رہا تھا ـــ پل بھر کو ایمن کے پاؤں کانپے ، وحشت طاری ہوئی ـــ وہ بے تحاشا پلٹی کہ ٹیکسی والے کو اشارہ کر کے روک لے اور اسی دم واپس ہو جائے ۔ شہر کی گھما گھمی سے دور جب ٹیکسی سنسان سڑک پر ہو لی تھی تب ہی سے اس کے دل میں وسوسے آرہے تھے ـــ جب وہ بنگلور سے حیدرآباد پہنچی تھی تو اس نے سمجھا تھا کہ فرمان ـــ کسی اور حویلی کی طرح شہر کی کسی بارونق جگہ پر ہو گی ۔ جہاں کم از کم دو بڑی بڑی مونچھوں والے دربان پہرہ دے رہے ہوں گے جو بدقت تمام اسے اندر آنے کی اجازت دیں گے ۔ اب شہر کی گھما گھمی سے دور اس جگہ پہنچ کر اس نے سوچا کہ کاش پہلے سوچ لیا ہوتا ـــ لیکن اب وہ وہاں اس بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی ـــ اس نے خود پر قابو پا لیا ۔ وہ اتنی دور تن تنہا یوں ہی نہیں اٹھ آئی تھی ـــ سوچ سمجھ کر ہی اس نے وہ قدم اٹھایا تھا ۔ ٹیکسی والے نے اس کا تذبذب بھانپ لیا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ شاید وہ حسین تنہا لڑکی اسے رکنے کے لیے کہے اور اسے شہر خالی واپس نہ جانا پڑے ۔ لیکن جب اس نے ایمن کو فیصلہ کن انداز میں پلٹتے دیکھا تو مجبوراً اپنے بریک چھوڑ دیے اور ٹیکسی ڈھلان پر پھسلنے لگی ۔

ایمن نے کن انکھیوں سے ٹیکسی کو واپس جاتے دیکھا اور ارد گرد کے سکوت نے گویا اسے محصور کر لیا ـــ کیا ہوا ـــ اگر اسے وہ نوکری نہ ملے ! ـــ وہ وہاں سے شہر کیسے واپس جائے گی ؟ دُور دور کہیں بس اسٹینڈ کا پتا بھی نہیں تھا ۔ ٹیکسی کے لیے بیس ـــ بہت گراں ! بیس روپے اس نے

یہ معلوم کر کے ہی خرچ کیے تھے کہ اس مقام تک کوئی بس نہیں جاتی ـــ حویلی کا گیٹ تھا بھی شاہراہ سے کچھ دُور، اور وہاں تک پہنچتی ہوئی بجری والی سڑک ایسا لگتا تھا جیسے حویلی کے مالکوں نے ہی اپنی سہولت کے لیے بنوائی تھی۔ آس پاس لکر وندوں کی جھاڑیاں خوش رنگ لکروندوں سے بھری تھیں جن کے درمیان کہیں کہیں گہری سرمئی ڈھلی ڈھلی سی چٹانیں ایسی لگتی تھیں جیسے ہاتھیوں کے غول کھڑے ہوں۔ برگد کے بیط پیڑ ــ جٹائیں زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ جہاں چرواہے بچے اپنی میلی کچیلی جھولیوں میں زمین پر گرے میٹھے بیر ٹور رہے تھے۔ ٹیکسی کو دیکھ کر وہ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تھے۔ اور جب ٹیکسی جانے لگی تو وہ سب 'ہو' 'ہو' چلاتے دور تک اس کے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی ـــ اب وہ واپس آکر پھر اپنے کام میں جُٹ گئے تھے۔

ایمن نے ماحول کے اس قوی ہاتھ کو اپنے شانے سے جھٹکا اور دھڑکتے دل کو قابو میں لانے کے لیے دو تین سانسیں لیں۔

لوہے کے اس پُر وقار پھاٹک پر کوئی دربان نہیں تھا، پھر بھی وہ اس سے مرعوب ہو رہی تھی ـــ اپنی کمزوری پر خود کو ٹوکتے ہوئے وہ آگے بڑھی آخر وہ نوکری کی تلاش میں ہی تو آئی تھی کسی ڈاکے چوری کی نیت سے نہیں آئی تھی۔ پھر یہ اضطراب کیسا تھا؟ اس نے اپنے بے جا خوف کو باہر چھوڑا اور گیٹ میں داخل ہو گئی ۔

حویلی ایسا لگتا تھا کہ بہت بڑے احاطہ پر بنی تھی۔ گیٹ میں داخل ہو کر کافی آگے بڑھنے پر بھی دُور دور اس کا نشان نہیں تھا۔ اندر سیدھی جانب ایک بہت بڑے باغیچے کے کھنڈر تھے جس نے ضرور کبھی شاہجہانی دن دیکھے ہوں گے لیکن اب آنجہانی ہو کر رہ گیا تھا ـــ سبزے کی شادابی معدوم تھی ـــ کیاریاں ویران پڑی تھیں ـــ روشیں سسک رہی تھیں، اور بیلیں سر لٹکائے نوحہ گر ـــ حویلی کی طرف جاتی اکھڑی ہوئی بجری والی سڑک کی بائیں جانب، بڑا سا تالاب نما حوض سوکھا پڑا تھا جانے نہیں سنہری مچھلیوں کے کتنے زر تاب بدن اس حوض کے فرش سے پیوست ہو گئے ہوں گے ـــ ایمن کو چتوڑ گڑھ کا جوہڑ یاد آگیا، جہاں وہ کالج کے ایک گروپ کے ساتھ گئی تھی ـــ چتوڑ کے قلعہ میں وہ جوہڑ کے پاس دم بخود کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے احساس کی کٹھالی میں سیکڑوں زخمی اور جھلسے ہوئے بدن تلملانے لگے تھے ۔ علاء الدین خلجی اور اس کی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپیں کمزور پر زبردست کی

چیرہ دستی کا اعلان کر رہی تھیں ۔ اس نے جوہر میں پدمنی کے ہوش ربا حسن کو شعلہ پوش ہوتے دیکھا تھا۔ صرف وہی نہیں، اس کی ساتھی دوسری لڑکیوں کے چہروں پر بھی وہی رنگ تھا، مایوسی کا رنگ ۔ کیونکہ انھوں نے بھی عورت کا جنم لیا تھا ۔ اس لیے عورت کی بے بسی کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر ایمن کے دل میں شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام کے خلاف ایک بغض جاگتا ۔ جیسے بادشاہوں اور شاہ زادوں نے ہی عورت کی درگت بنائی ہو ۔ وہ بھول جاتی تھی کہ عورت صرف امیر ہی کی نہیں، غریب کی بھی تقدیر ہے ۔ جسے ہر شخص اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتا ہے ۔ گیلی مٹی کی طرح ۔ اپنی پسند کے مطابق جیسا چاہا ویسا کھلونا بنا لیا ۔ پسند نہ آیا تو پٹک کر ریزہ ریزہ کر دیا ۔ ہر مرد کی پھوٹی تقدیر کا الزام بھی عورت ہی پر آ جاتا ہے ۔ لیکن اس وقت وہ عورت کا مقدمہ لیے خدا کے حضور نہیں جا رہی تھی اسے تو نوکری کی ضرورت تھی ۔

وہ اپنے اکلوتے سینڈلوں کو سنبھالتی ۔ اکھڑی ہوئی بجری پر پاؤں دھرتی، آگے بڑھی ۔ حویلی کا اب بھی پتا نہیں تھا ۔ اس کنڈلی دار سڑک کے ایک موڑ پر ایک سائیکل سوار اس کے برابر سے گزر گیا ۔ وہ شاید کوئی خدمتگار تھا ۔ ٹوپی ماتھے پر آگے کو کھسکائے وہ کسی فلمی دھن پر سیٹی بجاتا، سائیکل پر چلا آ رہا تھا ۔ سائیکل بجری پر تھر تھرا رہی تھی ۔ اور یہی ارتعاش اس کی سیٹی میں بھی تھا ۔ وہ اپنے دونوں گھٹنے باہر کو پھیلائے ہوئے تھا ۔ کیونکہ سائیکل کے ہینڈل سے لٹکی ہوئی بڑی ٹوکری زبردست ہچکولے لے رہی تھی ۔ ایک اجنبی لڑکی کی غیر متوقع موجودگی نے اسے کچھ اس طرح بوکھلا دیا کہ اس کے ہونٹ تو سیٹی بجاتے رہے لیکن آواز نے ساتھ چھوڑ دیا ۔ پہلے تو ایمن نے رک کر اس سے پوچھنا چاہا کہ حویلی اور کتنی دور تھی، لیکن پھر خیال بدل دیا ۔ کیونکہ وہاں راستہ ایک ہی تھا جو ظاہر ہے کوٹھی تک ہی جاتا ہوگا ۔ خدمتگار ایک پاؤں زمین پر ٹکائے دور تک اس کو جاتے دیکھتا رہا ۔ پھر اچانک اسے اپنا کام اور فلمی گانے کی دھن یاد آگئی جسے اس نے ادھورا چھوڑ دیا تھا ۔ وہ اچھل کر سائیکل پر بیٹھ گیا اور اپنے سفر پر چل پڑا ۔

نو بج رہے تھے، پھر بھی فروری کی ہلکی دھوپ خاصی خنک تھی ۔ ایمن نے جلدی جلدی قدم بڑھائے ۔ اسے ٹھیک نو بجے وہاں پہنچنا تھا ۔ پیچھے بجنے والے ہارن نے اسے بُری طرح چونکا دیا ۔ وہ اُچھل کر ایک طرف کو ہو گئی ۔ ایک لمبی سی سیاہ کار جسے باوردی شوفر چلا رہا تھا ۔ تیز رفتاری سے دھول اُڑاتی اس کے برابر سے گزر گئی ۔ ایمن نے دھول سے بچنے کے لیے اپنا رومال ناک اور آنکھوں پر رکھ لیا ۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہی اس نے آنکھوں پر بڑا سا سیاہ چشمہ لگائے ہوئے اس سرخ

دسپید حسین لڑکی کو دیکھ لیا تھا جو پچھلی سیٹ پر بچوں بیچ بیٹھی تھی۔ نیلے رنگ کے لباس میں اس کا چہرہ سمندر میں ڈوبتے اچھوتے موتی کی طرح دمک رہا تھا۔ سیاہ بالوں کی گھٹائیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں ۔۔۔ کار تو گزر گئی لیکن ایمن سنبھلنے کی کوشش کے باوجود لڑکھڑا گئی اور خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں اس کی ہتھیلیاں گلاب کی خار دار جھاڑی سے زخمی ہو گئیں ۔ لیکن یہ ہتھیلیوں سے کانٹے چننے کا وقت نہیں تھا ۔ نو بجنے ہی والے تھے اور حویلی سامنے نظر آ رہی تھی۔

اچانک اس سربلند حویلی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی ۔ حویلی کے اطراف میں باغ کی حالت اتنی ناگفتہ بہ نہیں تھی ۔ روشیں فریادی اور پودے نڈھال نہیں تھے ۔ لکڑی کے بڑے بڑے گملوں میں لگے پام کے صحت مند چکنے پتے شہادت دے رہے تھے کہ ہماری دیکھ بھال ہوتی ہے ۔ ہائی بسکس کے خوش رنگ گلابی جھمکے ستونوں سے لپٹتے اوپر چڑھ رہے تھے ۔ اونچے اونچے ستونوں والے پورٹیکو میں وہی سیاہ کار کھڑی تھی اور باوردی شوفر مجلا کار کو اور بھی چمکا رہا تھا ۔۔۔ لامتناہی سیڑھیوں کے اوپر وسیع دالان اور دریچوں پر جالی دار چھجے عہد رفتہ کی یاد دلاتے تھے ۔

سیڑھیوں کے پایدان پر کھڑی ایمن کچھ نروس سی ہونے لگی ۔ ادھر سیڑھیوں کی بلندی پر ایک ملازم نمودار ہوا اور اسے کچھ عجیب نظروں سے گھورنے لگا ، گویا اس کے آنے کا مقصد جاننا چاہتا تھا ۔۔۔ وہ ادھیڑ عمر کا گھاگ ملازم اس حویلی کے کئی موسم دیکھ چکا تھا ۔۔۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھتے ایمن کے ہر قدم کو تہدیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا ۔ گویا نظروں ہی نظروں میں کہہ رہا ہو :

' میں خوب جانتا ہوں تمہاری اس قسم کی چھوکریوں کو ۔۔۔ اب تمہارے بیگ سے عرضی نکل آئے گی کہ امتحان کی فیس دینے کے لیے مدد کیجیے ۔۔۔ یا پھر تمہارا باپ بیمار ہو گا جس کی دوا کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو گی ۔۔۔ مانگنے والے بھی اب کتنے بدل گئے ہیں ۔ اللہ بخشے بڑے نواب صاحب جب زندہ تھے تو لوگ مجرا کرانے کے لیے ، مدد مانگتے تھے ۔ ہاتھی کی جھول سلوا کر انعام کے لیے گڑگڑاتے تھے ۔۔۔ نہ اب ویسے مدد مانگنے والے دعا گو رہے ، نہ ویسے مددگار بچے جو ایک ہاتھ سے خیرات دیتے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی ۔ اب تو لوگ دو روپے خیرات کر کے اخباروں میں مشتہر کرواتے ہیں '

اتنی دیر میں ایمن سنگ مرمر کی سیڑھیاں طے کر کے برآمدے میں پہنچ گئی تھی ، لیکن وہیں اس کے پاؤں گویا زمین نے پکڑ لیے ۔ ہیٹ بیگ کے برابر لگے قدِ آدم آئینے میں اس کا سراپا جھلک رہا تھا ۔ سبز رنگ کی شلوار قمیص میں چھریرے بدن کی ایک لڑکی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی ۔

جس کا رنگ کھلتا ہوا چمپئی تھا، سبک ناک کے نیچے ترشے ہوئے خوش وضع لب، ٹھوڑی کے تکون کو خوبصورت گولائی دے رہے تھے، لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب اس کی آنکھیں تھیں، جس سے ٹکرا کر ہر نظر پاش پاش ہو جاتی تھی ۔ ان آنکھوں میں ایک کشش تھی ایک جادو تھا، ایک پُراسرار کیفیت تھی جو مسافروں کا راستہ بھلا دے ۔ ان آنکھوں کا رنگ انوکھا تھا ـــــ وہ سنہری آنکھیں اس وقت سبز لباس کے عکس سے سبزی مائل نظر آ رہی تھیں ۔ مجموعی طور پر ایمن کو حسین نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ دیکھنے والا اسے دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتا، تاہم اس وقت وہ خود کو شیشے میں دیکھ کر بھونچکا رہ گئی اس کا دل بیٹھ گیا ـــ "اب مل چکی مجھے یہ نوکری" ـــ اس نے مایوس ہو کر سوچا ـــ کیونکہ اس کے بالوں کی لٹیں فیتے سے آزاد ہو کر اس کے چہرے پر جھول آئی تھیں ۔ اور چہرے پر گرد کی تہیں جمی تھیں ۔ سبز دوپٹا خاردار جھاڑی میں الجھ کر دو جگہ سے پھٹ گیا تھا اور چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں ۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے بیگ سے رومال نکال کر چہرے کو صاف کیا، فیتہ کھول کر جلدی سے بال باندھے اور دوپٹے کے چاک کو تہوں میں چھپانے لگی ۔ تب کہیں اسے اپنے ہتھیلیوں میں جلن کا احساس ہوا ۔ اس نے دونوں ہاتھ کھول کر دیکھے ۔ ان میں جا بجا خراشیں ابھر آئی تھیں جن سے خون رِس رہا تھا ـــ اس نے قہر آلود نظروں سے پورٹیکو میں کھڑی چمکتی کار کو دیکھا ۔ اسے وہ کار مسکراتی نظر آ رہی تھی ۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" ـــ بوڑھے ملازم نے پوچھا
"مجھے، مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا ہے" ۔ ایمن نے کہا ۔
"کیا بولے آپ؟" بوڑھے نے بات نہ سمجھتے ہوئے کہا ۔
"مجھے ملنے کے لیے بلایا گیا ہے" ۔ ایمن نے بات بدل کر کہا ۔
"حاضری دینے کو آئے آپ ـــ ایسا بولو نا" ـــ بوڑھا اب سمجھا ۔

"بڑے سرکار سے ملنا ہے کیا آپ کو؟" ـــ اس نے ایمن کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے تفتیش کی ۔ پھر کچھ جھجک کر بولا" آپ ایسا کرو بی بی، یاں بیٹھ جاؤ" ۔ اس نے ایک آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ میں اندر خبر کرتوں (کرتا ہوں)

ایمن نے خود اعتمادی کی زبردست ضرورت محسوس کی ۔ وہ اتنی جلدی نروس ہونے والی تو نہیں تھی ۔ شاید اسے اس نوکری کی سخت ضرورت تھی' وہ فکر مند تھی ـــ لیکن اس سے پہلے بھی تو وہ کتنی بار نوکری کر چکی تھی، اور اب بھی وہ بے روزگار تو نہیں تھی ۔ اصل میں اس نوکری کی نوعیت

اور اہمیت کچھ اور تھی اب وہ باہر کی دنیا اُس کے اندیشوں اور افتاد سے تنگ آ چکی تھی - وہ حویلی کی چہار دیواری میں سکون اور طمانیت ڈھونڈ نا چاہتی تھی - لیکن اس مرعوبیت کا جواز اس کی سمجھ میں نہیں آیا ــــ اس نے بڑی کوشش سے اپنا دھیان دوسری طرف پلٹا اور خود کو یکسر نظر انداز کر کے اپنے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔

حویلی کے جاہ وحشم کے باوجود ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ جو اسے سنبھالے کھڑا تھا، اب تھک رہا تھا - دریچوں کے جالی دار سفید کنگرے، کہیں کہیں شکستہ تھے - بلند دروازوں میں لگے بڑے بڑے شفّاف شیشوں میں کوئی کوئی شیشہ غائب تھا۔ دروازوں کے ہینڈل اور پیتل کے بڑے بڑے گملے تازہ کی ہوئی پالش سے چمک رہے تھے - کچھ ملازم اِدھر اُدھر پھر رہے تھے جو کافی بیدار اور چست تھے - لیکن حویلی کے حدود، جس میں ملحقہ ونگ بھی شامل تھا، دیکھتے ہوتے ایمن کو اچنبھا ہوا کہ اس حویلی کی شان وشوکت کو بنائے رکھنے کے لیے کتنے ہی خدمتگاروں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔

"بڑے سرکار آپ کو یاد فرما رہیں"۔ بوڑھے ملازم نے اس کے خیالات کے تانے بانے کو توڑا۔

ایمن کے حواس اب مجتمع ہو چکے تھے ۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور ملازم کے ساتھ ہولی باہر جو کچھ ہوگا سو ہوگا لیکن حویلی کا جاہ حشم اندر اب بھی باقی تھا۔ جو اسے پھر ایک بار مرعوب کرنے لگا تھا - بڑے وسیع ہال میں جو کسی زمانے میں بال روم کی طرح استمال کیا جاتا ہوگا جھاڑ فانوس کی ٹنگ لنگ ٹنگ لنگ نے اس کا استقبال کیا - پچی کاری کی ہوئی چھت سے ایک قطار میں تین بڑے بڑے جھاڑ فانوس جھول رہے تھے دیواروں پر دیو ہیکل آئینے سنہری فریموں میں جڑے تھے ــــ پیروں تلے لکڑی کا فرش گو پالش کو ترس رہا تھا لیکن ہر قدم پہ ہوتے ہوئے دھڑک جاتا تھا ــــ دو شاندار نصف کر دی سیڑھیاں اوپر گیلری میں پہنچتی تھیں جو ہال کے اطراف گھومتی چلی گئی تھیں - یہ ہال صرف مغربی ڈانس پارٹیوں کے لیے ہی نہیں تھا۔ بلکہ جب یہاں مشاعرے اور قوالیوں کی محفلیں بپا ہوتیں تو ان کی سج دھج قابل دید ہوتی ــ ہال کے وسیع و عریض فرش کو سفید چاندنیوں سے ڈھک دیا جاتا جن پر بیش قیمت قالین اور گاؤ تکیے لگا دیے جاتے ــــ محفل کی خصوصیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا - حتیٰ کہ جن خوشبوؤں سے ہال کو معطر کیا جاتا وہ بھی ہر موقع کے لحاظ سے مختلف ہوتیں ــ اوپر کشادہ گیلریوں میں خواتین کا انتظام ہوتا۔ تب

چلمنوں سے وہ وہ رنگ جھلکتے کہ خدا کی پناہ۔

ہال کے بیضوی سرے پر گھوم کر اوپر جاتے ہوئے دو طرفہ مخملی قالین گو اب اتنے دبیز نہیں رہے تھے لیکن رنگوں کی آن بان ابھی باقی تھی۔ سیڑھیاں اتنی چوڑی تھیں کہ سات آٹھ آدمی ایک ساتھ اوپر چڑھ سکتے تھے۔

سیڑھیاں پار کر کے بائیں ہاتھ کو گھومتے ہوئے دوسرے دروازے پر ملازم رک گیا اور اس کے ساتھ ہی ایمن بھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا وہ ایک مردِ جا انٹرویو کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن یہ بظاہر کوئی خواب گاہ معلوم ہوتی تھی، جو کسی انٹرویو کے لیے نہایت ناموزوں جگہ تھی — بڑے سرکار۔ اگر خدانخواستہ بیمار تھے تو انٹرویو کو کچھ دن کے ملتوی کیا جا سکتا تھا۔ ایمن کے دل میں شبہات جاگنے لگے۔ اسے آنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لینا چاہیے تھا۔ اخبار میں ایک متموّل گھرانے کے لیے جنرل اسسٹنٹ کی ضرورت کا اشتہار پڑھ کر شاید اس نے بغیر سوچے سمجھے ہی درخواست بھجوا دی تھی۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دیکھ کر اور بھی کئی درخواستیں بھجوائی تھیں — لیکن اسے یا تو بلایا ہی نہیں گیا تھا یا رسمی طور پر بلا کر ٹرخا دیا گیا تھا۔ کیوں کہ اس جگہ پہلے ہی کسی اور کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ اشتہار دیکھ کر درخواستیں بھجوانا گویا اس کی عادت بن گئی تھی۔ حد تو یہ کہ درخواست بھجوا کر وہ بھول ہی جاتی تھی کہ اس نے درخواست بھجوائی بھی ہے۔ اسے صرف وہ مواقع یاد رہ گئے تھے، جہاں اس کی صلاحیتوں سے زیادہ کمر کے خم اور اس کے خدوخال کے تیکھے پن کا زیادہ معائنہ کیا گیا تھا، اور وہ بوکھلا کر باہر نکل آئی تھی۔ ایسے میں حویلی کے اشتہار نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کاش اسے یہ جگہ مل جائے۔ لیکن اب وہ کسی اور سوچ میں پڑ گئی تھی۔ جب اس نے اشتہار دیکھا تھا تو اس میں عورت یا مرد ہونے کی کوئی قید نہیں تھی اسی لیے اس نے درخواست بھجوا دی تھی۔ وہ اشتہار اتنا مبہم تھا کہ متعلقہ فرائض کے بارے میں کوئی بھی خیال قائم کرنا مشکل تھا اور اب جبکہ وہ وہاں پہنچ گئی تھی تو اس کے دل میں رہ رہ کر وسوسے جاگ رہے تھے۔ یوں بھی نوابوں اور ان کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کے بارے میں پہلے ہی سے اسے اندیشے تھے۔ وہ انھیں سماج کا ناسور سمجھتی تھی — وہ 'فرمان' — بھی دل میں ایک حقارت لیے پہنچی تھی۔ اس نے نوابوں کے بارے میں صرف سنا ہی تھا۔ یا ان کی حویلیاں فلموں میں ہی دیکھی تھیں — سرمایہ داری سے نفرت ایک یقینی ردِ عمل تھا۔ لیکن 'فرمان' حویلی کے پھاٹک ہی سے اس کے خیالات میں طوفان سے اٹھنے لگے تھے اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں صرف احساسِ محرومی اور نفرت ہی سے کام نہیں چلے گا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی — اور اب جب نواب

صاحب نے خواب گاہ میں بلوایا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اُلٹے پیروں بھاگ جائے یا جس طرح کمر ہمت باندھ کر آئی تھی، ڈٹی رہے۔ اگر اسے چن بھی لیا جاتا تو نوکری قبول کرنا یا نہ کرنا تو اس کے اختیار میں تھا — اور اب تو اسے بھوک بھی ستانے لگی تھی — وہ صبح کو صرف ایک کپ چائے پی کر چلی تھی — اب وہ چاہ رہی تھی کہ جلد از جلد یہ مرحلہ طے ہو اور وہ کسی نتیجے پر پہنچ جائے۔ اسٹیشن پر وہ کچھ کھا پی لیتی تو اچھا تھا لیکن وہاں اس کی بھوک مر سی گئی تھی۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ تلاش معاش کے سلسلے میں وہ پہلی بار بنگلور سے باہر نکلی تھی۔ اب بھوک سے اس کے ہاتھ پاؤں شل اور دماغ بوجھل ہونے لگا تھا۔

ملازم نے دروازے پر پڑا دبیز پردہ اٹھایا اور وہ اندر داخل ہو گئی — وہ کافی بڑا کمرہ تھا، جہاں بنفشئی سویرا سا ہو رہا تھا۔ پرانی وضع کا باوقار فرنیچر سارا سفید تھا۔ لیکن اپ ہولسٹری اور بڑے دریچوں سے لٹکے ہوئے پردے بنفشئی تھے۔ ایمن کے پاؤں بھی ایک سفید اور بنفشئی قالین میں دھنسے جا رہے تھے۔ دیوار سے لگی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل پر بھی سفید پورسلین کے گلدان میں بنفشئی پھول تر و تازہ تھے۔ اس کمرے کی لطیف فضا بتاتی تھی کہ وہ کمرہ بلاشبہہ کسی مرد کا نہیں ہو سکتا تھا — پھر بڑے سرکار کہاں تھے؟ اس کی نظر گلدان سے ہٹ کر سیدھی مسہری پر گئی اور وہیں رک گئی — دو خاموش تجربہ کار آنکھیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں — وہ ایک سن رسیدہ خاتون تھیں۔ ایمن نے اتنی خوب صورت خزاں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ساٹھ پینسٹھ کا سن، سرخ و سفید رنگ، تنگ دہانہ، ستواں ناک اور خوش وضع ابروؤں کے نیچے غلافی آنکھوں کی گہرائی میں ایمن ڈوبنے لگی۔ چاندنی کا تنگ موری کا پاجامہ مہین جالی کا کھڑا دوپٹا اور کارگے کی کرتی چولی۔ سفید دودھیا سے کپڑوں میں ان کا گلابی رنگ پھوٹا پڑتا تھا۔

"خادم حسین تم جا سکتے ہو۔" بیگم نے اپنے ہاتھ کی کتاب میں ترک رکھ کر بند کرتے ہوئے ملازم سے کہا جو پردے کے پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ "شمشاد کو بھیجو۔"

"جو حکم بڑے سرکار۔" خادم حسین نے ادب سے کہا اور چلا گیا۔

ایمن نے گہری سانس لی تو یہ تھیں بڑی سرکار — وہ حیدر آباد میں نئی تھی — زبان کے اس دلچسپ پہلو سے واقف نہیں تھی۔

"تسلیم!" — ایمن نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

"تم دس منٹ دیر سے آئی ہو۔" بڑی سرکار نے اشارے سے سلام لیتے ہوئے کہا۔

اب ایمن کیا کہتی کہ راستے میں کانٹوں نے دامن تھام لیا تھا۔

"میں وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ جاتی، مگر۔ ۔ ۔ ۔"

"جو انسان وقت کی قدر نہیں جانتا وہ دنیا میں کسی اور چیز کی قدر نہیں پہچان سکتا۔"

ایمن پہلے ہی بھوک سے پریشان ہو رہی تھی ـــ بڑی سرکار کے الفاظ نے اس کی آنکھیں جھلملا دیں ـــ ہتھیلیوں کی جلن اور چبھن اسے اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ دبیز مخملی، آسودہ ماحول میں رہنے والے بھلا عوام کی دیر سویر کی گوناگوں وجوہ کو کیسے سمجھیں ـــ شاید اس نے بڑی سرکار کو سمجھنے میں جلد بازی کی تھی۔

"بیٹھ جاؤ" ـــ انھوں نے اسے بغور دیکھ کر کہا "کچھ کھا پی کر چلی تھیں؟"

ایمن نے کچھ رک کر سر ہلا دیا۔ "وقت نہیں ملا ـــ ٹرین لیٹ تھی۔"

"کچھ ناشتہ منگواؤ شمشاد" ـــ بڑی سرکار نے اس عورت کو حکم دیا جو چپ چاپ آکر ان کی پائنتی کھڑی ہو گئی تھی۔

گہرے سانولے رنگ کی فربہ اندام شمشاد لگ بھگ بڑی سرکار ہی کی عمر کی تھی۔ سفید بوسکی کا کرتا اور گلابی صاف ستھری ململ کی ساری کان بھر سونے کے موتی ٹنا ٹنکے، گلے میں چاندی کا تھپڑا اور موتی چور کے چاندی کے ٹھسے والے کڑے ـــ چھوٹی سی دبی ننا چوٹی جس میں بانٹ کر موباف باندھی ہوئی تھی ـــ وہ ایمن کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی ـــ بڑی سرکار کا حکم پا کر وہ چلی گئی تو بڑی سرکار پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تم بنگلور سے آئی ہو" ؟

"جی" ـــ

"اتنی دور ـــ حیدرآباد آکر نوکری کرنے کی تمھیں ضرورت کیوں آپڑی ہے" ـــ بڑی سرکار نے اس کے کچھ بے ترتیب لیکن اچھوتے سراپا کو دیکھ کر پوچھا "تمھاری عمر تو زیادہ نہیں لگتی ـــ تمھارے گھر والوں نے کس طرح تمھیں اتنی خود مختاری کی اجازت دی" ؟

"جی میری عمر تیئیس (۲۳) سال ہے" کوئی گرم سی شے حلق سے ابھر کر ایمن کی آنکھوں تک پہنچنے لگی۔

"یہ میرے سوال کا مکمل جواب نہیں ہے" ـــ بڑی سرکار شستہ زبان بولتی تھیں۔

"میرے ماں باپ نہیں ہیں" ـــ ایمن نے اپنی زخمی اور مرہم کو ترستی ہتھیلیوں کو دیکھتے

ہوئے جواب دیا۔

"تو تم نے ہوم سائنس سے گریجوایشن کیا ہے؟" بڑی سرکار نے اس کے چہرے کے تاثر کو دیکھ کر فوراً بات کا دھارا موڑا۔

ایمن نے صرف سر ہلا دیا۔ پھر رک کر کہا "کچھ اور بھی کام جانتی ہوں۔ لیکن ان کی کوئی ڈگری میرے پاس نہیں ہے۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً — ٹائپنگ اور ڈرافٹسمین کا کام میں نے سیکھا ہے۔"

"اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔" بڑی سرکار نے اس کی اطلاع کو گویا رد کرتے ہوئے کہا — انہیں بظاہر اس کی ٹیکنیکل قابلیت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ "کیا کرتے تھے تمہارے والد؟"

"اماں بچپن میں ہی چل بسی تھیں۔" اس نے اپنی زخمی ہتھیلیوں پر نظر جما کر کہا۔

اسے اب بھی اپنی ماں کا دھندلا سا عکس یاد تھا۔ یا پھر یہ اس کے والد کے تخیل اور الفاظ کا کرشمہ تھا کہ ماں کی ایک ایک ادا اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی — وہ کہا کرتے تھے کہ ایمن ہوبہو ماں ہی کی شکل تھی۔ بابا اماں کو بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے کھل کر کبھی اس کے سامنے اس بات کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لوگ تو یہی کہتے تھے، ورنہ کیوں وہ اپنی جوانی کی تنہائی برداشت کرتے۔ کبھی کی دوسری شادی کر لی ہوتی انھوں نے۔ ایمن کو ان کی بیماری کا آخری زمانہ یاد آیا — ان کی آنکھیں بند تھیں، اور وہ چپ چاپ بستر پر پڑے تھے۔ ایمن نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں شانہ کرنے لگی۔

"بہت سکون مل رہا ہے بیٹی۔" انھوں نے زیر لب کہا تھا۔ اور ایمن کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔ پھر اس کے والد نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جو چند دن بعد موت کی خاموشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"تمھاری زندگی کا دوسرا حادثہ کب ہوا؟" بڑی سرکار نے پوچھا

"دو سال پہلے انتقال ہوا تھا بابا کا۔" ایمن نے چونک کر کہا۔

"تب سے اب تک تم اکیلی ہی رہ رہی ہو؟" بڑی سرکار نے شمشاد کو اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ناشتے کی ٹرالی لائی تھی۔

"جی نہیں — ہم ایک بہت ہی مہربان کرسچین لیڈی کے گھر رہتے تھے۔ مسز آمزاک ان کا نام ہے۔ وہ بابا کو اپنے لڑکے کی طرح چاہتی تھیں — بچپن میں انھوں نے ہی میری دیکھ بھال کی تھی۔"

"کی تھی؟ ... تو کیا اب وہ ... ؟" بڑی سرکار نے استفسار کیا۔

"ایک طرح اب بھی وہی میرا سہارا ہے۔" ایمن نے جلدی سے کہا۔ "بابا کے گزر جانے کے بعد انھوں نے مجھے خود اپنے پاس رکھ لیا — کیونکہ انھیں گھر کا وہ حصہ کرایے پر اٹھانا تھا۔"

"اور اب وہ تمھیں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" ایمن بے چین ہوکر بولی — "وہ اب بھی مجھے اتنا ہی پیار کرتی ہیں۔"

"پھر کیا وجہ ہوئی جو تم نے انھیں چھوڑنے کا ارادہ کیا؟" بڑی سرکار نے اس کا تذبذب دیکھتے ہوئے کریدا۔

"بابا کے مرنے کے بعد جو تھوڑا بہت پیسا تھا اس سے میرا کام چلتا رہا۔ پھر مجھے آنٹی پر بار بنے رہنا اچھا نہیں لگا۔ میں نے ایک دکان میں سیلز گرل کی نوکری کرلی۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے — میں نے پوچھا تھا کیا وہ ..... مسز آمزاک تمھیں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ — کیوں اب تم انھیں چھوڑ کر میرے پاس آنا چاہتی ہو —؟"

"آپ کے پاس کام کرنا — سیلز گرل ہونے سے بہتر ہے —" اس کا تامل پھر بھی بڑی سرکار کی غلافی آنکھوں سے چھپا نہیں رہا۔

"اصل وجہ بتاؤ۔" انھوں نے کچھ بے چین ہوکر پوچھا۔

ایمن کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی —" آنٹی کے نئے کرایے دار دو لڑکے ہیں۔ وہ انھیں اچھا کرایہ دیتے ہیں — میں نہیں چاہتی کہ آنٹی انھیں میری وجہ سے نکال دیں اور ان کا نقصان ہو۔"

"تم کیوں سمجھتی ہو کہ تمھارے ہوتے ہوئے وہ نہ رہیں گے؟"

"وہ رہیں گے — لیکن ان کے ہوتے ہوئے میں وہاں نہیں رہ سکوں گی۔" اس کا سر جھک گیا۔

بات چیت کے دوران پل بھر کو بھی بڑی سرکار کی نظر ایمن پر سے نہیں ہٹی تھی — وہ بھی اپنی ہی باتوں اور یادوں میں گم محسوس نہ کرپائی کہ اس نے بات چیت کے دوران ہی ناشتے کے ساتھ

پورا انصاف کر دیا تھا ــــــ اسے ندامت سی ہونے لگی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
پردہ اٹھا کر وہی ہوش ربا لڑکی داخل ہوئی جس کی کار نے امین کو کانٹوں میں کھدیڑ دیا تھا۔ اس نے وہی لباس پہنا ہوا تھا نیلا بلاؤز جو بڑی ڈھٹائی سے آگے اور پیچھے بہت دور دور تک کھلا ہوا تھا اور گلے میں اسی رنگ کی موتیوں کے لچھے پڑے تھے ـــ وہ ہاتھ میں ایک اردو اخبار تھامے ہوئے تھی ـ "رہبر دکن"ــ اس نے ایک نگاہ غلط انداز امین پر ڈالی اور جھک کر بڑی سرکار کا ماتھا چوم لیا۔
"اللہ ــــ! سرکار کیسی ہے طبیعت اب آپ کی؟" شاہانہ صاحبزادی نے اٹھلا کر پوچھا۔
"شکر ہے ــــ کہاں سے آ رہی ہو؟" ــ بڑی سرکار نے اس لڑکی کا شانہ تھپتھپایا۔
"مجھے سانس لینے تک کی فرصت نہیں مل رہی ہے سرکار ــ فینسی فیئر کا ڈھیروں کام میرے ہی کندھوں پر ڈال دیا ہے، کلب کے سکریٹری نے ــــ" لڑکی نے کندھے سکیڑ کر کہا ــــ صبح کی گئی ابھی لوٹی ہوں ــــ تھوڑی دیر ہوئی ــ"
"ناشتہ کر لیا ہے ــــ؟" بڑی سرکار نے ٹرالی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
"جی ہاں آتے ہی کر لیا تھا" ــ اس نے "رہبر دکن" آگے بڑھا دیا۔ "یہ دیکھیے ہمارے فینسی فیئر کی خبر اخبار میں آگئی ہے ـ"
بڑی سرکار نے اخبار ایک طرف کو ہٹاتے ہوئے پوچھا "کل رات تم بہت دیر سے لوٹی تھیں ـــ!"
"کس نے بتایا آپ کو؟ ـ" شاہانہ نے خونخوار نظروں سے شمشاد کو دیکھا جو اچانک بڑی سرکار کے لیے پان بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔
"کون چھوڑ گیا تھا تمہیں ـــ؟" بڑی سرکار نے دوسرا سوال کیا۔
"مختار نواب مجھے چھوڑ گئے تھے ـ" شاہانہ نے کچھ ہچکچا کر جواب دیا۔
"مجھے پہلے ہی شبہ تھا ـ" بڑی سرکار نے ناگواری سے کہا۔
"بشارت نواب کے ساتھ کیوں واپس نہیں آئی تھی؟"
"بھائی جان بلیرڈ کھیل کر جلد ہی لوٹ آئے تھے ــ اور میرا کام ختم نہیں ہوا تھا"
"تمہیں کب عقل آئے گی شاہانہ" ــ بڑی سرکار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ایمن نے خود کو اس ماحول سے بہت دور پایا۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے وہاں نوکری مل بھی جاتی ہے تو کیا وہ خود کو پوری طرح اس ماحول میں سمو پائے گی ؟ لیکن وہ وہاں، اس ماحول کا حصہ بننے کے لیے نہیں آئی تھی ـــــ اسے تو بجلی کے تاروں میں دوڑنے والا وہ کرنٹ بننا تھا جو کبھی نظر نہیں آتا۔ پھر اسے کیا ڈر ـــــ اسے شاہانہ کی بے اعتنائی بھی نارمل لگی ـــــ بھلا ایک گردیں اٹی، کانٹوں میں دھنسی اپنی الجھن میں پھنسی لڑکی کس طرح درخورِ اعتنا ہو سکتی تھی ـ اور خاص کر جب وہ دو نانِ جویں کی تلاش میں بھٹک کر ان کی حویلی پر جبیں سائی کر رہی ہو۔

"سرکار ـــــ" شاہانہ نے سرکار کے دوپٹے کی چنٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "وہ میرے ٹیلر کا بل ؟"

بڑی سرکار شاہانہ کو چپ چاپ دیکھا کیں۔ "ابھی تو آدھا مہینا بھی نہیں گزرا اور تمھارا جیب خرچ ختم ہو گیا ؟"

شاہانہ صاحبزادی خجل اپنے رنگے ہوئے ناخونوں کو دیکھتی رہیں۔

"اس بار تم نے بڑے ناواجب اخراجات کیے ہیں، پھر بھی میں منشی صاحب سے ٹیلر کے بل کے بارے میں کہہ دوں گی۔"

"تو پھر میں جاؤں ـــــ" شاہانہ صاحبزادی نے مطمئن ہو کر اجازت مانگی۔

"اب تم یہاں کیوں ٹھہرو گی ـــــ" بڑی سرکار نے کہا اور دوبارہ ایمن کی طرف متوجّہ ہو گئیں۔

ایمن نے بڑی مشکل سے اپنی ٹھنڈی سانس کو روکا ـــــ اسے ایسا لگا جیسے بڑی سرکار جان بوجھ کر بات کو طول دے رہی تھیں ـــ گویا انھیں فکر تھی کہ ایمن چلی جائے تو وہ تنہا رہ جائیں گی۔

"جب تم یہاں آئیں تھیں تو کیا تمھیں یقین تھا کہ یہ نوکری تمھیں مل ہی جائے گی؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔

"جی، میں کسی بھی چیز کے بارے میں پہلے ہی سے رائے قائم نہیں کرتی۔ جب میں نے آپ کا دیا ہوا اشتہار پڑھا تو قسمت آزما کر دیکھنا چاہا۔"

"کام کے بارے میں تمھیں اندازہ ہے کہ کیا کرنا ہو گا۔"

"میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری خودداری برداشت کرے ـــــ" اب ایمن نے بھی زرہ بکتر سنبھال لیا تھا۔

بڑی سرکار کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہیں پھر کہا "خودداری کی اہمیت میں بھی سمجھتی ہوں، تمہیں یہاں شکایت نہیں ہوگی۔"

ایمن کا دل زور سے دھڑکا اور وہ کھڑی ہوگئی۔

"تو کیا... تو کیا میں... سمجھوں...؟" اس نے انگلی پر دوپٹا مروڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں ——" بڑی سرکار نے مسکرا کر کہا۔ "گیارہ لوگوں میں سے میں نے تمہیں چن لیا ہے —— شمشاد جاؤ اور منشی صاحب سے کہو کہ اب اور کسی کو نہ بلوائیں۔"

بڑی سرکار کو وہ چمپئی رنگت والی لڑکی پسند آگئی تھی۔ وہ سنجیدہ سے رہنے کی کوشش کے باوجود اپنی خوشی چھپا نہیں پا رہی تھی — اس سے پہلے کچھ مرد اور عورتیں ان کے پاس آچکی تھیں — مردوں نے یہ نوکری پسند نہیں کی کیونکہ یہ عارضی نوعیت کی تھی جو کسی بھی وقت ختم کی جا سکتی تھی۔ عورتوں میں دو ادھیڑ عمر کی تھیں جن سے چستی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور تیسری لڑکی کچھ زیادہ ہی تیز تھی — بڑی سرکار کی عقابی نظروں نے بھانپ لیا کہ کام سے زیادہ اس کی نظر حویلی کے سازگار ماحول پر تھی۔

"اچھا ہو تو ستوفر تمہیں اسٹیشن واپس لے جائے گا — سامان لے کر واپس آجاؤ — میں نہیں سمجھتی کہ تمہارا لمبا چوڑا سامان ہوگا۔"

"فی الحال میں صرف کچھ کپڑے اپنے ساتھ لائی ہوں — میرا سوٹ کیس اسٹیشن کے کلوک روم میں رکھا ہے ——" وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بس اتنے کپڑے ہی اس کے پاس ہیں جو وہ ساتھ لے آئی تھی۔ دوسرا سامان بھی ایسا کچھ زیادہ نہیں تھا —— مصوری کا کچھ سامان تھا اور ایک چھوٹا سا بکس جس میں وہ اپنے ماں باپ کی یادگار کچھ چیزیں رکھا کرتی تھی۔

"تمہیں کسی اور چیز کی یہاں ضرورت بھی نہیں ہوگی —— سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔"

ایمن نے بڑی سرکار کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آئی۔

سہارا چاہے کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہو، آخر سہارا ہی ہوتا ہے۔ ایمن نے اپنے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹتا ہوا پایا۔ لیکن ڈوبتے انسان کو جہاں کنارے پر پہنچنے کی فکر ہوتی ہے کسی بھی کنارے پر —— ساحل کو چھوتے ہی کئی اور وسوسے بھی گھیر لیتے ہیں۔ کہیں پناہ دینے والا جزیرہ آدم خوروں کا نہ ہو، کہیں وہاں جنگلوں میں درندے نہ ہوں۔ کہیں تنہائی وہاں نہ ڈستی ہو —— ایسا ہی حال ایمن کا تھا — اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے فرائض کا انداز کیا ہوگا "جنرل اسسٹنٹ" — ایسی آزاد اصطلاح تھی

جس کا اطلاق کسی بھی ڈیوٹی پر ہو سکتا تھا۔ اس حویلی اور حویلی کے باسیوں سے وہ بالکل ناواقف تھی۔ وہاں کون کون رہتا تھا۔؟ اور جو لوگ وہاں تھے ان کی پوزیشن کیا تھی؟ ۔ بڑی سرکار نے اس سے سب کچھ اس کے بارے میں تو پوچھ لیا تھا، لیکن وہ خود ان سب کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سارے نظام کا مرکز بڑی سرکار تھیں ۔ جو مرحوم نثار اللہ دولہ کی بیگم تھیں ۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہیں جان پائی تھی ـــــ اس نے فی الوقت خود کو پریشان کرنا مناسب بھی نہیں سمجھا' سارے پردے وقت آنے پر اپنے آپ چاک ہو جائیں گے اس نے سوچا۔

وہ زمانہ ہی ایسا تھا ـــ پرانے حیدرآباد کے بطن میں نیا حیدرآباد انگڑائی لے رہا تھا ـــ حیدرآباد کی اسکائی لائن کے ساتھ ساتھ یہاں کے ذہن بھی کروٹ بدل رہے تھے ـــ لوگ اپنی پرانی قدروں کو سینے سے لگائے نئی قدروں کو بھی سمیٹ رہے تھے ۔ ایسا کرتے ہوئے ابھی ان کے ہاتھ کانپتے تھے ـــ قدم لڑکھڑاتے تھے ۔ کسی جگہ کی تہذیب وہاں کا رواج، وہاں کی زبان، کوئی تماشا نہیں ہوتا کہ سوانگ رچا لیا ۔ ان قدروں کو جنم لینے کے لیے مدتیں درکار ہوتی ہیں ـــ کسی تہذیب کو دنیا میں پنپنے کے لیے آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا پڑتا ہے ۔ کئی بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی اپنے دریچے کھلے بھی رکھنے پڑتے ہیں تاکہ باہر کی تازہ ہوا اس کی شریانوں میں خون کا صحت مند دباؤ برقرار رکھ سکے ـــــ دنیا کی جن تہذیبوں نے خود کو سیل بند رکھا وہ اپنی موت آپ مر گئیں ـــــ سرزمین دکن نے کھلی بانہوں سے کئی بیرونی تمدنوں کے پسندیدہ نظریوں کو اپنایا لیکن ساتھ ہی اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی اور نتیجے کے طور پر وہاں ایک ایسے تمدن نے جنم لیا جو ہندوستان کے ہر دوسرے مقام سے بالکل مختلف تھا ۔ وہ تمدن اپنا جواب آپ ہی تھا ـــ لیکن آزادی کے بعد جس سرعت سے حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کو اپنے طور طریقے بدلنے پڑے اسے ایک حادثہ ہی کہا جا سکتا ہے ۔ ایسا کرتے ہوتے بیشک پیر لڑکھڑا رہے تھے ـــ بیرونی سہارا بیکار تھا ۔ انھیں خود اپنا سہارا آپ بننا تھا جو ایسا نہیں کر سکے ان کے پانو زمین سے اکھڑ گئے، جنھوں نے وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا، انھیں وقت نے بھی کچھ دیا ۔ سوچنے کا نیا ڈھنگ ۔ حیدرآباد سے باہر کی دنیا سے ہم آہنگی، محنت کا پھل ۔

قلی قطب شاہ کی ' ساڈلیاں، اب پشوازوں کی بندشوں سے آزاد ہو رہی ـــ دالانوں اور شکراموں، جھنگلوں کی جگہ، بسوں میں کھپنے لگی تھیں ـــ دفتروں میں کام کر رہی تھیں ـــــ دستِ حنا مالیدہ کی جگہ ان کی ہتھیلیوں میں محنت کی سرخی جھلکنے لگی تھی ۔ لیکن بہت کم ایسے تھے جنھوں نے بغیر کسی دھچکے کے اس تبدیلی کو اختیار کیا تھا ۔ پرانی قدروں کا خون بڑا گہرا ہوتا ہے ۔ جنھوں نے

اس دھچکا کو زیادہ محسوس کیا وہ بوکھلا گئے۔ وہ اپنی پرانی چال بھی کھو بیٹھے تھے۔ ان کی منزل کا تعین نہیں تھا۔ اور ان کے راستے بے سنگ میل ـــ معاشرے کے انحطاط کو سنبھالنے کا کام وقت نے اپنے ذمہ لیا ـــ ذہنی تبدیلی دو دن کی بات تو ہوتی نہیں۔ اس کے لیے ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھلنا پڑتا ہے۔ اور حیدرآبادی بڑی خندہ پیشانی اور بردباری سے وقت کی یہ ٹھوکریں سہہ رہے تھے۔

ایمن بھی وقت کے ان رولے ہوئے موتیوں میں سے ایک تھی۔ اس کے والد شہاب احمد کا تعلق بھی حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ لیکن انھیں اس جرم کی پاداش میں عاق کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے خود اپنی پسند سے عفت سے شادی کی تھی ـــ جو نہ صرف شریف اور متوسط گھرانے کی تھی بلکہ 'ہندستانی' بھی تھی۔ اس کا خاندان سہارنپور کا تھا۔ اور شمالی ہند، حیدرآبادیوں کے لیے 'ہندستان' تھا۔ شہاب احمد نے ایک غضب اور یہ کیا کہ خاندان میں عفت کو اس کا جائز مقام دلانے پر مصر تھے۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تو انھوں نے عفت کے ساتھ حیدرآباد ہی چھوڑ دیا اور بنگلور جا بسے۔ انھوں نے اپنی کج کلاہی کا ڈھونگ نہیں رچایا اور ٹاؤن پلاننگ کے دفتر میں ڈرافٹسمین کی جگہ قبول کر لی ـــ انھوں نے زمانے سے اور معاشرے سے ٹکر لی تھی۔ ان میں ایک زندہ انسان کی ہمت اور حوصلہ جاگ پڑا تھا ـــ ان کے نظریوں میں ٹھہراؤ تھا ـــ ناسازگار حالات میں زندگی گزارنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور انھوں نے اپنی شخصیت کے یہ سارے ہی عناصر ایمن کو سونپ دیے تھے۔ عفت کا جب مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا تو انھوں نے دل اور جگر کے شگاف کے لیے دنیا سے مرہم نہیں مانگا۔ ان کا خیال تھا کہ جب انسان خوشیوں کا بوجھ سہار سکتا ہے تو غم کے پہاڑ کو بھی پانی کر سکتا ہے۔

ایمن اس وقت جوانی کے نازک دور میں قدم رکھنے ہی کو تھی۔ تب اس کے والد کو گھر میں کسی عورت کی کمی بری طرح محسوس ہوئی۔ اور ایسے میں ہی ان کی مالک مکان مسز آتزاک ان کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئیں ـــ وہ ایک بڑی خداترس لیڈی تھیں لیکن یہ دور ایمن کی شخصیت اور کردار کا تشکیلی دور تھا۔ وہ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے لگی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ناسازگار حالات میں بھی ایمن تمکنت اور ہوش کا دامن تھامے رہتی تھی۔

اس نے بڑے غور و خوض کے بعد خود کو حویلی کے شب و روز کے حوالے کر دیا۔

جو کمرہ ایمن کو دیا گیا تھا وہ بڑی سرکار کی خواب گاہ کے سامنے بالکونی کا توسیعی حصہ تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے نسبتاً بڑے کمرے کی آرائش کو قیمتی نہیں تھی لیکن اس کی دل آویزی میں کوئی کلام

نہیں تھا ایک سنگل بیڈ پر سبز ہی کینڈل وک بیڈ کور اور اس کی ایک جانب سائیڈ ٹیبل تھی۔ جس پر ایک خوش وضع ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ اس کے سامنے دیوار سے لگا ایک نہایت خوبصورت رائٹنگ چیسٹ تھا۔ وہ کتنا قدیم تھا یہ کہنا تو مشکل تھا، لیکن سیاہ گن ووڈ کے اس چیسٹ اور اس پر بیل بوٹوں کی ایچنگ نے ایمن کی نظر کو قید کرلیا۔ وہ بیل بوٹوں کے نشیب و فراز کو اپنی انگلیوں سے محسوس کرتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کس صدی کا بنا ہوگا۔

مغربی دیوار سے جڑی ایک چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل اور اس کے برابر ایک بڑا سا Builtin وارڈروب تھا۔ ملحقہ دروازہ غسل خانے کا تھا۔ دروازوں اور دریچوں پر خوش رنگ پھول دار پردے تھے، جو کمرے کے رنگ سے بہت اچھا تال میل رکھتے تھے۔ فرش پر بچھا ہوا قالین گو پرانا تھا لیکن کافی قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرہ شاید اس وقت آراستہ کیا گیا تھا جب وہ ڈرائیور کے ساتھ اسٹیشن سے اپنا سوٹ کیس لینے گئی تھی، کیونکہ قدیم اور جدید فرنیچر کا ٹکراؤ بتاتا تھا کہ کوئی وزنی فرنیچر وہاں سے ہٹا کر اس کی جگہ ٹیبل اور ڈریسنگ ٹیبل رکھی گئی تھی۔ لیکن جس سلیقے سے کمرے کو سنوارا گیا تھا اس میں نسوانیت آگئی تھی۔

ملازم اس کا سوٹ کیس رکھ کر جا چکا تھا ــــ جب تک ایمن کمرے کا معائنہ کرتی رہی شمشاد بھی گال پر ہاتھ رکھے اسے دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

"اب تم چلی جاؤ شمشاد مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" ایمن نے مسکرا کر شمشاد سے کہا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ جان گئی تھی کہ شمشاد بڑی سرکار کی منظور نظر مغلانی ہے۔

اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا ـــ بڑی سرکار کی والدہ نے قحط کے زمانے میں پانچ سیر اناج اور پانچ کوڑیوں کے عوض شمشاد کو خریدا تھا۔ خانوادۂ آصفی کے اس سنہری دور میں بھی جب ایک "گنڈے" میں چار پیسے اور ایک پیسا سکۂ حالی میں چار "دھیلے" اور ہر "دھیلے" میں چار کوڑیاں ہوا کرتی تھیں، انسان اناج کے عوض تل جاتا تھا ـــ قحط سالی میں جب بھوک کا اژدھا پھنکارتا تو نادار ماں باپ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو لیے حویلی، حویلی ہانک لگاتے پھرتے اور مٹھی بھر اناج میں نسلوں کا سودا ہو جاتا، نیک قدم، صنوبر بختاور، اور شمشاد انہی قحط زدہ دنوں کی زنگ خوردہ کڑیاں تھیں ـــ نام تو ان کے ماں باپ نے ضرور انہیں کچھ دیے ہوں گے جو حویلیوں کے حوالے کرتے وقت وہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ کیونکہ اس عالم میں بس ان ناموں پر ہی ان کا حق رہ جاتا تھا ـــ قحط سالی میں خاص طور سے لڑکیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں، جو ایک بار حویلی کی ملکیت ہونے کے بعد جی جان سے وہیں کی ہو رہتیں ــــ ابھی ان کی آنکھوں میں نشہ اور

باہنوں میں جوانی کی خوشبو بھی بھرنے پاتی کہ کسی چھوٹے، منجھلے نواب یا کسی چنو پاشا کے بچھونے کی سلوٹ بن جاتیں۔ پھر ان کے جن باپ کے شگوفے کھلتے تو خوب دھوم سے ان کی چھلّہ چھٹیاں ہوتیں۔ شمشاد بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ جو بڑی سرکار کی شادی کے وقت ان کے جہیز میں دی گئی تھی ــــ غلامی میں خودداری کی آن بھڑکنے ہی نہیں پاتی۔ اس کی جگہ جانثاری لے لیتی ہے۔ شمشاد کا بھی یہی حال تھا۔ بڑی سرکار اور ان سے تعلق رکھنے والی ہر شے اس کے لیے متبرک تھی۔ تاہم ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اس کی نظر عقابی تھی ــ اسے وہ مسکرانے والی لڑکی جس کے دونوں شاداب گالوں میں گڑھے پڑتے تھے پسند آئی تھی۔

"بڑے سرکار بولیں، آج آپ آرام کر لیو۔ کل سے کام دیکھنا" ــــ شمشاد جاتے جاتے بولی۔

"اب کھانے کا وقت تو ہو چکا ہے۔ آپ کھانا کھا کو آج آرام کر لیو" وہ دروازے پر ٹھٹک گئی ــــ امین کو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"کیا بات ہے شمشاد؟" ــــ وہ اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

"کچھ نہیں ــــ" اور شمشاد جانے کے لیے مڑی۔

امین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "سنو شمشاد ــــ تم جانتی ہو میں اس حویلی میں بالکل نئی ہوں۔ یہاں کے طور طریقوں کو جانتی نہیں ہوں ــــ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی"

"ایلی بی آپ اتنے بڑے لکھے، میں کیا آپ کو سکھا دوں گی" شمشاد نے انکساری سے کہا۔

اسے امین کی سادگی پسند آئی۔

"ابھی تم کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں ــ بتاؤ کیا کہنا چاہتی تھیں"

شمشاد نے کچھ تامل کے بعد کہا "شاہانہ صاحب زادی اور ان کی اماں چھوٹے پاشا کے چالاں تم کو سکھو لی بی ــــ بس اتنا ہیچ بولنا تھا میرے کو" ــــ اور وہ دروازے سے نکل کر چلی گئی۔

"بس اتنی سی بات!" ــــ امین کو ہنسی آگئی ــــ بیچاری پرانے وقتوں کی شمشاد شاید ماڈرن شاہانہ کے انداز کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالے اور الماری کھول کر انہیں ہینگروں میں لگانے لگی۔ الماری کی لمبی سلاخ درجنوں ہینگروں سے بھری پڑی تھی۔ امین کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ہینگر تو سات جنم میں بھی اس کے کپڑوں سے بھر نہیں سکتے تھے۔ لیکن اب کچھ لباس تو اسے بنانے ہی ہوں گے۔ اس حویلی کی ایک بہو ہوتے ہوئے اسے اپنی حیثیت کچھ بڑھانی ہوگی۔ اس کے

جو بھی کپڑے تھے گو سستے تھے لیکن اس کے اچھے ذوق کے غماز تھے۔

اس نے دریچے سے پردے اٹھائے۔ وہاں سے نظر آنے والے باغ کا وہ حصہ اب بھی اپنی وضع داری نبھائے چلا جا رہا تھا۔ گو بوگین ولا کی بیلیں بے تحاشا پھیل گئی تھیں۔ لیکن رنگوں کا ایک طوفان سا زمین سے سوئے آسمان اٹھ رہا تھا۔ بوگین ولا سے پرے باغ کے سرے پر ایک چھوٹا سا حسین کاٹیج تھا جو کے احاطے میں کھلے خوش رنگ پھول دوپہر کی دھوپ میں اور بھی شوخ نظر آرہے تھے۔ حویلی سے متعلق وسیع باغ میں اس کاٹیج کے عناصر میں ظہور ترتیب کچھ غیر مانوس سا تھا۔ حویلی کے احاطے میں لیکن پھر بھی الگ تھلگ وہ کاٹیج نسبتاً نیا ہونے کے باوجود پُر اسرار سا تھا۔ وہ شاید حویلی سے متعلق گیسٹ ہاؤس ہوگا۔ ایمن نے سوچا اور ضروری سامان لیے نہانے کو چلی گئی۔

وہ نہا کر نکلی تو شمشاد کھانے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ ایمن نے سوچا کہ حویلی کا وہ گرینڈ ڈائننگ ہال جہاں سے ہو کر وہ اوپر آئی تھی کس مصرف کا تھا۔ جب حویلی میں کھانا کمروں میں پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن اس نے شمشاد سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ ہو سکتا ہے حویلی میں اس کی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے۔ حویلی کے مالکوں کے ساتھ اس کا کھانا درست نہ سمجھا جاتا ہو۔

”خاصہ کھا لیو بی بی ——— ٹھنڈا ہو جائیں گا۔“

”بیگم صاحبہ نے کھا لیا؟“ ایمن نے پوچھا۔

”کون، بڑے سرکار؟“

”ہاں، بڑی سرکار۔“

”بڑی سرکار نئی بی بی ——— توبہ توبہ ——— بڑے سرکار۔“

”لیکن صحیح تو بڑی سرکار ہے شمشاد ——— وہ عورت ہیں۔“ ایمن نے شمشاد کی اردو درست کرنے کی کوشش کی۔

”ایو نہیں بی بی ——— بڑی سرکار بولے تو بے ادبی ہوتی ہے بڑے سرکار بولے تو ادب ہے“ شمشاد نے الٹا اسے نازک نکتہ سمجھایا۔ اور ایمن چپ ہو رہی۔

”ہو، میں ان کو کھلا کو تیچ آپ کا لائیوں ———“ شمشاد نے کہا۔ ”بڑے سرکار بولیں تو ——— کا کھانا ان کے ساتھ ایچ ہوئیں گا۔“

”کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟“ ایمن نے شمشاد کو گھٹنا دباتے دیکھ کر پوچھا۔

”ماشی ماشید الکریم میں کتا بولی، ارے یا وا سیڑھیوں کے اوپر نا کو کھانا پہنچانا ———

میرے گھٹنے ٹوٹ رہیں — مگر سنا تو بولو — منڈی کاٹا۔" شمشاد نے عبدالکریم کو کوسا۔

"شمشاد تم برتن واپس لے جانے کی فکر نہ کرو — کھانے کے بعد میں خود ہی کچن میں پہنچا دوں گی۔"

"اللہ آپ کو اچھا رکھو بی بی، کتنا خیال کرے نا میرا!" شمشاد اسے دعائیں دیتی چلی گئی۔

ایمن نے تولیے سے اپنے گھٹاؤں جیسے بالوں کا پانی سکھایا۔ کھانے کی خوشبو اسے بے چین کر رہی تھی، حالانکہ سویرے ہی اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا لیکن اس کے حواس میں اس وقت اتنا تناؤ تھا کہ اب سوچنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے کیا کھایا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اچھے کھانوں کا مزہ وہ کب کا بھول ہی گئی تھی۔ بھوک ہی شاید ایک ایسا احساس ہے جو کبھی نہیں مرتا — اس وقت تک جب تک کہ خود انسان موت کا نوالہ نہیں بن جاتا — ایمن نے اس طرح کھانا کھایا جیسے عبادت کر رہی ہو۔

کھانے کے بعد اس نے مسز آئزاک کو خط لکھا — وہ چاہتی تھی کہ احسان مندی اور شکر گزاری کے اس خط میں اپنا دل الٹ کر رکھ دے اور اسی کوشش میں دو تین نامکمل خطوط اس نے ردی کی خوش رنگ ٹوکری کے حوالے کر دیئے۔ اور جب وہ آخری خط سے مطمئن ہو گئی تو لفافہ بند کرنے سے پہلے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ مسز آئزاک کو لکھ دے کہ اس کا مصوّری کا سامان وہ پارسل سے بھجوا دیں۔ پھر اس نے سوچا کہ پتا نہیں اس کی ذمہ داریاں اسے اتنی فرصت بھی کبھی دیں گی یا نہیں کہ چند لمحے وہ اپنی مرضی کے مطابق گزار سکے۔ پھر پس نوشت میں اس نے مسز آئزاک سے یہ درخواست کر ہی دی۔

پتا نہیں ایمن کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج اپنی کافی منزل طے کر چکا تھا — وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی — جب وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی تھی تو دیکھا کہ دوپہر کے آرام نے اسے تازگی بخش دی تھی۔ ہلکے گلابی شلوار قمیص میں اس کا کھلتا ہوا رنگ اور نکھر آیا تھا۔ آج کا دن اس کی فرصت کا دن تھا۔ اگلے دن سے اس کے وقت پر کسی اور کا اختیار تھا۔

مطلع ابر آلود ہونے لگا تھا۔ ماحول پر ایک گنگناتی سی خاموشی چھانے لگی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور کچھ دیر بالکل گم سم سی کھڑی ہو گئی۔ کئی دروازے، کچھ کھلے کچھ بند — سیڑھیوں کے نیچے، بڑے ہال میں مکمل خاموشی، صرف جھاڑ فانوسوں کی ٹنگ ٹنگ — اسے ایسا لگا جیسے وہ خاموشیوں کے اس شور میں کہیں گم ہو جائے گی — وہ جہاں تھی وہ حویلی کا درمیانی حصّہ تھا۔ بڑے بڑے کریم کلر دروازے

جن کے فریم پر سنہری بیل بوٹے بنے تھے۔ ان کے درمیان کھڑے کھڑے اسے ایسا لگا جیسے وہ انگریزی پری کتھا کی ایلس ان ونڈر لینڈ میں کھڑی ہے۔ اس نے چپ چاپ گیلری سے حویلی کے پچھواڑے کا راستہ لیا۔ گیلری کے خاتمے پر بہت بڑا شیشے کا دروازہ کھلا تھا، جہاں برآمدے سے ہوتے ہوئے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ برآمدہ کافی بڑا تھا۔ اس کے دونوں جانب سے سیڑھیاں حویلی کے عقبی حصے میں اترتی تھیں۔ ایمن سیڑھیاں اتر کر دائیں گھوم گئی۔ اس طرف حویلی کا پایہ کافی بلند تھا جس کا فائدہ اٹھا کر بیس میںٹ روم بنائے گئے تھے، جو توشک خانوں کے کام آتے ہوں گے۔ ایمن کو تجسس ہوا کہ دیکھے ان بند دروازوں کے پیچھے کیا راز تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کسی نے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا تو بڑی نازیبا بات ہوگی۔ اور وہ اپنی خواہش کو دباتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اسی دم دروازہ کھلا اور کوئی طوفان سا اس سے ٹکرا گیا۔ وہ طوفان نہیں کوئی شخص تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی، دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام لیا، اور دو تین چک پھیریاں دے کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ ایمن اس گردش کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھی۔ وہ اچھا خاصا زلزلہ تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی پھڑکتی ہوئی کنپٹیوں کو ہاتھوں سے دبا کر آنکھیں کھولیں تو اپنے قدموں میں ایک ٹینس ریکٹ پڑا پایا —— اور اس کے قریب ہی سفید ٹینس شوز اور سفید موزوں سے ابھرتی دو پھڑکتی ہوئی ٹانگیں، اس کی دونوں بانہیں اب بھی دو مردانہ ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ درمیانی قد، بھرا بھرا لیکن ورزشی بدن، گورا رنگ اور بالکل سیاہ گھونگھریالے بال، ہونٹوں سے زیادہ مسکراتی شریر سیاہ گہری آنکھیں جو اسے غور سے دیکھے جا رہی تھیں۔ جیسے وہ پوچھ رہی ہوں آپ کی تعریف؟

"معاف کیجیے"۔ ایمن نے حواس بحال کرتے ہوئے خود کو ان ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا —— حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔

"معاف تو اسی وقت کر دیا تھا جب شکل دیکھی تھی"، اس نوجوان نے کہا۔ "آپ کی جگہ عبدالکریم ہوتا تو اسی ریکٹ سے اس کی مرمت کر دیتا —— لیکن ..." اس نے سر سے پیر تک ایمن کو دیکھتے ہوئے کہا، "آپ میں تو کہیں بھی عبدالکریمیت نظر نہیں آتی!"

ایمن نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی — وہ نوجوان عمر میں بھی لگ بھگ اس کے برابر ہوگا۔ لیکن جس چیز نے ایمن کو سنبھالا دیا وہ اس نوجوان کے برتاؤ کا سیدھا سادہ انداز تھا جس میں کہیں گہرائی یا معنی خیزی نہیں تھی۔

"مجھے بھی افسوس نہیں ہے کہ میں عبدالکریم نہیں ہوں"

"ایک بار آپ کو چھو کر دیکھ سکتا ہوں؟" اس شرارت آمیز درخواست نے ایمن کو بھی حوصلہ دیا۔

"نہیں — حادثے بار بار نہیں ہوا کرتے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"نہ سہی!" نوجوان نے شانے اچکا کر ہاتھ پھیلا دیے۔ "میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ سچ مچ مادی ہیں یا . . . ." اور اس نے ہاتھ گرا دیے۔

"میرا نام ایمن ہے۔" ایمن نے کہا "اور آپ، شاید بشارت نواب ہیں؟" اس نے بشارت نواب کا نام بڑی سرکار سے سن رکھا تھا۔

"نواب کسی زمانے میں ہوا کرتے ہوں گے۔ اب تو 'باون' کبھی نہیں تاش کا ۵۳ واں پتا ہو گئے ہیں۔" بشارت نواب نے 'باون' پر زور دے کر کہا۔ "سمجھ میں آیا کچھ؟"

کہاں تو ایمن نے سوچا تھا کہ اس ہنس مکھ اور خوش رو نوجوان سے رسمی معافی مانگ کر آگے بڑھ جائے گی اور اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دیرینہ دوست سے ایک زمانے بعد مل رہی ہو۔

"میری بات کا صحیح جواب دے دیا تو آدھی جاگیر آپ کے نام لکھ دوں گا۔" بشارت نواب کمر پر ہاتھ رکھے ڈرامائی انداز میں بولے۔

"سوچنے دیجیے۔" ایمن نے دماغ پر زور دیا۔ "باون تو ہو گیا 'نواب' کا الٹا — اور تاش کا ۵۳ واں پتا جوکر۔"

"وہ مارا! لاؤ ملاؤ ہاتھ۔"

لیکن ایمن نے ہنس کر دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ لیے۔

"اور میری آدھی جاگیر؟" اس نے مطالبہ کیا۔

"جیلوں الی [illegible] کا قلعہ معاف نہیں ہے تو تم [illegible]"

"[illegible] اب آپ [illegible] پہ آگئے۔" ایمن نے مسکرا کر سوچا۔ "بشارت نواب آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" اس نے یاد دلایا اور بشارت نواب نے جھک کر بیگ اٹھا لیا۔

"جانے کو تو نہیں چاہتا لیکن فرض بھی تو پورا کرنا ہے [illegible] کے کلب میں سب انتظار کر رہے ہوں گے [illegible] چلتے [illegible] ملاقات [illegible]"

"[illegible] حادثے [illegible]"

"لیکن اتفاق تو کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔" اور اس سے پہلے کہ امین کوئی جواب سوچتی وہ ہوا ہو گئے۔ کچھ دیر بعد موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ نے اعلان کیا کہ بشارت نواب اپنے فرض کی تکمیل کے لیے چلے گئے ہیں۔

'کیا بشارت نواب کے، کلب جانے کے علاوہ اور بھی کچھ فرائض ہوں گے۔ جنھیں وہ اسی ذوق و شوق سے پورا کرتے ہوں گے۔' امین نے دور اڑتی ہوئی دھول کو دیکھ کر سوچا۔ لیکن بشارت نواب خود اس سوال کا جواب تھے کہ کچھ لوگ پیدائش سے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں جنھیں ہر صبح کو شام کرنے کے لیے ہراساں نہیں ہونا پڑتا۔

'بشارت نواب کیا بڑی سرکار کے صاحبزادے ہیں؟ اور اگر یہ سچ ہے تو کیا اس طرح اس کا ان کے ساتھ بے لاگ ہنسی مذاق مناسب تھا؟ لیکن بشارت نواب نے خود ہی تو اسے باتوں میں الجھایا تھا؟ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ انھیں دیکھ کر چھوئی موئی نہیں بن گئی تھی۔ وہ چھوئی موئی بن بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ بناوٹ اور دکھاوا اس کے کردار میں نہیں تھا۔ جس کشمکش کی زندگی گزارتے ہوئے وہ حویلی میں آئی تھی۔ وہاں ان نزاکتوں کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ قسمت نے اسے مرد کی اس دنیا میں لاکھڑا کیا تھا۔ جہاں اسے زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے تھے، اپنی عزت کا تحفظ آپ کرنا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس کے باوجود بھی اس کا عورت پن مٹ نہیں سکا تھا۔ گزارا تو اس کا یوں بھی ہو رہا تھا لیکن اب وہ ان حریص نظروں کا مقابلہ کرتے کرتے عاجز آ رہی تھی جو اس کی تنہائی اور بے دستگیری کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ حویلی کی چار دیواری کی پناہ میں آنے کو بے تاب تھی، ورنہ اسے اس عالی شان حویلی سے کیا لینا دینا تھا۔ جس پر اب گردش ایام کی مہریں ثبت ہونے لگی تھیں —— کسی زمانے میں باغات اور اس حویلی کی شان کچھ ہو گی۔ اب رہائشی حصے کو چھوڑ کر اس عالیشان عمارت کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا اور اس کی داغ دوزی نہیں ہوئی تھی۔ روشوں کی بجری اکھڑ رہی تھی —— سارے ماحول کو ایک مسیحائی لمس کی ضرورت تھی۔ باغ کے خاتمے پر مہندی کی اونچی اونچی باڑ کے پیچھے اصطبل اور سرونٹ کوارٹر بنے تھے۔

"زمانے نے کتنی ترقی کی ہے ——" امین نے ایک کھیلی مسکراہٹ سے سوچا۔ "پہلے گھوڑے اصطبل کے پڑوس میں رہتے تھے —— اب اصطبلوں میں رہتے ہیں۔" سرونٹ کوارٹروں میں کچھ چہل پہل تھی۔ ان کے سامنے صحن میں کچھ کمسن لڑکیاں زمین پر لکیریں کھینچے، ٹھیکری پلٹے ہوئے ایک ٹانگ پر اچھل رہی تھیں —— ان سے بتے چار پانچ اصطبلوں میں سے صرف ایک میں گھوڑا تھا —— امین اسے

دیکھتی رہ گئی بڑا اچیلا جانور تھا۔ اس کی چاکلیٹی مخملی جلد اس کے پٹھوں کی تڑپ سے چمک چمک جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی بڑے چاؤ سے دیکھ بھال ہوتی ہوگی۔ اس وقت بھی سائیس اس کے بدن کی مالش کررہا تھا۔

"بشارت نواب کا گھوڑا ہوگا یہ"۔ اس نے سوچا۔ "اگر سائیس اس کی کھال چمکتی نہ رکھے تو وہ خود اس کی کھال ادھیڑ دیں گے"۔ جس چیز نے فوراً امین کی توجہ بانٹ لی وہ برابر کے اصطبل میں رکھی ایک لینڈ ونٹن تھی۔ وہ ایک بوسیدہ کپڑے سے ڈھکی کھڑی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کپڑا کھسکایا، گرد کا ایک بگولا سا اٹھا۔ لیکن اس کے نیچے لینڈو، کاریگری کا بہترین نمونہ تھی۔ اس پر جڑے پیتل کے نقوش اب اپنی آب کھو چکے تھے۔ انھیں ذرا سی محنت سے چمکایا جاسکتا تھا۔ وہاں ٹنگے بڑے بڑے جالوں کے حریری پردے بتاتے تھے کہ بگھی کا عرصے سے استعمال بند تھا۔

اصطبلوں کے پچھواڑے آم کے پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا جس پر بور آنے لگا تھا۔ کھیلتے ہوئے بچوں نے رک کر اسے گھورنا شروع کردیا تھا۔ ہر اجنبی کی قسمت میں ایسی متجسس نظریں لکھی ہی ہوتی ہیں۔

"آگے تالاب ہے؟"۔ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے اسے آگاہ کیا۔

"اچھا! ۔۔۔ آؤ تم بھی چلوگی میرے ساتھ۔" امین نے مسکراکر کہا۔

"نہیں ہم نہیں جاتے واں ۔۔۔۔ اماں مارتے گئے تو"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں خود چلی جاؤں گی۔" امین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "تم اپنا کھیل کھیلو"۔ لڑکیاں اسے ایک ٹک دیکھتی رہیں۔

ایک طرف پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ امین اسی پر ہولی۔ آگے کدم اور گولر کے بڑے بڑے پیڑ تھے پھر کچھ میدانی حصہ طے کرنے پر جامن کے پیڑوں کے پرے ایک تالاب تھا۔۔۔ الگ تھلگ ایک سمر ہاؤس تھا جس کی سیڑھیاں تالاب میں پہنچ کر غائب ہو جاتی تھیں۔ اس تالاب میں سیکڑوں چھوٹے چھوٹے کنول کھلے تھے۔ کہیں کہیں تالاب کی کنگر ٹوٹ کر گرنے لگی تھی۔ دوسرے کنارے پر اونچے اونچے ناریل کے پیڑوں کا عکس خاموش پانی میں دم سادھے پڑا تھا۔ یہ جگہ اتنی حسین تھی کہ اس نے امین کے دامن کو چھوڑا ہی نہیں۔ وہ وہیں دوب پر بیٹھ گئی ۔۔۔۔ وہ جگہ وقت کے ہاتھوں تباہ ہوجائے یہ اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا اپنے والد کی مدد کرتے ہوئے اس نے ایسی کئی جگہوں کو کاغذ پر سنوارا سدھارا گیا دیکھا تھا۔ اس کے تخیل میں بھی اس جھیل کا نک سک سے درست روپ ابھرا۔

اچانک اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ جھٹپٹا ہو رہا تھا ۔ واپس جانے کے خیال ہی سے اسے ایسا لگا کہ وہ تھک گئی ہے ۔ کیونکہ وہ اپنی دھن میں کھوئی ہوئی دور تک نکل آئی تھی ۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی حویلی کی طرف لوٹی ۔ راستے میں جب وہ کاٹیج کے پاس سے گزری تو وہاں بھی روشنی ہوگئی تھی ۔ جو دریچوں کے شفاف شیشوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی ۔ وہ آگے بڑھ گئی حویلی سامنے ہی تھی ۔ وہ جس راستے سے باہر نکلی تھی اسی سے داخل ہوکر اپنے کمرے میں پہنچ گئی ۔ شام گہری ہو چلی تھی ۔ دور قرمزی سورج خدا حافظ کہہ رہا تھا ۔ وہ دریچے کا پردہ اٹھائے دیر تک دیکھتی رہی ۔ حتیٰ کہ اندھیرے نے سورج کو پناہ دے دی اور ہر چیز نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا

رفتہ رفتہ ایمن اپنے تقرر کے مقصد سے واقف ہوتی گئی یہ بات کافی واضح ہوگئی کہ حویلی میں اس کی موجودگی، زیادہ تر بڑی سرکار کی تنہائی کا مداوا تھی ۔ بڑی سرکار سویرے کی سیر کے بعد ناشتہ کبھی باغ کے ایک مخصوص کنج میں اور کبھی سنگ مرمر کے ستونوں والے برآمدے میں کیا کرتی تھیں ۔ ناشتے کے بعد ایمن انھیں اخبار پڑھ کر سناتی ۔ سیاست میں اس کی دلچسپی بس یوں ہی سی تھی ۔ لیکن جب اسے اندازہ ہوا کہ اس سے کیا توقع رکھی جاتی ہے، اس نے فرصت کے اوقات میں اخباروں اور رسالوں میں دلچسپی لینا شروع کردی ۔ بڑی سرکار کی عام معلومات حیرت انگیز تھیں ۔ وہ مطالعہ کی بہت شوقین تھیں ۔ حویلی کی قیمتی کتابوں سے آراستہ لائبریری میں وہ اپنا کچھ وقت گزار کر اپنے لیے کتابیں چن لیتیں جنھیں ایمن ان کے کمرے تک پہنچاتی ۔ ان کتابوں میں فارسی، جرمن اور فرنچ زبانوں کی کتابیں بھی ہوتیں، جن کے کچھ اردو اور انگریزی ترجمے ایمن نے بھی پڑھے تھے ۔ بڑی سرکار کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایمن کے دل میں ان کی عزت اور زیادہ بڑھ گئی ۔ اس نے نوابی بیگمات کے کھوکھلے پن کے قصے سن رکھے تھے لیکن بڑی سرکار اس کے بالکل برعکس نکلیں ۔ ان کی شخصیت کے رعب اور دبدبے کے پیچھے ایک بہت ہی نرم اور سلجھا ہوا دل تھا ۔ زمانے کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات کو بھی نیا موڑ دیا تھا لیکن اپنی وضع داری نہیں چھوڑی تھی ۔ ان کا لباس اب بھی وہی تھا ۔ وہ ہمیشہ مہین ترین ململ کا سفید چنا ہوا دوپٹا کارگے یا فرنچ جالی پر کشیدہ کاری کی ہوئی چولی گھٹنے سے نیچے پہنچتی ہوئی کرتی اور اطلس کے پاجامے پہنا کرتی تھیں ۔ اور اس کے نیچے آپاشاہی جوتی ۔ یہی حیدرآباد کے امرا کا لباس تھا ۔ ناک میں وہ نہایت مہین ہیرے کی لونگ پہنتی تھیں جس کی آب کے آگے بڑے بڑے ہیرے ماند تھے ۔ ان کا کتابی چہرہ، سرخ و سفید رنگت اور بے مثال غلافی آنکھیں بتاتی تھیں کہ جوانی میں وہ کس قدر حسین رہی ہوں گی ۔

اُنھیں وہ سنہری آنکھوں والی ملیح لڑکی پسند آگئی تھی ۔ جو متین تھی، خاموش تھی لیکن کبھی کبھی دلچسپ بات پر اس کی حسین آنکھیں شرارت سے ناچ اٹھتی تھیں۔ وہ ایک معصوم بچّے کی طرح بڑی سرکار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہنس پڑتی تھی ــــ عمر کے زبردست تفاوت کے باوجود ایک خاموش سا رشتہ ان دونوں کے مابین جنم لے رہا تھا۔

حویلی کے باسیوں میں ایک بکھرا ہوا پن تھا، جن سے ایک ایک کر کے ایمن کا تعارف ہو رہا تھا۔ بشارت نواب سے اس کی ملاقات اتفاقیہ تھی ۔ شاہانہ صاحبزادی سے وہ مل چکی تھی ۔ ان کی والدہ تسنیم پاشا کا ذکر خیر وہ شمشاد سے سن چکی تھی ۔ اور جس انداز سے تسنیم پاشا کا ذکر اس نے کیا تھا، اس سے اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ وہ نہ شاہانہ صاحبزادی کو پسند کرتی تھی نہ پاشا کو ــــ لیکن یہ دونوں ماں بیٹی کون تھیں ؟ اور بشارت نواب کیا واقعی بڑی سرکار کے صاحبزادے یا دوسرے الفاظ میں اس کے کبھی حاکم تھے ؟ اس کا دماغ یہ گتھیاں سلجھا نہیں پا رہا تھا اور وہ کسی سے یہ سب کچھ پوچھ کر اپنا تجسّس ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی ۔

ایک شام وہ سمر ہاؤس کی جھیل سے لوٹ رہی تھی ۔ وہ مقام اس کا پسندیدہ مقام بن گیا تھا جھٹپٹے میں جب سفید کنول شام کے دھندلکے میں مدغم ہونے لگے تو وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی ــــ راستے میں وہ خوبصورت سا کاٹیج پڑتا تھا ـــــ اسے یوں ہی اندازہ ہوا تھا کہ اس کاٹیج میں کوئی کرایے دار رہتے ہوں گے، اور ان کا تعلق اس دنیا سے ہو گا جسے وہ چھوڑ آئی تھی، کیوں کہ حویلی کے زیر سایہ کچھ دور بنے اس کاٹیج میں کوئی کرایے دار ہی رہ سکتا تھا ۔ وہ حالانکہ اس دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی جسے وہ چھوڑ آئی تھی لیکن سماجی بندھن ٹوٹتے ضرور ہیں مگر مرتے نہیں ۔ ایمن کے قدم آج کاٹیج کی طرف اٹھ ہی گئے ۔ حتّٰی کہ وہ چھوٹا سا سفید گیٹ کھول کر اندر داخل ہو ہی گئی ۔

وہاں کوئی نہیں تھا ۔ چھوٹے سے لان سے گزر کر وہ برآمدے تک پہنچ گئی کسی نے اسے ٹوکا نہیں کیونکہ پہرے دار صرف بے زبان خوش رنگ پھول تھے ــ وہاں مکمل سکوت تھا ۔ رفتہ رفتہ وہ نروس ہونے لگی ۔ شام کی ہلکی ہوا میں احاطے میں کھڑے ہوتے ناریل کے خوبصورت پتّے سرسرا رہے تھے، اور رات کے اندھیرے کے ساتھ ہی سناٹا بھی بڑھتا جا رہا تھا ۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ــ شاید اس نے اپنے نامناسب تجسّس پر وہاں آنے میں غلطی کی تھی ۔ اس نے سوچا کہ جلد سے جلد یہاں سے چلی جائے ۔ وہ جانے کے لیے پلٹی اور اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کسی نے

اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ پتھر کی مورتی بن گئی ہو۔ شانے پر ہاتھ کا دباؤ کچھ ہلکا ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کن انکھیوں سے پہلے اس ہاتھ کو دیکھا جو اس کے کندھے پر رکھا تھا۔۔ لمبی لمبی گندمی رنگ کی ان انگلیوں والے ہاتھ میں جھریاں ابھر آئی تھیں۔ اس ہاتھ کے دباؤ میں قطعاً خشونت نہیں تھی۔ ہمت پاکر ایمن نے اس ہاتھ کے مالک کے چہرے کی طرف دیکھا، تو وہاں بھی کوئی ناراضگی نہیں تھی۔ کوئی ملامت نہیں تھی۔ وہ چہرہ بہت وجیہہ تھا، جو اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ سب سے زیادہ سکون پرور سیاہ آنکھوں سے جھلکتی نرمی تھی، جس نے ایمن کے تیز دھڑکتے دل کو تھپتھپادیا۔ وہ دراز قد، چوڑے شانے جو کبھی بہت استوار رہے ہوں گے۔ اب قدرے جھک گئے تھے۔ گھٹنوں تک پہنچتے ہوئے سفید اوور آل پر ہر رنگ کے بے شمار دھبے لگے تھے۔ رنگوں کے اس طوفان نے گویا ایمن کو اس شخص کے قریب کر دیا۔ کیونکہ وہ خود بھی رنگوں کی زبان جانتی تھی۔ ستر بہتر کے سن میں اتنی چمکدار اور گرم جوش آنکھیں ایمن نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

"میں ایمن ہوں" اس نے خاموشی سے کہا۔

"ہم جانتے ہیں" اس شخص نے بھی کہا "تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔۔ اب تم ہمیں یاد ہو گئی ہو"

"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ یہاں کون رہتا ہے"۔۔ ایمن نے صاف صاف اقرار جرم کر لیا۔

"صرف دیکھنا چاہتی تھیں یا جاننا بھی۔" اس شخص نے مسکرا کر پوچھا "صرف دیکھنا چاہتی تھیں تو دیکھ لیا، اب جا سکتی ہو۔۔ جاننا چاہتی تھیں تو آ جاؤ اندر میرے ساتھ"

"دیکھنا چاہتی تھی" ایمن نے اس کے دھبے لگے اوور آل کو دیکھ کر کہا۔

"اب جاننا بھی چاہتی ہوں" ایمن پل بھر کو ٹھٹکی، لیکن اس مڑ کر جاتی ہوئی شخصیت میں کوئی بات ایسی تھی کہ وہ ایمن کو اجنبی بالکل نہیں لگا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چل کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

وہ ایک چھوٹا سا، سادہ لیکن نہایت ہی صاف ستھرا ڈرائنگ روم تھا۔ درمیانی ٹیبل پر رنگوں کی پلیٹ رکھی تھی جس پر کچھ رنگوں کے تودے بتا رہے تھے کہ انھیں استعمال کرتے کرتے ہی تپائی پر لٹکا کر وہ باہر آ گیا تھا۔

"آپ مصور ہیں؟"۔۔ ایمن نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ "تم بھی تو ہو!"

"میں؟" یہ ۔۔۔آپ نے کیسے جانا؟" ۔۔ ایمن نے پوچھا۔

"ابھی ابھی تمھاری انگلیوں نے بڑی عقیدت سے اس پلیٹ کو چھوا تھا"

"اللہ اللہ" ۔۔ ایمن نے سوچا "جو شخص اتنا حساس ہے، وہ کس پایے کا مصور ہوگا"۔ ایمن نے ایک بار پھر اس کی فراخ پیشانی اور لمبی حسّاس انگلیوں کو دیکھا۔ اس کی بات چیت کا انداز ایسا تھا جیسے مخمل پر انگلیاں سرسرا رہی ہوں۔

"میرا نام وقار ہے لیکن لوگ مجھے وقار جنگ کہتے ہیں"

ایمن اچھل پڑی ۔ وقار جنگ، یہی وقار جنگ تھے ۔ یہ نام اس کے لیے نیا نہیں تھا ۔ اس نے ان کی پینٹنگس کی نمایش دیکھی تھیں ان کی مصوری کے نمونوں کو بہت اونچے داموں بکتا دیکھا تھا اور آرزو کی تھی کہ کاش اس کا آرٹ بھی ان بلندیوں کو چھو پائے ۔۔ لیکن فن تو ریاض مانگتا ہے، وقت کا نذرانہ مانگتا ہے ۔ اور غم روزگار ایمن کو اسی کی اجازت نہیں دیتا تھا ۔ وقار جنگ کی تصویروں کی نمایش ان کے ایجنٹ ہی آرگنائز کرتے تھے ۔ وہ کبھی خود وہاں موجود نہیں ہوتے تھے ۔ اخباروں کو انھوں نے کبھی انٹرویو نہیں دیا ۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم لوگ انھیں شخصی طور پر جانتے تھے ۔ اس نے عقیدت سے وقار جنگ کی طرف دیکھا ۔ پھر تو بات چیت کا ایک سلسلہ بن گیا ۔ جدید اور تجریدی آرٹ پر جب بحث چل نکلی تو ایمن کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ کتنی دیر سے وہاں بیٹھی ہے ۔۔ وہ اچانک کھڑی ہوگئی۔

"معاف کیجیے، میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا"۔ اس نے کہا ۔

"تم اسے ایسے بھی دیکھ سکتی ہو کہ کتنا وقت ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ پایا ہے، کھویا نہیں آئنسٹائن ایک چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا اس لڑکی نے اس سے اس کی Theory of Relativity کے بارے میں پوچھا ۔ آئنسٹائن نے جواب دیا ۔

"دیکھو میں نے تمھارے ساتھ آدھا گھنٹہ گزارا ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے پانچ ہی منٹ سے تو میں تمھارے ساتھ ہوں، یہی ہے میرا مسئلہ"

وہ انھیں تسلیم کر کے باہر نکلی تو انھوں نے اسے روک دیا اور کہا "آج میں نے تمھارا آنا معاف کر دیا ۔ لیکن آیندہ تمھارا نہ آنا معاف نہیں کروں گا" انھوں نے ایمن کا شانہ تھپتھپا کر کہا ۔۔ جو شخص اخباری نمائندوں سے کتراتا تھا ۔ پبلک میٹنگوں سے دور بھاگتا تھا وہ ایمن سے دوبارہ آنے کے لیے کہے ۔ ایمن نے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا ۔

اس نے باہر نکل کر باغ کا وہ چھوٹا سا گیٹ بند کر دیا، اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی حویلی کی

طرف چلی۔ اس نے دور سے دیکھا بشارت نواب سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے رک کر اسے گھور رہے تھے۔ "یعنی تم اس بھوت بنگلے کی طرف سے آرہی ہو؟" وہ جب قریب پہنچی تو انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"بزرگوں نے کہا ہے پہلے سلام پھر کلام" ایمن نے ہنس کر کہا۔

"کہو تو ابھی تمھیں جھک کر سات سلام کر دوں۔ لیکن مجھے پہلے ہر طرف سے دیکھنے دو کہ تم سلامت ہو بھی یا نہیں" بشارت نواب نے باقاعدہ اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایمن نے ان کی بات کو شرارت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"یعنی تم باقاعدہ وقار جنگ سے ملاقات کر کے آرہی ہو اور پوچھ رہی ہو کیا بات ہے اسے کہتے ہیں شانِ استغنا"

"میں پھر بھی نہیں سمجھی" ایمن نے بشارت نواب کے ہنس مکھ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بن نہیں رہے تھے۔

"تو پھر تم سے خدا سمجھے" وہ بولے۔ "ارے بابا وہاں تو عزرائیل علیہ السلام بھی کال بیل بجاتے ڈریں گے۔ تم جانتی ہو وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا"

"لیکن میرے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے بہت پیار سے بولتے رہے"

"کر دیا نا جادو اُن پر بھی۔ اب وہ بھی وادیِ ایمن میں بھٹکتے رہیں گے"

"اور کون پھر رہا ہے میرے فراق میں آوارہ؟" ایمن نے ہنس کر پوچھا۔

" ہے کوئی بے چارہ۔ دل کا مارا۔ گلوتارہ!" بشارت نواب ریکٹ ہوا میں اچھالتے ہوئے بولے۔ وہ شاید کلب سے واپس آرہے تھے۔

"شرارت بند کیجیے اور بتایئے کہ وہ کون ہیں؟" ایمن وقار جنگ کو ایک مصور کی طرح جان گئی تھی لیکن ان کا حویلی سے کیا تعلق تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

"حسن والوں میں یہ اپنے پرستاروں کا نام جاننے کا چلن کب سے پیدا ہو گیا؟" وہ اسی طرح ریکٹ کو ہتھیلی پر جماتے ہوئے بولے۔

"نام تو میں جانتی ہوں اتا پتا بتلایئے"

"اتا پتا پوچھ رہی ہو۔ یہ تو اور بھی برا ہوا" بشارت نواب بولے اور ایمن زچ ہو کر جانے لگی لیکن راستے میں انھوں نے اپنا ریکٹ حائل کر دیا۔

"تو سنو" وہ بولے۔ "نواب وقار جنگ سرکار کے دیور ہیں۔ مرحوم نثار الدولہ کے سوتیلے

بھائی ہے"

"لیکن انھیں میں نے حویلی میں آتے کبھی نہیں دیکھا" امین بولی ۔

"تو میں کیا کروں ۔۔؟ ہاتھ پانو باندھ کے لے آؤں؟"

"آپ نے تو کبھی سنجیدہ نہ ہونے کی قسم کھائی ہے ۔ میں جارہی ہوں"۔ اور وہ دوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گئی ۔

بعد میں اسے خیال آیا کہ اسے کریدنا نہیں چاہیے تھا ۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں تھی کہ وقار جنگ حویلی ہی کے احاطے میں رہتے تھے حویلی میں نہیں ۔ نوابی خاندانوں میں جایداد جاگیر کے جھگڑے اتنے سنگین ہوتے تھے کہ ان کی خونیں داستانیں بن جاتی تھیں ہو سکتا ہے ان کے بھی اپنے خاندانی اختلافات ہوں ۔۔۔ لیکن ایک نکتہ اور تھا ۔ بشارت نواب نے کہا کہ وقار جنگ ۔ بڑی سرکار کے دیور تھے ۔۔۔ یہ نہیں کہا کہ وہ ان کے چچا تھے ۔ تو کیا بشارت نواب، بڑی سرکار کے صاحبزادے نہیں ہیں ۔؟

دوسرے دن سویرے، امین کو بڑی سرکار نے لائبریری میں طلب کیا ۔ جب وہ وہاں داخل ہوئی تو دیکھا بڑی ٹیبل پر کچھ فائلیں کھلی پڑی تھیں ۔ اور منشی صاحب ناک کی پھننگ پر چشمہ ٹکائے بغور ان کا مطالعہ کر رہے تھے ۔ بڑی سرکار کی سوالیہ اور قدرے تہدیدی نظریں منشی صاحب پر جمی ہوئی تھیں ۔ منشی صاحب بھی کچھ فکرمند نظر آرہے تھے ۔ ان کے سالخوردہ چہرے پر ندامت کے آثار بتاتے تھے کہ ضرور کوئی بات سرکار کی مرضی کے خلاف ہوگئی تھی ۔

"منشی صاحب آپ تو جانتے ہیں"۔ بڑی سرکار کہہ رہی تھیں" چھوٹے سرکار اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے ۔ آپ نے ڈانڈیلی کی فیکٹری کے بارے میں مجھے بالکل خبر نہیں دی اور ہم سمجھتے رہے کہ کام کاج ٹھیک چل رہا ہے"۔

"وہ ۔۔۔ بڑے سرکار ۔ ۔" منشی صاحب ہکلائے ۔

"اب رہنے دیجیے یہ باتیں ۔ اب ہم خود وہاں جاکر دیکھیں گے کہ حالات کیا ہیں" پھر وہ امین سے مخاطب ہوئیں" تم نے درخواست میں لکھا تھا ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتی ہو" یہ کوئی سوال نہیں تھا یاد دہانی تھی ۔

"جی" امین کچھ نروس ہوتی ہوئی بولی ۔ کیونکہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ وہ جانتی ضرور تھی ، لیکن ایک عرصے سے اس کی مشق نہیں رہی تھی ۔ مشکل یہ تھی کہ منشی صاحب صرف اردو ٹائپنگ جانتے تھے ۔ باقی خط و کتابت کے لیے باہر ہی سے عارضی طور پر ٹائپسٹوں کو بلایا جاتا تھا ۔ کیونکہ اب کچھ

ضروری خط و کتابت انگریزی میں ہونے لگی تھی ۔ اب ان کی جبیں پر پسینے کا فشار دیکھ کر امین کو رحم آگیا ۔

فرشتہ صفت منشی صاحب شکل و صورت سے ہرگز فرشتہ نہیں لگتے تھے ۔ کم از کم امین کے تخیل میں فرشتوں کی جو شبیہہ ابھرتی تھی ، وہ اس سے بہت مختلف تھے ۔ دوہرے پاجامے پر لمبی شیروانی جس کی سیدھی جیب میں تین چار قلم اور پنسلیں اور نواب صاحب مرحوم کا مرحمت کیا ہوا فاؤنٹن پن تھا جسے وہ تبرک کی طرح رکھتے تھے ۔ بائیں جیب میں توڑے والی جیبی گھڑی جس نے عرصے سے اپنا شغل بند کردیا تھا ۔ کوتاہ گردن پہ رکھا ہوا ہنس مکھ چہرہ جس کی ٹھوڑی پر تتلی کی طرح جمی ہوئی داڑھی ۔ نہایت ہی نفیس دانتوں والا دہانہ (کیونکہ یہ چوکا تھا) آنکھوں میں برسوں کی وضعداری کی گرم جوشی جو صرف اس خاندان کے لیے تھی جس کا نمک ان کے آباء و اجداد نے بھی کھایا تھا ۔ اور سر پر ترکی ٹوپی جس کا پھندنا وہ ہمیشہ سامنے رکھا کرتے تھے ۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک لافانی مسکراہٹ رہتی تھی جس کی وجہ ممکن ہے ان کا مصنوعی دانتوں والا چوکا ہو ۔ وہ بڑی سرکار سے کبھی نظریں ملا کر بات کرنے کی بے ادبی نہیں کرتے تھے ۔ بڑی مشکل سے گردن جھکائے رکھتے تھے ، جس کی وجہ سے ان کی ٹوپی کا پھندنا ہمیشہ جھولتا رہتا تھا ۔ جب سے حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو کی جگہ انگریزی میں کام کرنا پڑ رہا تھا ، وہ بہت شپٹائے ہوئے تھے ۔ باہر سے مامور کیے ہوئے ٹائپسٹ انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے ۔ کیونکہ وہ لونڈے نہ صرف ان کے سراپا بلکہ ان کی کمزور انگریزی کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے ۔ ایسے میں امین ان کی بڑی مددگار ثابت ہوتی تھی ۔ وہ ان کا بہت سا کام نپٹا دیا کرتی تھی ۔ پہلے پہلے تو اس کے بارے میں ان کے دل میں بہت سے شبہات ابھرتے تھے ۔ حیدرآباد کی عام لڑکیوں کے مقابلے میں وہ انھیں زیادہ بے باک اور خود مختار لگی تھی ۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس کی یہی صفات انھیں پسند آنے لگی تھیں ۔ کیونکہ امین جس طرح اس وسیع دنیا میں تن تنہا تھی اس کا نڈر اور خود مختار ہونا ضروری تھا ۔ اس کا رویہ سب کے ساتھ دوستانہ تھا ۔ حتّٰی کہ اس نے منشی صاحب کو رام کر لیا تھا ۔ اس سے بڑا شفقت آمیز انس ہو گیا تھا ۔ وہ کبھی کبھی اسے اپنی شاعری تک سنا دیا کرتے تھے ۔

رودِ موسیٰ میں آئی طغیانی حیدرآباد کی ہوئی ویرانی

طرح کے شعر ہوتے ۔ ان کی شاعری میں گزرے ہوئے دور کی یاد کی تڑپ اور آنے والے زمانے کی تشویشناک بیداد کا ذکر ہوتا

بڑی سرکار نے فائل دیکھتے دیکھتے اپنی عینک اتاری اور کچھ نرمی سے منشی صاحب سے کہا " خیر

اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ آپ ہمارے ڈانڈیلی جانے کی تیاری کیجیے۔"

"ہو سرکار ۔۔ ایسچ کر توں منشی صاحب کی جان میں جان آئی ۔

"منشی صاحب!" بڑی سرکار کچھ بے بس ہو کر بولیں۔" بات تو پوری سن لیجیے۔ ہم ابھی نہیں جائیں گے۔ کل تمکین یار جنگ کی صاحبزادی کی شادی ہے ۔ ہمارا وہاں جانا بہت ضروری ہے، کیونکہ ہم دوسری کسی رسم میں شریک نہیں ہو پاتے ہیں ۔ ہم پرسوں سویرے کی گاڑی سے جائیں گے۔"

"جو حکم۔۔۔"

"اب آپ جا سکتے ہیں۔" منشی صاحب جلدی جلدی فائلیں سمیٹ کر چلتے بنے۔

"امین بی بی، کل تمھیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہے شادی میں۔" بڑی سرکار کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

امین بڑی سرکار کے ساتھ ساتھ ناشتے کے لیے باغ میں پہنچی تو دیکھا کہ وہاں بشارت نواب اور شاہانہ صاحبزادی کے علاوہ ایک اور بیگم بھی بیٹھی ہوئی تھیں اس میں شک نہیں کہ ان کا حسن جوانی کی منزلوں سے گزر چکا تھا، پھر بھی ان کی بادامی آنکھوں میں غضب کی کشش باقی تھی۔ سرخ و سفید رنگ اور کٹے ہوئے بالوں میں وہ شاہانہ صاحبزادی کا قدرے عمر رسیدہ مرقع تھیں۔ کاسنی رنگ کی شیفان کی ساری سے جھانکتے ہوئے سیاہ اونچی ایڑی کے سینڈل میں ان کے خوب صورت پانو کبوتروں جیسے نظر آرہے تھے۔ ہاتھ میں سکنجبین کا لمبا گلاس وہ ایک ادا سے تھامے ہوئی تھیں۔ بیٹھنے کے انداز سے زبردست خود اعتمادی جھلکتی تھی۔

یہ ضرور تسنیم پاشا ہوں گی ۔ امین نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ اسے حویلی میں آتے دس بارہ دن ہو گئے تھے لیکن آج پہلی بار اس کا سامنا تسنیم پاشا سے ہوا تھا۔ حویلی میں ایک خاص بات اس نے یہ دیکھی کہ ہر شخص صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ خاص طور پر امین کے سامنے حویلی کے ساکنوں کی بات نہیں نکلتی تھی۔ اگر نوکر چاکر آپس میں کچھ مالکوں کی باتیں کرتے ہوتے تو امین کی اتفاقیہ آمد پر ایکدم خاموش ہو جاتے۔ بعض اصول حویلی میں صدیوں سے چلے آرہے ہوں گے مثلاً نمک خواروں کو اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیے۔ اسے یہ بھی کافی دنوں کے بعد پتا چلا تھا کہ بشارت نواب بڑی سرکار کے نہیں بلکہ تسنیم پاشا کے صاحبزادے تھے اور شاہانہ صاحبزادی کے بڑے بھائی۔ ظاہر ہے امین ان سب کے لیے نہ صرف غیر تھی بلکہ حویلی کے اسٹاف کی ایک ممبر تھی جو رفتہ رفتہ ان کے لیے قابل اعتماد بنتی جا رہی تھی۔

وہ بڑی سرکار کے پیچھے آگے بڑھی - شاہانہ صاحبزادی اور بشارت نواب پتا نہیں کس بات پر الجھ رہے تھے اور چھوٹے پاشا کی بادامی آنکھیں ایمن کو تول رہی تھیں۔

قریب پہنچ کر اس نے تسنیم پاشا کو سلام کیا جس کا جواب انھوں نے ابرو کے اشارے سے دیا۔ انھوں نے اٹھ کر بڑی سرکار کو بندگی کی اور ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"کب آئیں؟" بڑی سرکار نے آرام دہ مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"جی رات ہی کو آئی ہوں" تسنیم پاشا اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے بولیں۔

"فاروق نواب، تمیز دلھن اور بچے خیریت سے ہیں؟" بڑی سرکار نے اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی جو تسنیم پاشا کے سگے بھائی تھے اور ان کی فیملی کی خیریت پوچھی۔

"جی ہاں، سب ٹھیک ہیں۔ دونوں بچوں کے 'میزلس' نکلے تھے۔ اب ٹھیک ہیں" تسنیم پاشا سوالوں کے چھوٹے چھوٹے جواب دے رہی تھیں۔

"تم تو وقار آباد مہینا بھر کے لیے گئی تھیں جلد ہی لوٹ آئیں!" بڑی سرکار نے مسکرا کر کہا۔

"میرے لیے تو وہاں دس دن بھی دوبھر ہو گئے" تسنیم پاشا بے چین ہو کر بولیں۔

بڑی سرکار نے حکمت عملی سے کام لے کر بات کا دھارا موڑا "ایمن بی بی یہ میری چھوٹی بہن ہیں، تسنیم پاشا"

"جی میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا" ایمن مسکرا کر بولی۔

"کس طرح پہچان لیا تھا؟" تسنیم پاشا نے قدرے بے زاری سے کہا "کیا میری شکل پر لکھا ہے" ان کے سخت گیر لہجے نے ایمن کو بوکھلا دیا۔

"جی — وہ، آپ شاہانہ سے بہت ملتی جلتی ہیں" اس نے کہا۔

"ہاں، شاہانہ 'صاحبزادی' میری لڑکی ہیں اور بشارت نواب ان کے بھائی" تسنیم پاشا نے صاحبزادی اور نواب' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ جیسے انھوں نے ایمن کی بے تکلفی کو پسند نہ کیا ہو — ایمن کے گال سرخ ہو گئے۔

"سرکار آج یہ نان بہت اچھے بنے ہیں" بشارت نواب نے بے چین ہو کر بات کا دھارا موڑا۔

"ہمیشہ جھوٹ بولتے ہو" شاہانہ نے کہا "ابھی تم نے کھاتے ہی نہیں"
"تم تو خدا کو بھی چکھ کر دیکھو گی تب کہو گی ہاں واقعی یہ خدا ہے"

بشارت نواب نے شاہانہ کو گھسیٹا۔

"تم لوگ امراء اور شرفاء کی زبان بھولتے جا رہے ہو" تسنیم پاشا نے انھیں ٹوکا "تمھاری سات پیڑھیوں میں بھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی ہوگی۔"

"اب تم وقار آباد سے لوٹ آئی ہو ان کی باگ ڈور سنبھالے رکھو" بڑی سرکار نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں میرا دل وہاں نہیں لگتا تھا آپا بیگم ـــ ایک تو چھوٹی سی جگہ، کلب تک کی سہولت نہیں۔ دوسرے بھائی جان سیاست کے میدان میں کیا کود پڑے ہیں کہ بس ہر وقت گھٹیا قسم کے لوگوں میں گھرے رہتے ہیں۔"

امین چونک پڑی۔

"یہ عوام کی تعریف ہو رہی ہے۔" بشارت نواب کچھ بے چین ہو کر بولے۔ وہ امین کے تاثر سے کھسیا گئے تھے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ ان کی والدہ ایسے کھوکھلے پن سے امین کے سامنے اپنی برتری کے احساس (Superiorty Comolex) کا مظاہرہ نہ کریں، لیکن تسنیم پاشا اور آگے بڑھیں۔

"بے شک ہاتھی گر کے بھی تو گھوڑے سے اونچا رہتا ہے ـــ ہمیں اپنے طور طریق ہرگز نہیں بدلنا چاہییں۔ اور جب سے بھائی جان نے پولٹری فارم کا چکر شروع کیا ہے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی حیرت تو یہ ہے کہ بھابی جان بھی انڈے گنتی پھرتی ہیں۔"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ـــ" بڑی سرکار نے ملائمت سے کہا "بدلتے زمانے کا تقاضا بھی ہے کہ موروثی اثاثے کو فائدہ بخش کاموں میں لگایا جائے ـــ اب پابند آمدنی بھی تو کم ہو گئی ہے۔"

"خیر آپ کو تو اس کی فکر نہیں ہونی چاہیے" تسنیم پاشا نے رشک سے کہا۔ آپ کو تو خدا نے اتنا دیا ہے کہ آپ اب بھی دس کو کھلا سکتی ہیں۔"

"اگر تم نے بھی ریس اور تاش جنون کی حد تک نہ کھیلا ہوتا تو مرحوم صلابت نواب نے بہت کچھ چھوڑا تھا۔"

"اور نہ آپا بیگم آپ تو میرے توق کو ہی لے بیٹھیں" صرف تسنیم پاشا ہی بڑی سرکار سے اتنی لبرٹی لے سکتی تھیں، اور کسی کی ہمت نہیں تھی جو اُن سے اس انداز سے بولتا۔ کلب میں سب

ہی مجھے برج کوئن، کہتے ہیں۔ میں پہنچی ہوں تو سب کے چہرے چمک اٹھتے ہیں۔"

"بس، بس تسنیم پاشا" بڑی سرکار بولیں "اسی بھرم میں تم نے بچوں کا خرابا کر دیا۔ بشارت نواب ابھی تک بی اے نہیں کر پائے۔ اور شاہانہ صاحبزادی تو اسکول سے آگے ہی بڑھ نہ پائیں۔"

"تو بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ان کے والد نواب صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے سبھی کچھ تو وہی کرتے رہے۔ اسکول میں کوئی بھی نواب زادہ بشارت نواب کی ٹکر کا نہیں تھا۔"

"پڑھائی میں؟" بڑی سرکار نے دکھتی رگ پکڑی۔

".... اور شاہانہ صاحبزادی" تسنیم پاشا نے ان کی بات ان سنی کر کے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "وہ اپنی گورنس اور آیا کے ساتھ پابندی سے اسکول جاتی رہیں۔ لیکن خرابا ہو زمانے کا ان کی تعلیم چھوٹ گئی۔"

"اس لیے نا کہ شروع ہی سے بشارت نواب نے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لی۔ اور تم شاہانہ کی گورنس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے راضی نہیں تھیں۔"

"آپ تو جانتی ہیں آپا بیگم" تسنیم پاشا نے آزردگی کے لہجے میں کہا "میں وہ اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔"

"کیا گورنس کے بغیر شاہانہ صاحبزادی کی پڑھائی جاری نہیں رہ سکتی تھی؟" بڑی سرکار نے آج شاید ٹھان لی تھی کہ تسنیم پاشا سے نپٹ کر رہیں گی۔

"Obviously" تسنیم پاشا نے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے شانے اُچکا کر ہاتھ پھیلا دیے۔ "اب آپ یہ تو نہ کہیے کہ میری لڑکی گورنس اور آیا کے بغیر ہی کسی عام سے اسکول میں سب چھوکریوں کے برابر بیٹھ کر سر میں جوئیں بھر لاتی ۔۔۔ ان کا اسکول چھوٹا تو کیا ہوا۔ شہر بھر میں کوئی شاہانہ صاحبزادی کے برابر انگریزی بول کر تو بتا دے۔" انھوں نے پینترا بدلا۔

بشارت نواب اور شاہانہ صاحبزادی نے جب خود کو موضوعِ گفتگو بنتے دیکھا تو وہاں سے چمپت ہو جانے میں ہی اپنی بھلائی دیکھی۔ لیکن بڑی سرکار نے انھیں اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔

ویسے تسنیم پاشا نے جو کچھ کہا وہ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ صلابت نواب کی بے وقت موت نے واقعی ان سے زندگی کی بہت سی آسائشیں چھین لی تھیں۔ ویسے ان کی زندگی ہی میں مخالف ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ ملک کی آزادی نے رعایا کو بھی نڈر بنانا شروع کر دیا تھا ۔۔۔ جہاں زمینوں پر

بندھک کام کرتے تھے وہاں اجرت کا مطالبہ ہونے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بغاوتیں سر اٹھانے لگی تھیں۔ ان کے اپنے دست راست نوکر آستین کے سانپ بنتے جا رہے تھے۔ بے چارے صلابت نواب سنبھلنا چاہتے تھے، آگے بڑھتے ہوئے وقت کی انگلی تھامنا چاہتے تھے لیکن موت نے انھیں مہلت نہیں دی۔

کہتے ہیں مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ صلابت نواب کے انتقال کے بعد بھی اتنا بچا تھا کہ تسنیم پاشا اور ان کے دونوں بچے اس پیسے کا صحیح استعمال کرکے اپنے لیے ایک نئی آسودہ دنیا بنا سکتے تھے۔ لیکن تسنیم پاشا نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پیسے کا بے دریغ استعمال کرتی رہیں۔

صلابت نواب کے انتقال پر اچانک انھیں محسوس ہوا کہ سوگواری کے لباس تو ان کے پاس تھے ہی نہیں، کیونکہ صلابت نواب کو سیاہ رنگ پسند نہیں تھا۔ اور سفید، وہ خود نہیں پسند کرتی تھیں لہٰذا انھوں نے بدنصیبی اور غم کے باوجود اپنا ماتمی وارڈروب بھی تیار کیا جس میں ہر چیز سیاہ تھی۔ ان کے دوست شاہد تھے کہ چار مہینے تک تسنیم پاشا نے سیاہ کے سوا کسی اور رنگ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ فرنچ شیفان کی دلدادہ تھیں وہ — یہ اور بات ہے کہ سیاہ رنگ کے پلّو سے جب وہ اپنا سر ڈھکتی تھیں تو ان کا شہابی حسن دوبالا ہو جاتا تھا۔ تبھی انھیں "بیوٹی ان بلیک" طرح کے ٹائیٹل ملے تھے۔ کلبوں اور پارٹیوں میں، اپنا غم غلط کرنے کے لیے انھیں جانا ضروری تھا۔ جہاں دوست اور قدر دان انھیں گھیرے رہتے تھے — کلب میں وہ اونچے داؤ پر تاش کھیلتی تھیں اسی لیے انھیں 'برج کوئن' کہا جاتا تھا۔ پاٹ لک، پارٹیوں کے علاوہ رائڈنگ اور ٹینس بھی برابر چلتے رہے۔ ان کے دوست ان کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ خاص طور پر مختار نواب — وہ کچھ زیادہ ہی توجّہ دیتے تھے۔ بڑی سرکار نے دبی زبان سے ایک دو بار تسنیم پاشا کے رویّے پر نکتہ چینی بھی کی، پھر خاموش ہو رہیں۔ تسنیم پاشا کوئی بچّہ تو تھیں نہیں کہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہو۔ اس کے علاوہ سرکار اپنی سوتیلی ماں کا شروع ہی سے ادب کرتی آئی تھیں۔ پھر مرتے وقت انھوں نے بڑی سرکار سے وعدہ لیا تھا کہ وہ تسنیم پاشا اور فاروق نواب کا ہر طرح خیال رکھیں گی — فاروق نواب سمجھدار تھے — وہ بڑی سرکار کا بہت ادب بھی کرتے تھے۔ لیکن تسنیم پاشا نے اپنے بھائی فاروق نواب سے لڑ جھگڑ کر جایداد میں اپنا حصّہ لے لیا۔ ان کے شوہر صلابت نواب بھی کوئی بہت بلند پایہ نواب نہیں تھے، جبکہ بڑی سرکار کے شوہر نثارالدولہ میر پایگاہ تھے، جو حیدرآباد میں بہت بڑا خطاب ہوا کرتا تھا۔

تسنیم پاشا نے جب اپنی ساری دولت پھونک پھانک دی تو بڑی آسانی سے انھوں نے

اپنا راستہ فرمان علیؑ میں بنالیا۔ جہاں بڑی سرکار اور ان کے صاحبزادے آزر نواب رہتے تھے۔ گو بڑی سرکار کی اور بھی کئی حویلیاں تھیں جو پرانے حیدرآباد میں تھیں لیکن انھیں اور آزر نواب کو فرمان کا کھلا ماحول پسند تھا۔

تسنیم پاشا کی آمدنی برائے نام رہ گئی تھی۔ وہ دولت کو پانی کی طرح بہانے کی عادی تھیں۔ ظاہر ہے اس انداز زندگی کے لیے یہ آمدنی قطعی ناکافی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا سب کچھ کھو دیتیں بڑی سرکار نے انھیں رائے دی کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر ان کے پاس ہی رہنے کے لیے آجائیں۔ لیکن بڑی سرکار نے شرط یہ رکھی کہ ان کی بچی کھچی جایداد کے مختار بڑی سرکار کے صاحبزادے آزر نواب ہوں گے۔ تسنیم پاشا خود بھی یہی چاہتی تھیں۔ ان کے دونوں بچے اب ماشاء اللہ بڑے ہو گئے تھے۔ بشارت نواب ۲۴ سال کے اور شاہانہ صاحبزادی ۲۲ سال کی، اور وہ جانتی تھیں کہ خود ان کے سگے بھائی فاروق نواب کے پاس ان کا گزارا ممکن نہیں تھا۔ ان کے خیال میں فاروق نواب نے وہ کام کیا تھا جو نوابوں کے شایان شان نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی بھائی کے پاس جاکر رہتیں بھی تو گھبرا کے حیدرآباد واپس بھاگ آتیں ـــ پہلے تو بڑی سرکار نے بھی انھیں ڈھیلی ڈوری سے باندھ رکھا تھا۔ پھر تسنیم پاشا کے بے تحاشا اخراجات سے تنگ آکر انھوں نے بٹوے کی گرفت تنگ کرنی شروع کردی۔ پہلے تسنیم پاشا کے بل صرف منشی صاحب تک پہنچتے تھے وہ ان کی ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔ اب آزر نواب کے حکم سے وہ ہر بل کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے۔ لیکن یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب کہ بڑی سرکار کے صاحبزادے چھوٹے سرکار یعنی آزر نواب نے جایداد کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ تسنیم پاشا منشی صاحب کی کرید سے خفا رہتیں اور اکثر ان کی شکایت بڑی سرکار سے کرتی رہتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے آزر نواب بیرون ملک گئے ہوئے تھے تو موقع سے فائدہ اٹھا کر تسنیم پاشا بہت کچھ بڑی سرکار سے منوالیتی تھیں۔ ان کی یہ روش منشی صاحب کو قطعاً پسند نہیں تھی۔

کچھ دن سے حویلی میں مختار نواب کی زیادہ رسائی بڑی سرکار کی الجھن کا باعث بنتی جارہی تھی۔ پچاس سال عمر ہونے کو آئی تھی ان کی، لیکن ابھی تک انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے اور دھڑلے سے چکا چوند زندگی گزارتے تھے۔ اور ان کی یہی آزادی سب کے لیے باعث فکر بنی ہوئی تھی۔ ساری معزز سوسائٹی انگشت بدنداں تھی کہ مختار نواب کے بے پناہ اخراجات کا سوتا کہاں ہے۔ جبکہ بدلتے ہوئے حالات نے سب کی پیٹھ دیوار سے لگادی تھی بڑی سرکار کو خود تسنیم پاشا کا مختار نواب سے میل جول ناپسند تھا۔ اب شاہانہ کا ان کے ساتھ آزادی سے گھومتے

رہنا انھیں اور بھی متفکر کر رہا تھا۔ آزر نواب کی غیر حاضری کا وہ لوگ ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔
لیکن تسنیم پاشا مطمئن تھی۔ انھیں اپنی بیٹی کے حسن پر پورا بھروسا تھا کہ ایک روز شاہانہ صاحبزادی آزر نواب ہی کی دُلھن بنیں گی۔ اور وہ اپنی پوزیشن مضبوط دیکھنے لگی تھیں۔

"سرکار، آپ اجازت دیں تو ہم شاہانہ اور امین آج گولکنڈے کی سیر کر آئیں"۔ بشارت نواب نے بوجھل فضا سے اُکتا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ بڑی سرکار کچھ کہتیں، شاہانہ نے کہا۔" میں کھنڈروں میں بدروح کی طرح نہیں بھٹکوں گی۔"

" مجھے معلوم تھا تم نہیں چلو گی۔" بشارت نواب نے اپنے خوب صورت دانت چمکاتے ہوئے کہا۔

اسی لیے تم نے شاہانہ کو آخر کہا ہوگا تسنیم پاشا ناگواری سے پھنکاریں۔ انھیں اپنی بہن کی نئی سکریٹری اور اس کے رکھ رکھاؤ پر غصہ آنے لگا تھا اور اس کی ایک نواب زادے سے میل جول کی جسارت اور بھی ناقابل معافی تھی "تمھیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاہانہ کو آج ہیرڈریسر کے پاس جانا ہے اور مجھے مختار نواب کے پاس لنچ پر جانا ہے۔ ہمیں تم چھوڑ آؤ"۔

بڑی سرکار شمشاد کو کچھ ہدایتیں دے رہی تھیں۔

"شوفر آپ کو لے جا سکتا ہے ممی"۔ بشارت نواب نے گردن کھجاتے ہوئے دھیرے سے کہا تاکہ بڑی سرکار نہ سن لیں۔

"شوفر دو دن کی چھٹی پر گیا ہے۔ اس کا بچہ بیمار ہے"۔ بڑی سرکار نے کہا۔ انھوں نے شاید مختار نواب کا نام بھی سن لیا تھا۔" ٹھیک ہے بشارت نواب تم اور امین ہی چلے جاؤ۔ بے چاری لڑکی جب سے آئی ہے حویلی ہی میں بند ہے"۔

"لیکن آپا بیگم مجھے مختار نواب ....." تسنیم پاشا نے احتجاج کیا۔

"کوئی بات نہیں" بڑی سرکار اطمینان سے بولیں "تم مختار نواب کو فون کر دینا کہ تم لنچ پر نہیں آؤ گی"۔

بڑی سرکار کے انداز میں وہ قطعیت تھی کہ تسنیم پاشا کسمسا کر چپ ہو رہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ بڑی پاشا سے خائف تھیں۔

امین نے کچن میں جا کر جلدی جلدی سینڈوچ تیار کیے، کافی سے تھرماس بھر لیا۔ اس نے

بڑی آسانی سے کچن میں اپنا راستہ بنا لیا تھا۔ پہلے جس کچن میں پندرہ بیس لوگ کام کرتے تھے، اب وہاں صرف چند ہی رہ گئے تھے۔ شمشاد جو اصولی طور پر صرف بڑی سرکار کی مغلانی تھی، اب عبدالکریم کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ حویلی کے ہر ممبر کے لیے مختلف طرح کا کھانا پکتا تھا۔ بڑی سرکار پرہیزی کھانا کھاتی تھیں۔ شاہانہ صاحبزادی ڈائٹنگ کرتی تھیں، تسنیم پاشا مغربی طرز کا کھانا پسند کرتی تھیں۔ بشارت نواب مرغن کھانوں کے شوقین تھے۔ صرف امین ہی ایسی تھی جسے کسی بھی طرح کا کھانا کھانے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود کبھی وقت نکال کر کچن میں پہنچ جاتی تھی ۔۔ وہاں اس کی موجودگی تازہ ہوا کے جھونکے کا کام کرتی تھی۔ عبدالکریم کی کارگزدگی حیرت انگیز طور پر بڑھ جاتی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ امین بی بی کے صرف سبزی کاٹ کر دینے کی وجہ سے اس کا کام اتنا آسان کیسے ہو گیا۔ ہوم سائنس کی ٹریننگ کے دوران سیکھے ہوئے گر امین اس پرانی طرز پر چلتے ہوئے کچن میں ایک ایک کرکے رائج کرتی جا رہی تھی۔ کچن بہت بڑا اور ہوادار تھا۔ اور وہاں کا سامان بھی قیمتی اور مناسب تھا۔ لیکن جہاں سب کچھ نوکروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں کئی طرح کی خامیاں جنم لینے لگتی ہیں۔ جو دریچے دائمی طور پر بند کر دیے گئے تھے۔ امین نے سب کھلوا دیے۔ اور جب اس نے خود صفائی کا بیڑا اٹھایا تو عبدالکریم کو بھی شرم آگئی۔ دو خادماؤں کو ساتھ لے کر اس نے کچن اور وہاں کے شیلف ایسے چمکا دیے کہ اپنی کارگزاری پر خود ہی حیران ہو گیا۔ دوائی چھڑکنے پر جھینگروں کا ڈھیر سا لگ گیا۔ بون چائنا اور چاندی کے برتنوں میں جب کھانا مالکوں کے سامنے رکھا جاتا تو انھیں گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ جہاں سے یہ پک کر آتا تھا وہ جگہ کتنی گندی تھی ۔۔ صفائی کے بعد عبدالکریم اور دوسرے نوکروں کی کارگزاری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ہر چیز وہاں قاعدے قرینے سے رکھی تھی ۔۔ درمیانی بڑا ٹیبل گھس گھس کر دھونے پر کسی اور ہی رنگ کا نکل آیا تھا۔ فرج جو پہلے خالی ڈھنڈار پڑا رہتا تھا۔ اب تازہ اشیا سے بھر اٹھا۔ اب ہر چیز کے لیے عبدالکریم کو سائکل اٹھا کر شہر بھاگنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کام کے بہتر طرح سے آرگنائز ہونے کی وجہ سے اسے بھی اب فرصت کے لمحات زیادہ ملتے تھے جنھیں وہ جاسوسی ناول پڑھ کر گزارتا تھا۔

کچن سے نکل کر امین جب جلدی جلدی نیچے پہنچی تو بشارت نواب اپنی موٹر سائکل لیے تیار کھڑے تھے۔

" چلیے، چندرگپت کا رتھ حاضر ہے آپ کے لیے " وہ جھک کر تعظیم دیتے ہوئے بولے۔

امین نے سوچا ہی نہیں تھا کہ گولکنڈہ بشارت نواب کے ساتھ موٹر سائکل پر جانا پڑے گا۔

"موٹر سائکل پر؟" اس نے کچھ جھجک کر کہا۔

"کیوں میرے ساتھ موٹر سائکل پر چلنے میں کوئی اعتراض ہے؟" بشارت نواب بُرا مان کر بولے۔

"یہ میں نے کب کہا؟" امین نے اپنی سراسیمگی چھپاتے ہوئے کہا۔ اور ان کے پاس پہنچ گئی۔ ایسی حالت میں وہ کسی منہ بند شرمیلی کلی کی طرح نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بشارت نواب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ زیادہ خائف ہوتی، بلکہ جانے سے یکسر انکار کر دیتی۔ لیکن اس عرصے میں وہ بشارت نواب اور ان کے کھلنڈرے پن سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ وہ تقریباً اس کے ہم عمر تھے اور ان کا انداز ایسا کھلا اور بے ساختہ تھا کہ جلد ہی یگانگت کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ اسے ہنسانا بشارت نواب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ دونوں دیر تک چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنستے رہتے تھے۔

"شاہانہ نہیں چل رہی تھیں"۔ بشارت نواب نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "میں نے سوچا خواہ مخواہ کار کیوں لے جلیں"۔

امین نے ان کی احتیاط کو پسند کیا۔ وہ جانتی تھی کہ حویلی میں دو کاریں تھیں پھر بھی آزر نواب ان کے غیر ضروری استعمال سے احتراز کرتے تھے۔

"تو ہم بس سے چلے جاتے"۔ وہ بولی "آپ کی نوابی شان میں فرق آجاتا کیا؟"

"ادھر بس صبح و شام ایک ہی آتی ہے۔ وہ بھی کبھی کی جا چکی ہوگی"۔ بشارت نواب نے کہا YOU KNOW امین" انھوں نے ایک دفعہ کا ذکر سنایا۔ "میں بس سے جا رہا تھا۔ بڑی بھیڑ تھی ایک صاحب آتے اور میرے دونوں پاؤں پر کھڑے ہو گئے"۔

"جان بوجھ کر؟" امین کی دلچسپی بڑھی۔

"جان بوجھ کر کھڑے ہوتے تو میں ٹِک نہیں دیتا انھیں اٹھا کر؟ وہاں دھکا پیل ہی ایسی تھی"۔

"اچھا اچھا سمجھ گئی۔ پھر کیا ہوا؟"

"بڑی دیر تک وہ یونہی کھڑے رہے، اور میں صبر کرتا خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بھیڑ چھٹی،

لیکن وہ پھر بھی نہیں ہٹے ۔ تب میں نے بڑی عاجزی سے ان سے کہا،" بشارت نواب رک گئے ۔
"کیا کہا ؟" ایمن نے ہمہ تن گوش ہوکر پوچھا ۔
"میں نے ان سے پوچھا ۔ جناب آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا کب سیکھیں گے ؟"
ایمن کی ہنسی کا فوارہ سا چھوٹ پڑا ۔
"جھوٹ، بالکل جھوٹ ۔ آپ نے آج تک بس کے پایدان پر بھی پانو نہیں رکھا ہوگا ۔"
وہ بولی ۔

"وہ تو ٹھیک ہے ۔ لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ اس وقت آپ بھی میرا ایک پانو کچل رہی ہیں ۔"
ایمن اچھل پڑی ۔ واقعی بشارت نواب کی باتوں میں گم وہ پیچھے بیٹھتے بیٹھتے رک گئی تھی ۔
ان کا ایک پانو اسٹارٹر پر اور دوسرا زمین پر رکھا تھا جو ایمن کے پانو تلے دب گیا تھا ۔
ایمن کی نظر اوپر دریچے پر گئی جہاں شاہانہ صاحبزادی کھڑی تھیں ۔ ایمن نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی اور شاہانہ صاحبزادی کی دنیا بہت مختلف تھی ۔ اسی لیے اب وہ دونوں جب بھی ملتی تھیں تو ان کے برتاو میں تناو نہیں ہوتا تھا ۔ چنانچہ اس وقت بھی شاہانہ صاحبزادی نے دریچے میں کھڑے کھڑے انھیں جاتے دیکھ کر ہاتھ ہلادیا ۔
ایمن پکنک کی باسکٹ سنبھالے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور بشارت نواب نے موبائک اسٹارٹ کردی ۔

"یہ باسکٹ بیچ میں نہ ہوتی تو اچھا تھا ۔" بشارت نواب نے پلٹ کر ایمن کو دیکھتے ہوئے کہا ۔
اس نے ہنس کر ایک ہاتھ سے ان کے بال پکڑ کر ان کا سر آگے گھما دیا ۔
"آگے دیکھیے ۔ کھائی میں گرائیں گے آپ ۔"
"تمھارے ساتھ کھائی میں گرنے میں بھی مزہ ہے ۔" وہ چلا کر بولے ۔
"معاف کیجیے ۔ ابھی میں نے اپنی پہلی تنخواہ بھی نہیں اٹھائی ہے ۔ ابھی میرا مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے ۔"

"چلو بعد میں سہی ۔ اس وقت میں بھی اپنا اچھا سوٹ نہیں پہنے ہوں ۔"
موبائک گیٹ سے نکل کر سڑک پر آگئی تھی ۔ سڑک پر ٹرکوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت اتنی زیادہ نہیں تھی ۔ لیکن جس رفتار سے بشارت نواب موبائک چلا رہے تھے اس سے ایمن کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا ۔
وہ تھوڑی دیر میں گولکنڈے کے پایدان پر کھڑے تھے ۔ اور سامنے وہ بلند بالا حصار تھا جس نے شاہان

منشیہ کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ لیکن ہر قلعہ مسمار ہونے کو بنتا ہے۔ زندگی کی وہ گھما گھمی اب کہاں تھی جو کسی زمانے میں گولکنڈے کے قلعے کی رہی ہوگی۔ یہاں کسی زمانے میں ہیرے زمین کا کلیجہ پھاڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب رہتے ہوں گے۔ 'قلم کار' اور تن زیب جیسے کپڑے بننے والوں نے نازک بدنوں کی جامہ زیبی کو تیار کیے ہوں گے۔ ۲۔ اکیریٹ کا دنیا کا سب سے بڑا ہیرہ 'کوہ نور' گولکنڈے ہی کی خاک سے انگلستان کے تاج تک پہنچا تھا۔ کئی ہاتھوں سے گزر کر — ہیرے بھی بیسواؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ انھیں کئی ہاتھوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ گولکنڈے کی تاریخ بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھی جو کچھ نظر آرہا تھا، سب کھنڈر تھا۔ گردشِ ایام کا منظر۔

"چلو مقابلہ ہو جائے قلعے پر چڑھنے کا۔" بشارت نواب نے امین کو چیلنج کیا۔

"ہو جائے" — امین بھی کمر کستے ہوئے بولی۔ لیکن وہ بڑھتی ہوئی دھوپ سے خائف تھی۔ بشارت نواب کی بات اور تھی۔ ان کا ورزشی جسم دوڑ دھوپ کا عادی تھا۔ جس کے آگے نازک بدن امین، برگد کے تنومند پیڑ پر اُگی چمبیلی کی پنکھڑی جیسی تھی لیکن اس نے تم ٹھونک ہی لیا تو پیچھے ہٹنا کیسا۔

"چلو تمھارے ساتھ اتنی رعایت کرتے ہیں کہ یہ پکنک باسکٹ ہم لیے چلتے ہیں۔" بشارت نواب بولے اور ان کا سفر شروع ہو گیا۔

کچھ دور تک دونوں ساتھ ساتھ سیڑھیوں پر چڑھتے رہے۔ چوڑی چوڑی سیڑھیاں جنھیں امین دو تین قدموں میں طے کر رہی تھی بشارت نواب انھیں ایک ایک لمبے ڈگ میں پار کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سینڈل پہنے ہوئے بڑے بڑے پاؤں امین سے دور ہوتے گئے۔ سفید پتلون اور نیلی جرسی میں ان کے قدم بڑی آسانی سے اٹھ رہے تھے، جیسے وہ برف پر اسکیٹنگ کر رہے ہوں۔ پچیس تیس سیڑھیوں کے بعد وہ اچانک رک گئے۔ انھیں رکتے دیکھ کر وہ بھی رک گئی۔

"معاملے کی بات تو طے ہوئی نہیں!" — وہ اپنی بلندیوں سے بولے۔

"کیسا معاملہ؟" — امین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہار جیت کے فیصلے پر۔ انعام تو مقرر ہوا ہی نہیں!"

"بشارت نواب، یہ انعام اکرام تو آپ ہی رئیسوں کا خاصّہ ہے۔ میں بے چاری آپ کو کیا دے پاؤں گی" امین اپنی کھلی ہوئی زلفیں گوندھتی بولی۔

"تمھیں بھی تو خدا نے مالا مال کیا ہے" — بشارت نواب نے دھوپ میں اس کے تمتاتے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

"آپ بھی اچھا مذاق کرتے ہیں" امین کھسیا کر بولی۔

بشارت نواب نے کہا " بھول رہی ہو کہ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے تمھارے نام گولکنڈے کا قلعہ لکھا ہے" اور وہ دونوں زور سے ہنس پڑے

"چلیے یوں کرتے ہیں کہ جیتنے والے کو حق دیا جائے مانگنے کا" بشارت نواب بولے "لیکن ایسی چیز مانگنی ہوگی جو دینے والے کے بس میں ہو"

"منظور ـــــ لیکن ٹھہریے" امین نے کچھ سوچ کر کہا۔ اسے بشارت نواب کی شرارت سے خدشہ تھا "کوئی نامناسب ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں بھئی نہیں ـــــ توبہ توبہ! تم لڑکیوں کا دماغ بس ہر وقت ایسی ویسی باتیں ہی سوچا کرتا ہے ـــ میں ایک شریف لڑکا ہوں ـــ ویسے تم کہو تو وہی مانگ لوں جو تم سوچ رہی ہو" بشارت نواب بولے۔

امین کھسیا کر ہنس پڑی ـ لیکن وہ جانتی تھی کہ بشارت نواب گرجنے والوں میں سے ہیں برسنے نہیں۔

"آپ تو ایسے کچھ رہے ہیں جیسے ضرور آپ ہی جیت جائیں گے؟"

"وہ تو ہوگا ہی" بشارت نواب شانے چڑھا کر بولے

"کچھوے اور خرگوش کی کہانی بھول گئے کیا؟"

"میں تو کسی بھی قیمت پر وہ خبیث کچھوا بننے کو تیار نہیں ہوں ـ بڑا گھرا تھا وہ سالا"

"نواب صاحب سنبھلیے! زبان بگڑی جاتی ہے" امین نے مصاحبی انداز میں کہا ـــ اور بشارت نواب کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

بشارت نواب کچھ دور تک تو اس اڑتی ہوئی تتلی کو دیکھا کیے، پھر اطمینان سے سیٹی بجاتے خود بھی چل پڑے۔

بادل گھر گھر کر آرہے تھے، انھوں نے جاگتے سورج کی پلکیں موند دی تھیں لیکن اس کے باوجود کچھ ہی دیر بعد امین ہانپنے لگی۔

"میں نے غلطی کی مجھے شروع ہی سے دوڑ نہیں لگانی چاہیے تھی" اس نے سوچا اور پلٹ کر دیکھا ـ بشارت نواب بہت قریب پہنچ گئے تھے ـ ان کے چہرے پر کوئی تکان نہیں تھی جس کی گواہی ان کی سیٹی کی ہمواری دے رہی تھی ـ ان کے اطمینان نے امین کے لیے مہمیز کا کام کیا اس نے اپنے قدم اور تیز

کرو یے سیلن پھر بھی بشارت نواب اس کے برابر سے گزر گئے۔

"ہار مان لو۔" جاتے جاتے انھوں نے کہا۔

امین نے ہانپتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔

بشارت نواب نے شانے اُچکائے اور آگے بڑھ گئے، گویا کہہ رہے ہوں تمھاری مرضی!

امین نے بھی طے کر لیا تھا کہ شرط کو منزل تک پہنچانا ہے۔ گو ایسی شرطیں بچکانی ہوتی ہیں لیکن کیا ہر بڑے انسان میں کوئی بچہ موجود نہیں ہوتا۔؟ بشارت نواب گٹھے ہوئے بدن کے مالک تھے تو اس کو اپنی سبک رفتاری پر ناز تھا اسکول میں ہمیشہ وہی دوڑ میں اوّل آتی تھی۔ اسپورٹس میں اس کے نام کا سکہ جما ہوا تھا۔ صرف تیراکی سے وہ ہمیشہ ڈرتی رہتی تھی۔ اس کے والد کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ تیراکی نہیں سیکھ سکی تھی۔ اس نے پرانی سب یادوں کو اپنی کمک کے لیے بلایا اور دوڑ پڑی۔ وہ اب بشارت نواب کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے زور لگا کر اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، تاکہ ان سے آگے نکل جائے۔

آگے حدِ نظر تک ٹوٹے پتھروں کی سیڑھیاں ہی سیڑھیاں تھیں۔ جب وہ بشارت نواب کے برابر سے گزر رہی تھی تو ایک چھوٹے سے پتھر پر اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ سنبھل کر آگے بڑھی، لیکن اس ٹکّر سے بشارت نواب کے ہاتھ سے پکنک باسکٹ گر گئی۔ بشارت نواب نے سیٹی بجانی بند کر کے اسے بھنّا کر دیکھا۔ "اب تو انعام کی شرطیں اور کڑی ہو گئیں یہ بے ایمانی ہے۔" انھوں نے سینڈوچ کا ڈبا اور سیب جلدی جلدی باسکٹ میں بھرے اور پیروں میں بھی بجلی بھر لی۔

امین موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ لیکن اب اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ چٹان سے ٹیک لگا کر دو منٹ سستا لے، لیکن موڑ کے ادھر بشارت نواب کے قدموں کی چاپ نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک موڑ پر پہنچ کر سیڑھیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اور اس کے پیچھے ہی قلعے کی کشادہ گود نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہمت کا دامن تھاما اور لڑکھڑا کر آگے بڑھی۔ اس کا دل خوشی کے مارے اور بھی تیز دھڑکنے لگا۔ بہت کم سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اور ابھی تک بشارت نواب اس کی گرد نہیں پا سکے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے آخری جست لگائی۔ اور قلعے کی زمین پر پہنچ گئی۔ لیکن وہی زمین جیسے اس کے پیروں تلے سے کھسک گئی جب اس کے لڑکھڑاتے جسم کو دو مضبوط بانہوں نے سنبھال لیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو بشارت نواب کی ہنستی ہوئی آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ امین کی کیفیت وہی ہوئی، جیسے ہوا بھرے غبارے میں کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور دہیں گھٹنوں کے بل ڈھیر ہوگئی۔ بڑی دیر تک اسے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی ہار سے دل برداشتہ ہوکر رو رہی تھی یا وہ انتہائی تھکن کے بے بس آنسو تھے۔

You are a Poor Loser ایمن "۔ بشارت نواب کی آواز آئی ۔۔۔" مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اپنی ہار برداشت نہیں کر پاؤ گی "۔

اس سے بشارت نواب کی آواز میں پہلی بار سنجیدگی کا شائبہ ملا۔ اور اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے۔

" یہ بات نہیں ہے"۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا " یہ سب کچھ بڑا اچانک ہوا ۔۔۔ مجھے اپنی جیت کا یقین تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ جیت گئے ۔ ۔ ۔ ۔ میں چکرا گئی تھی "۔

" تم رو رہی تھیں" بشارت نواب نے شکایتاً کہا۔

" نہیں وہ مسکرا کر بولی ۔۔۔ اسے واقعی اپنے بچپنے پر ہنسی آگئی ۔ " لیجیے میں اپنی ہار مانتی ہوں اور شرط پوری کرنے کو تیار ہوں "۔

بشارت نواب کچھ دیر ایمن کے پھولے ہوئے سانس اور سرخ دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھتے رہے، پھر بے پروائی سے بولے " تم نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ۔۔ اب ایسے میں کیا کوئی اپنا حق مانگے ۔۔۔ پھر کبھی سہی "۔

" منظور ! ۔۔۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو کیا مانگتی ۔۔۔ جانتے ہیں آپ ؟ "

" کیا ۔۔۔ ؟ " ۔۔۔ بشارت نواب کسی نامعلوم ٹارگٹ پر کنکریاں پھینکتے ہوئے بولے۔

سینڈوچوں میں تین چوتھائی حصہ اور دو کپ کافی "۔

" یہ تو بڑی دیجی ٹیرین خواہش ہوئی "۔

" تو میں خدانخواستہ کوئی آدم خور تھوڑے ہی ہوں ۔۔۔ لیکن ایک بات بتائیے ۔۔۔ آپ مجھ سے پہلے پہنچے کیسے ؟ "

" جس آخری موڑ پر تم سیڑھیاں طے کر رہی تھیں ۔ وہیں چٹانوں کے پیچھے سے ایک اور راستہ بھی اوپر کو آتا ہے "۔

" یہ تو بے ایمانی ہوئی "۔ ایمن بھنکی ۔ آپ کو بھی وہی سیڑھیاں طے کرنی چاہیے تھیں۔

" محترمہ ایمن شہاب صاحبہ، واضح ہو کہ شرط قلعے پر چڑھنے کی تھی، سیڑھیوں کا کہیں ذکر

نہیں تھا۔

امین کو چپ ہونا پڑا۔

"اب کیا ارادہ ہے، میں سب کچھ صاف کر دوں یا تم بھی کچھ کھاؤ گی؟"، بشارت نواب ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

امین نے مگ میں کافی انڈیلی۔

سامنے بلند بالاحصار نظر آرہا تھا اور بہت دور سامنے کچھ اور کھنڈر تھے۔ جس کی برجیاں اور جھروکے اب بھی سلامت تھے۔

"وہ رنگ محل ہے" بشارت نواب نے انگلی اٹھائی۔ "بادشاہ یہاں بالاحصار پر تشریف رکھتے تھے اور ان کی منظور نظر وہاں رقص کرتی تھی"۔ رنگ محل اور بالاحصار کے درمیان کئی فرلانگ کا فاصلہ تھا لیکن اس زمانے میں صوتیات کا علم اس پایہ تک پہنچ چکا تھا کہ اتنی دور سے بھی رقاصہ کے گھنگھروؤں کی صدا بالاحصار تک پہنچ جاتی تھی"۔

سینڈوچ کا ٹکڑا امین کے منہ میں اسی طرح دبا رہ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے واقعی فضا میں گھنگھرو بج رہے تھے۔

اللہ اللہ کیا زمانہ ہوگا وہ جب لوگ طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چاپ پر سلطنتوں کے نصیب تولا کرتے تھے۔ یا پھر ہو سکتا ہے، اس وقت کا انسان اور اس کی سیاست اتنی پیچیدہ نہیں ہوگی۔۔۔ اس کی نفرت اور محبت اتنی عمیق نہیں ہوگی جتنی اب ہے۔ لیکن نفرت اور محبت تو انسان کے بنیادی جذبے ہیں زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد۔ یہ کیسے بدل سکتے ہیں،

"کیا سوچ رہے ہو حکیم جالینوس؟" بشارت نواب نے اسے کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

امین چونکی "نہیں، میں کچھ کھو گئی تھی"۔

"تم کبھی نہیں کھو سکتیں ۔۔۔ تم تو بڑے سمندر میں کھڑا لائٹ ہاؤس ہو جو بھٹکے ہوئے جہازوں کو راستے پر لگاتا ہے"۔ بشارت نواب بولے۔

امین نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ یہ آج بشارت نواب کیسے بہکے تھے کہ ڈھنگ کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کے دل میں ہمدردی جاگی۔ اسے احساس ہوا کہ بشارت نواب کے کھلنڈرے پن اور شرارت کے پردے کے پیچھے ایک بشارت نواب اور بھی چھپا ہے، جو زیادہ سنجیدہ، زیادہ حساس اور وقت آنے پر زیادہ ذمہ دار ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے کھلنڈرے پن کے ذمہ دار وہ خود کتنے تھے؟

یہ سوال بھی اہمیت رکھتا تھا۔ صرف بشارت نواب ہی نہیں شاید سب ہی نواب زادوں کی تربیت اس خاص معاشرے کے لیے کی گئی ہوگی جو ایک طرح سے سیل بند تھا ـــــ جو بجائے خود جامع اور واضح تھا۔ لیکن اب تاریخ کی کروٹ کے ساتھ ملک کے دوسرے معاشروں کے ساتھ گھلنے ملنے کی ضرورت آپڑی تھی۔ اس کے لیے کسی زبردست catalyst کی ضرورت تھی۔

بشارت نواب کو واقعی کسی لائٹ ہاؤس کی ضرورت تھی جس کی روشنی میں وہ اندھیروں سے واپس آسکیں۔ شور مچاتی آگے بڑھتی دنیا میں اپنا مصرف جان سکیں۔ لیکن بشارت نواب کا لائٹ ہاؤس کون بنے؟ اس میں خطرہ تھا۔

"تو پھر چلو لائٹ ہاؤس"۔ بشارت نواب پتلون جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے "راستہ دکھاؤ"۔

" مجھے نہیں بننا ہے آپ کا لائٹ ہاؤس"۔ امین نے خوش مزاجی سے کہا "آپ کا جہاز بہت ڈولتا ہے"۔

بشارت نواب کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتے رہے، پھر بولے" ڈولتے جہازوں کو ہی لائٹ ہاؤس کی ضرورت ہوتی ہے"۔

ان کے بولنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کی نظریں چرا کر امین کو دوسری طرف دیکھنا پڑا ـ سنجیدہ ہونے ہوئے بشارت نواب اسے کچھ پریشان کر دیتے تھے۔

"چلیے چلیں ـــــ دیر ہو رہی ہے"۔ اس نے جھک کر باسکٹ میں سامان بھرتے ہوئے کہا۔

"ارے ابھی تم نے اسلحہ خانہ تو دیکھا ہی نہیں"۔

"نہیں، میں نہیں دیکھوں گی ـــــ ہتھیاروں کو دیکھ کر مجھ پر قنوطیت طاری ہو جاتی ہے"۔

"لیکن یہ تو شاید حوا کی امت ساتھ ہی لیے پھرتی ہے"۔

"کیا مطلب"؟ امین پلٹی۔

"سنا دوں وہ شعر؟"

شوق نے چاہا تھا اسرار قبا تک پہنچے
وہیں خنجر کی طرح ابروے جاناں اٹھا

شعر اچھا تھا لیکن شوخی سے بھرپور اور بشارت نواب نے بھی ہر گز وہ شعر معصومیت سے

نہیں سنایا تھا۔ لیکن اسے برا نہیں لگا، وہ ان کی شوخی کو طرح دے جاتی تھی، کیونکہ ان کی فطرت میں قابل اعتراض گہرائی نہیں تھی۔

" چلو، کیوں نہ واپسی میں قطب شاہی گنبد دیکھتے چلیں ۔ ہمارے آباء واجداد سے ملاقات ہو جائے گی "

" ہونہہ! آپ کے آبا و اجداد کہاں سے ہونے لگے وہ " ایمن بولی،" آپ خاص دکنی تھوڑے ہی ہیں "

" کیا کیا جائے بھئی ۔۔۔ اس لڑکی کی ہسٹری بہت کمزور ہے " بشارت نواب کسی ماسٹر کی فکر مندی سے بولے ۔" ارے بابا، محمود شاہ بہمنی کا نام سنا ہے کبھی ؟ "

" ہاں ان بزرگوار کو جانتی ہوں میں "

" تو کیا تم اس وقت دربار میں موجود نہیں تھیں جب ہمارے جدّ امجد قلی قطب شاہ کو بادشاہ نے " صاحب سیف و قلم " کا خطاب دیا تھا ۔؟ کیونکہ وہ نہ صرف جیوٹ سپاہی تھے بلکہ عالم فاضل بھی تھے آیا عقل شریف میں ؟ سر کیا ہلا رہی ہو ۔۔۔ کورنش بجا لاؤ میرے حضور ! "

" افسوس کر رہی تھی " ایمن بولی " آج قلی قطب شاہ زندہ ہوتے تو اپنے خاندان کا ایسا کپوت دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے " ایمن نے بشارت نواب کے سر سے پاؤں تک اشارہ کیا۔ اور اس سے پہلے کہ بشارت نواب کا ہاتھ اس کے سر پر پڑتا وہ کرسی سنبھال کر بھاگ نکلی ۔

جب وہ لوٹے تو شام ہو رہی تھی ۔۔۔ ان کے آگے ہی حویلی میں ایک اسپورٹس کار داخل ہو رہی تھی ۔

" ممی اور پاپا ابنا راستہ آپ بناتے ہیں " بشارت نواب بولے " لنچ کے بعد شاید مختار نواب ممی کو چھوڑنے آئے ہیں "

ایمن خاموش رہی ۔ وہ رفتہ رفتہ اس آزاد منش رئیس خاندان کے طور طریق سے واقف ہو رہی تھی، جو ساتھ ہی اس کے لیے بھی سرخ سگنل تھا ۔ اس نے خود کو ٹٹول کر سوچا کہ کیا اس کے والد زندہ ہوتے تو اس کا اس طرح بشارت نواب کے ساتھ موبائک پر جانا پسند کرتے ؟ ۔

" میں نے تمہیں جھوٹی موٹی نہیں بنانا چاہا تھا " ایک روز انھوں نے اپنی بیماری کے دوران کہا تھا ۔" ورنہ اس دنیا کے خارزار تمہیں روند دیں گے ۔ میرے نزدیک تجربہ انسان کی دہرائی ہوئی غلطیوں کا نام ہے ۔ میں تجربے سے زیادہ عقل اور دانش کو اہمیت دیتا ہوں ۔ وہ حدوں سے زیادہ خود پر بھروسا

کرو۔ میرے بعد میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے کھوئے ہوئے سہارے کی طرح یاد کرو۔ میں تمھارا ضمیر بن کر تمھاری یاد بن جانا چاہتا ہوں۔" اور امین نے ان سے لپٹ کر ان کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔

"لائٹ ہاؤس کر دیا نا تم نے آج میرے شینس کا ستیاناس،" بشارت نواب نے پچھلی سیڑھیوں کی طرف موبائک روک کر کہا۔

"آپ ہی تو لے گئے تھے مجھے اپنے آبا و اجداد سے ملانے!" امین اترتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"وہ زندہ ہوتے تو ہرگز ملانے نہ لے جاتا۔"

"کیوں کیا مجھے ان سے ملنے کے آداب نہیں آتے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ ان میں بڑے بڑے جید موجود ہیں اور میری ایک جان ــــ میں کس کس سے تمھارے لیے ہاتھا پائی کرتا۔"

امین نے بشارت نواب کا شکریہ ادا کیا اور جلدی جلدی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ اس نے آج بڑی سرکار کے ساتھ تمکین یار جنگ کی دختر کی شادی میں بھی جانا تھا۔ ہو سکتا ہے بڑی سرکار نے یاد بھی کیا ہو۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ ٹیبل پر ایک بڑا سا پارسل رکھا تھا۔ اس نے بہ عجلت اسے کھولا۔ اس کا مصوری کا سامان تھا۔ اور ساتھ ہی مسز آرزاک کا خط بھی۔ انھوں نے امین کو نوکری کی مبارکباد دی تھی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ اگر کسی وجہ سے نوابوں کی عالیشان حویلی راس نہ آتے تو ان کی کٹیا ہمیشہ اس کے لیے کھلی ہے ــــ پھر بڑی احتیاط سے انھوں نے نوجوان نوابوں کے کردار کی سہل انگاری کی طرف اشارہ کیا تھا اور امین کو ہشیار رہنے کی تلقین کی تھی۔

امین ان کی فکر پر مسکرا اٹھی اور سوچا کہ پہلی تنخواہ ملنے پر ضرور وہ ان کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ خرید کر بھجوائے گی۔

بڑی سرکار سے مسلسل قربت امین پر ان کی شخصیت کے نئے نئے باب کھولتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل ان کی سفید براق شخصیت ہر نئے آنے والے کو ٹھٹھکا دیتی تھی اور ان کی غلافی آنکھوں سے دھیرے دھیرے اٹھتی نظر ایسا لگتا تھا جیسے زمین سے قدم اکھیڑے دے رہی ہو۔ کھنچے ہوئے کماندار ابرو آنکھوں کو خوابیدہ بناتے تھے لیکن اگر کسی میں ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی تاب ہو تو وہ آنکھیں مسکراتی سی لگتی تھیں۔ سر کی ہلکی سی جنبش سے ان کے کانوں میں پڑے ہیرے ایک دم اس طرح چمک اٹھتے تھے جیسے

ان کے چہرے کے دونوں جانب چنگاریاں بھڑک اٹھی ہوں ۔ کشادہ ماتھے پر درمیانی مانگ کی دونوں جانب پیچھے کی طرف آگئے بال جب شمشاد ڈھیلی سی چوٹی میں گوندھتی تو کہنیوں پر یکساں ڈھلک آتے ۔ ان کے فریخ جالی کے لمبے دوپٹے کندھے پر بالکل سادے، سونے کے پن سے بجے رہتے ۔ یا پھر وہ شربتی ململ کے دوپٹے پہنا کرتیں، جنھیں شمشاد بڑے جتن سے چن کر رکھا کر تی ۔ آپا شاہی جوتی میں ان کے گورے اور نازک پانو صاف ستھرے لفافوں میں پاکیزہ خطوط کی طرح نظر آتے ۔ امین نے کبھی انھیں اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا ۔ وہ فرانسیسی، جرمن اور فارسی اسی سہولت کے ساتھ بولتی تھیں جتنی وہ اردو اور انگریزی پر قدرت رکھتی تھیں ۔ انھوں نے امین کو بتایا تھا کہ اردو فارسی اور انگریزی تو انھوں نے شادی سے پہلے سیکھی تھی، جرمن اور فرانسیسی شادی کے بعد ۔ امین نے حیرت کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا کہ نواب صاحب ہماری ہر خواہش کا احترام کرتے تھے ۔ وہ بہت کم بڑے نواب صاحب کا ذکر کرتیں اور جب بھی کرتیں تو کھو سی جاتی تھیں اور امین کو اندازہ ہوتا کہ بڑے نواب صاحب نے ان کو کتنا ٹوٹ کر چاہا ہوگا ۔

کبھی ان کی مسہری کے برابر کرسی پر بیٹھ کر امین انھیں کوئی کتاب پڑھ کر سناتی تو وہ آنکھیں بند کیے سنتی رہتیں ۔ کبھی کبھی امین کے جھکے ہوئے سر کو آنکھوں کے کنارے سے دیکھ لیتیں ۔ رفتہ رفتہ امین کی نرم اور گرم جوش آواز کا جادو ان پر چلتا جاتا، اور جب ان پر نیند کا غلبہ ہوجاتا تو امین اٹھ کر چلی آتی ۔ اور شمشاد وہیں ان کی مسہری کے پاس قالین پر بستر لگا کر سوجاتی ۔ وہ برسوں سے یہی کرتی آئی تھی ۔

"امین بی بی، تم تیار نہیں ہوئیں ؟" بڑی سرکار نے امین کو دیکھ کر پوچھا ۔ امین سے کوئی جواب نہ بن پڑا ۔ اپنی دانست میں تو وہ بڑی سرکار کے ساتھ شادی میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو کر آئی تھی ۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنا وہ اکلوتا غرارہ سوٹ پہن لیا تھا ۔ جو اب چار سال پرانا ہو رہا تھا ۔ اس کے پاس ہر مہینے اتنا پیسا بچتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے قیمتی کپڑے بنا سکتی ۔ دوسرے اسے کونسی دعوتوں ضیافتوں میں جانا پڑتا کہ وہ اس طرف توجہ کرتی ۔ پھر بھی لباس کے بارے میں اس کی پسند بڑی اچھوتی تھی ۔ روزمرہ کے جو بھی کپڑے اس کے پاس تھے وہ اس کے اچھے ذوق کا پتا دیتے تھے ۔

اس میں شک نہیں تیار ہونے سے پہلے وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کیا پہنے بڑی سرکار کے ساتھ جاتے ہوئے اسے ان کے رتبے کا بھی خیال کرنا تھا، لیکن جب اس کے پاس قیمتی کپڑے تھے ہی نہیں تو وہ کہاں سے لاتی ۔ ؟ تنخواہ ملنے پر اب ہر مہینے وہ اپنا وارڈروب ٹھیک کرے گی ۔ اس نے سوچا اور

فالسئی رنگ کا وہ غرارہ سوٹ پہن لیا ـــــ وہ خواہ کچھ بھی پہنے امین ہی رہے گی ۔ ایک پڑھی لکھی شریف لیکن متوسط گھرانے کی لڑکی ہونا کوئی عیب نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا رتبہ اس حویلی میں ایک باعزت نوکری کا تھا جو بلاشبہ بڑی سرکار کی منظورِ نظر ہوتی جا رہی تھی ۔ پھر وہ ان رئیسوں سے ٹکر کیسے لے سکتی تھی۔ گو بڑی سرکار کا برتاؤ اس کے ساتھ نوکروں جیسا نہیں تھا اور اسی وجہ سے حویلی کے دوسرے خدمتگار بھی اس کی عزت کرتے تھے ۔ لیکن پھر بھی امین نے خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں کیا۔ وہ چاہتی تو دوسری بہتر نوکری کی تلاش جاری رکھ سکتی تھی ۔ لیکن وہ حویلی اسے اب گوشۂ عافیت معلوم ہونے لگی تھی ۔ اس کے علاوہ یہ لوگ جن میں اب وہ رہ بس رہی تھی، ان سب سے مختلف تھے جن کا اسے تجربہ تھا ۔ وہ لوگ آسان کتابوں کے کھلے اوراق تھے، چاہو جہاں سے پڑھ لو ۔ لیکن سنہری جلد کے بیش قیمت اس صحیفے میں ڈھکی چھپی ان شخصیتوں کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ انھیں دیکھنے سمجھنے کی کوشش میں اس کا دل لگ رہا تھا ۔ گھبراہٹ اور نئے پن کا احساس اب ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک یگانگت نے لے لی تھی ۔ وہ وہاں مطمئن اور خوش تھی ۔

"تم ابھی تیار نہیں ہوئیں امین بی بی ؟" بڑی سرکار نے اپنا سوال دہرایا ۔

"جی ۔۔۔ جی سرکار ۔۔۔ میں تو تیار ہوں ۔"

"ہوں !" بڑی سرکار اسے کچھ دیر دیکھتی رہیں ۔ گلے میں آبدار موتیوں کی دو لڑیوں نے بتایا کہ وہ تیار تھیں ۔

"یہ کپڑے تم پر بہت سج رہے ہیں ۔" امین کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر انھوں نے کہا "شاہانہ صاحبزادی کو بلا لاؤ ۔" ـــــ پھر کچھ رک کر کہا "خیر تم ہی آؤ ۔"

امین آگے بڑھی بڑی سرکار نے اپنا چاندی کا وزنی گچھا نکال کر کہا "میرے ساتھ آؤ ۔۔۔۔ یہ الماری کھولو ۔"

بڑی سرکار کے ڈریسنگ روم میں داخل ہونے کا امین کے لیے یہ پہلا موقع تھا ۔ اس کے پاؤں دبیز قالین میں دھنستے جا رہے تھے ۔

کشادہ دیواروں میں مضبوط اسٹیل کی الماریاں اور وارڈروب لگے تھے ۔ ایک طرف کانچ کی ساری الماری چوڑی کے جوڑوں سے بھری پڑی تھی ۔ جس کے شیشوں پر روشنی پڑتے ہی چوڑیوں کے موتی اور نگینے انگاروں کی طرح دہک اٹھتے تھے ۔ اب بڑی سرکار ان کے استعمال سے دست بردار ہو چکی تھیں، پھر بھی وہ جوں کے توں رکھے تھے ۔ یہی حال جوتوں کا تھا ۔ لاتعداد بیش قیمت سلیم شاہی، جوتیاں

ریکوں میں سجی تھیں۔

امین کو چابیاں دے کر بڑی سرکار خود دیوان پر ٹک گئیں۔

"کھولو" انھوں نے تیسری الماری کی طرف اشارہ کیا۔

کھلی ہوئی الماری، سرخ مدرے میں لپٹے ہوئے بے شمار لباسوں سے لدی ہوئی تھی۔

بڑی سرکار کے ایما پر امین نے ایک زرتار جوڑا نکالا۔ گہرے سبز رنگ کا یہ جوڑا بہت قیمتی اور وزنی تھا۔ مشجر کا تنگ کلی کا پاجامہ اور اس پر تار بانے کا کرتا اور ایکلیئ نماسات گز کا دوپٹہ جس پر بہت چوڑا لچکا اور گوٹا لگا تھا۔ دوپٹے کے دونوں پلو سوا، سوا گز لمبے اور گوٹا کناری سے وزنی ہو رہے تھے۔ جن پر سچے موتیوں کی جھالر ٹکی تھی۔ امین نے اپنی سیدھی سادی زندگی میں یہ زرتار رقص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لباس کا وزن محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ اس لباس کو جھیلنے کے لیے کتنے مضبوط کندھوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا واقعی شاہانہ صاحبزادی اس طرح کے کپڑوں کو سنبھال لیتی ہوں گی۔؟ لیکن اسے شاہانہ کی یہ حرکت نامناسب لگی۔ جب معلوم تھا کہ انھیں بڑی سرکار کے ساتھ جانا ہے تو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کپڑوں کے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ مگر بڑی سرکار کے ابرو پر بل تک نہیں تھا۔ وہ شاہانہ کو بہت چھوٹ دیتی تھیں۔

"اب یہ الماری کھولو" بڑی سرکار نے امین کے الماری بند کرنے کے بعد کہا۔ اس الماری میں تالے کا دہرا انتظام تھا۔ جب امین نے الماری کھولی تو دیکھا کہ الماری مختلف سائز کے مخملی ڈبوں سے لبالب بھری پڑی تھی۔ اب بڑی سرکار خود اٹھیں اور چھانٹ کر دو ڈبے نکالے اور الماری بند کر دی۔ امین کو پسینا آگیا کہ بڑی سرکار نے ایک اجنبی لڑکی کو کس طرح اس سلیمانی خزانے کے قریب پھٹکنے دیا۔

"بلالاؤں شاہانہ کو؟" امین جلد سے جلد وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔

"نہیں، تسنیم پاشا کے ساتھ وہ جا چکی ہوں گی۔ یہ تم پہنو گی" اور وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکل گئیں۔

امین دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہیں دیوان پر بیٹھ گئی۔ اس کی جو حیثیت تھی وہ اسی پر خوش تھی۔ اسے ذرہ برابر بھی اپنی کم مائیگی کا احساس نہیں تھا۔ وہ مانگے کے پر لگا کر پرواز کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے استقلال سے کپڑوں کا وہ جوڑا اور زیور کے ڈبے اٹھاتے اور یہ سوچ کر کہ وہ معافی مانگ کر انھیں بڑی سرکار کو لوٹا دے گی۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے

اسے ایسے لگا جیسے ہر قدم پر وہ اپنی کچھ ہمت پیچھے چھوڑتی جارہی تھی اس میں بڑی سرکار کے روبرو ہونے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ ان کے مشفقانہ برتاو کا صلہ نہیں تھا۔ وہ اسلئے بیرول لوٹی جلدی جلدی اپنا سوٹ اتارا اور بڑی سرکار کے دیئے ہوتے کپڑے پہن لیے۔ زمرد کے بیش قیمت جھمکے اور گلے میں اسی کے ساتھ کی جگنی پہنتے ہوتے تھوڑی دیر کو اس کے ہاتھ کانپے لیکن جب دیوار میں فرش سے چھت تک پہنچتے ہوتے وسیع آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا تو ایک گرم سی لہر اس کے سر سے پانو تک دوڑ گئی۔ گہرے سبز تار بانے نے اپنا کچھ رنگ اس کی سنہری آنکھوں کو دے دیا تھا اس کے گال دمک گئے تھے ہلکے رنگے ہوتے ادھ کھلے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کی حیرانی نے اسے حسین تر بنا دیا تھا۔ اور وہ اس احساس حسن سے بے بہرہ نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پانو زمین میں گڑ گئے تھے لیکن باہر دوسرے کمرے میں بڑی سرکار اس کی منتظر تھیں۔ اسے وہاں جانا ہی تھا۔ اس نے ہمت کر کے قدم بڑھاتے اور ڈریسنگ روم کی بتی گل کر کے باہر نکل آئی۔

بڑی سرکار نے ایمن کو سر سے پانو تک دیکھا، لیکن کچھ کہا نہیں۔ صرف انکی نظر نے بتایا کہ اب وہ مطمئن ہیں۔ پھر بھی ایمن کا دل دھڑکے جارہا تھا۔ اس نے محلات کے کچھ قصے ایسے بھی سنے تھے جہاں بے مایہ کنیزوں پر عنایتوں کی بوچھار بھی کی جاتی تھی اور خفا ہونے پر انھیں چپ چاپ دفن بھی کر دیا جاتا تھا۔

بڑی سرکار جانے کو تیار ہوئیں تو ایمن بھی قیمتی اور بوجھل کپڑوں میں سبھج سبھج قدم رکھتی ان کے پیچھے چل دی۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بڑی سرکار ہمیشہ اس کا ہاتھ تھام لیا کرتی تھیں۔ آج بھی یہی ہوا۔ پورٹیکو میں شوفر کار کا دروازہ کھولے مودبانہ کھڑا تھا۔ ایمن بڑی سرکار کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی آگے شوفر کے ساتھ شمشاد بیٹھی تھی اس نے بڑی سرکار کی کشمیری شاہ توش شال اور چاندی کا وزنی پاندان اور تولیا تھاما ہوا تھا۔

ایمن نے پرانے شہر حیدر آباد کا یہ حصہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فیشن ایبل بازار عابد روڈ سے گزر کر ان کی کار پتھر گٹی پہنچ گئی تھی۔ گلزار حوض اور پھر چار مینار پہنچتے ہی بشارت نواب کی بات یاد کر کے ایمن کو ہنسی آگئی۔ بشارت نواب نے اسے بتایا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب شہر کی جان "چار مینار" شہدوں کے دم سے تھی، کسی کی پگڑی اچھالنی یا کسی کو سر بازار رسوا کرنا ہوتا تو ان شہدوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ شہدے بادشاہ وقت میر محبوب علی خاں پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ اس حد تک شاہانہ درگزر سے فیضیاب تھے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی تو وہ پیچھے ہاتھی کی دم پکڑ کر چڑھ آتے اور کہتے۔

"داتا! دے!" اور انھیں خیرات سے مالا مال کر دیا جاتا۔ بشارت نواب نے اسے یہ بھی بتایا تھا

کہ اس وقت ہاتھیوں کی دم مضبوط ہوا کرتی تھی۔ اور جو کچھ بشارت نواب اسے نہیں بتا سکے وہ لائبریری میں رکھی تاریخی کتابوں نے اسے بتا دیا تھا ــــ کہ بادشاہ قلی قطب شاہ نے جو خود ایک اچھا مصوّر تھا، جب حیدر آباد شہر کو جنت نظیر بنانے کے بارے میں سوچا تو اسے شہر کے لیے ایک خوب صورت مرکز کی ضرورت پڑی۔ جس کے چاروں طرف شہر بسایا جا سکے۔ چنانچہ چار مینار بنا جس میں کروڑوں انڈوں کی سفیدی مضبوطی کے لیے گارے چونے میں ملائی گئی۔ سب سے پہلے چار مینار مکتب کے لیے استعمال ہوا اس کے بعد اسے عوام تک پیغام رسانی کا مرکز بنا دیا گیا، اور پھر فرانسیسی کمانڈر BUSSY نے اسے اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرح استعمال کیا وغیرہ لیکن امین اس وقت تاریخ کی یاد تازہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کیونکہ خوشبو کے ایک جھونکے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔

خوشبو کا بھی ایک لمس ہوتا ہے جو احساس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ امین نے بھی محسوس کیا جیسے وہ خود کسی خوشبو دار وادی میں داخل ہو گئی ہو۔ ان کی کار چار مینار کا چکر کاٹ کر دائیں طرف مڑ کر لاڈ بازار میں داخل ہو گئی تھی۔ یہ سہاگنوں کا البیلیوں کا بازار ہے جس کی دو رویہ دکانیں جوانی اور سہاگ کی ضامن ہیں ــــ چوڑیاں، سہاگ پڑے مہندی چلکہ، شادی بیاہ کے لوازم، زرین شیر دانیاں، دولھوں کے لیے تاش کی دستاریں اور عورتوں کے سنگھار کا سامان ملتا ہے۔ ہر عورت کی نسوانیت اسے لاڈ بازار میں کھینچ لاتی ہے۔ اس وقت بھی بعض دکانوں میں چھوٹی دیوار کی کارچوبی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں جنھیں لڑکیوں کو اس وقت تک پہنایا جاتا تھا جب تک وہ دوپٹے پہننے کے قابل نہیں ہو جایا کرتی تھیں۔ شرم و حیا کی قدریں بدلتی رہتی ہیں اسی لیے ان ٹوپیوں کا رواج بھی کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ امین نے خود کسی لڑکی کو ایسی ٹوپی پہننے نہیں دیکھا تھا۔

بازار اگربرکی اور عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جسے حیدر آبادی خواتین اپنی زلفوں اور سانسوں میں بسا لیتی تھیں۔ خدا نے عورتوں کو رنگ و نور اور خوشبوؤں سے مہکتی کائنات عطا کی ہے پھر بھی یہ کیوں مردوں کی دنیا میں گھسنے کے لیے مصر رہتی ہیں۔ امین نے سوچا۔ آج اس پر زبردست نسوانیت چھا رہی تھی۔ پتا نہیں یہ خوشبوؤں کے طوفان کا کرشمہ تھا جو اسے بہائے لے جا رہا تھا یا اس زرتار طوس کی کرامت جو اس کے عورت ہونے کے احساس کو مہمیز لگا رہا تھا۔ شاید اس کے حالات نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو آج وہ بھی کسی کے دل کی ملکہ، گھر کی رانی بنی کسی چار دیواری میں راج کر رہی ہوتی لیکن زمانہ اور زمانے کے تقاضے اب بدل رہے تھے گھر کی رانیاں اور دل کی ملکائیں تلاش روزگار میں سرگرداں ہو رہی تھیں۔

شام ہو جانے کی وجہ سے سارا بازار چراغاں ہو گیا تھا۔ روشنیوں کے سیل میں نگوں والے چوڑی کے جوڑوں اور گوٹے کناری کی دمک سے سارا بازار شیش محل بن گیا تھا۔

پرانے چوک کا چکر کاٹ کر جب وہ آگے بڑھے تو شوفر کو کار کی رفتار کم کرنی پڑی، کیونکہ آگے ایک لمبا جلوس تھا جو بینڈ باجوں اور شہنائیوں کی گونج میں بہا چلا جا رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی موٹریں ہی موٹریں تھیں۔ بگھیوں، تانگوں، جھٹکوں اور شکراموں کی قطار الگ تھی۔ لنگوٹی لگاتے بھوئیوں (مرد کارندوں) کے سروں پر گیس لائٹیں زربفت کا رچوبی تورہ پوشوں سے ڈھکے ان گنت خوان تھے۔

روشن چوکی پر زرتار شیروانیاں اور صافے پہنے شہنائی والے اپنے ہنر کا کمال دکھا رہے تھے۔ برات میں شامل تھوڑی تھوڑی دور پر تخت رواں، بھی تھے جن پر رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ ان کے چکردار غمزے ہر نظر کو ملتفت کرتے تھے۔ وہ جن تختوں پر ناچ رہی تھیں انھیں دس دس تنومند بھوئی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے۔ ان کے کندھے ضرور سسک رہے ہوں گے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی براتی ہی براتی تھے۔ ایمن نے اپنی زندگی میں اتنی دھوم کی برات نہیں دیکھی تھی۔ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ساتھ ہی ایک اندرونی تھکن کا احساس تھا جسے وہ درگزر کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ کتنا مختلف تھا اس دنیا سے جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آئی تھی۔ حقیقت کیا تھی اور سراب کیا تھا وہ طے نہیں کر پا رہی تھی۔

تمکین یار جنگ کی حویلی شاید قریب آ رہی تھی۔ دور ہی سے فضا میں روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آنے لگا تھا۔ نوبت اور شہنائیوں کی گونج بڑھ رہی تھی۔

"ہمیں برات میں شامل نہیں ہونا چاہیئے"۔ بڑی سرکار بولیں منجھلی بیگم کو شکایت ہو گی کہ ہم براتی بن کر آئے ہیں۔ اعظم علی کوشش کرو کہ ہم برات کے پہنچنے سے پہلے پہنچ جائیں۔" وہ ڈرائیور سے مخاطب تھیں اس نے صرف سر جھٹکا دیا۔ لیکن اس سمندر سے باہر نکلنا آسان نہیں تھا پھر بھی پتا نہیں اس سمجھے ہوئے ڈرائیور نے کیا کیا کہ وہ لوگ ایک پتلی سی گلی میں نکل آئے جس میں کئی موڑ تھے۔ وہ لمبی چوڑی کار ان تنگ گلیوں میں سپنولے کی طرح رینگنے لگی۔ برات کا شور و شغف دور ہو رہا تھا لیکن یہ کیفیت بس تھوڑی دیر کے لیے تھی۔ دوبارہ اٹھتے ہوئے شور اور روشنی نے بتایا کہ وہ حویلی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

نوبت اور شہنائیوں کی آواز سے سارا ماحول گونج رہا تھا اور وہ خود بلبوں کی روشنی میں آسمان سے ٹوٹا ہوا شہاب ثاقب لگ رہی تھی۔ اس وسیع اور شاندار حویلی کی دیکھ ریکھ کوئی کھیل نہیں تھی۔ صرف اس کی آہک پاشی اور داغ دوزی پر تمکین یار جنگ کے پندرہ ہزار روپے اٹھ گئے تھے۔ مہینا بھر پہلے سے

سیکڑوں مزدور کام پر لگائے گئے تھے۔ باغ کی روشیں ٹھیک کروائی گئی تھیں حویلی کے تینوں حصّوں کو ملا کر یہ اتنے بڑے رقبے پر بنی تھی کہ کسی انجان شخص کا اس میں کھو جانا یقینی تھا۔

بڑے بڑے وسیع ہال جن کی بلند و بالا چھتوں سے کرسٹل جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے جو ہوا کے ہر جھونکے سے کھلکھلا پڑتے تھے۔ عام طور پر زنانخانے اور مردانے کے دونوں بازو، درمیانی عظیم تر ہال سے ملے رہتے تھے جن کا ایک ہی برآمدہ تھا لیکن شادی میں آنے والوں کی بھاری تعداد کو دیکھتے ہوئے آج اس ترتیب میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ پردہ نشین خواتین کی بھاری تعداد وہاں موجود تھی۔ بڑے بڑے ہالوں کا فرش مکمل طور پر شطرنجیوں اور اس پر دودھیا سفید چاندنیوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ اور جگہ جگہ بیش قیمت کارچوبی مسندیں لگی تھیں۔ چاندی کے جالی دار بڑے بڑے پاندان مسندوں کے قریب رکھے تھے۔ گلاب پاشوں سے ساری ڈیوڑھی کو مہکا دیا گیا تھا سفید پوش مودب خدمت گار، رنگین نئی ساریوں میں کا ماتنیں (ہندو خادمائیں) اور مامائیں برسرکار تھیں۔ بیگمات کے ساتھ آنے والی مغلانیوں کے لیے بڑے دالان میں انتظام تھا۔ جہاں سے وہ مالکنوں کی ہر جنبش کی خبر رکھ رہی تھی۔

زنانخانے میں داخل ہونے کا راستہ پیچھے سے تھا۔ وہاں منشی رام چندر راؤ ڈھیر سی ریزگاری لیے کھڑے تھے۔ جو کرایے کی سواریاں آرہی تھیں ان کا کرایہ دے رہے تھے۔ وہاں ہر طرح کی سواریاں موجود تھیں کاریں۔ تانگے، جھٹکے، شکرامیں، اور نئے مروّجہ رکشے بھی۔

لیکن اس تمام شان و شوکت کے باوجود افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ ڈیوڑھی ایک ساہوکار کے پاس رہن تھی کیونکہ تمکین یار جنگ کو اپنی صاحبزادی کی شادی اپنی خاندانی آن بان سے کرنی تھی۔ اور آباؤ اجداد کا سرمایہ ان کے پاس اب یہی حویلی باقی تھی۔ یا پھر بھونگیر کا وہ چھوٹا سا گھر جو ان کے مقطعے میں بنا تھا یہ وہ حیدرآباد تھا جو رفتہ رفتہ پردے سے باہر نکل رہا تھا کئی کاریں پردوں سے آزاد تھیں پھر بھی رواج کے مطابق زنانہ اور مردانہ نشستیں الگ الگ تھیں۔ لوگوں کا پہناوا بھی مخلوط تھا مردانے میں سفید پتلون کٹ پاجاموں اور جامہ وار، کمخواب، وسٹنگ کی شیروانیوں کے ساتھ بہترین جان برٹن کے سلے ہوئے سوٹ بھی تھے جنھوں نے شیروانیاں پہنی تھیں۔ ان کے سروں پر دستاریں یا ترکی ٹوپیاں تھیں کچھ نوجوانوں نے آزاد روش اختیار کر کے سروں کو کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ ان کی طرف بزرگوں کی خشمگیں نظریں اٹھ رہی تھیں۔ مہمانوں میں ہندو اور مسلمان لباس اور اطوار کے لحاظ سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ان پر ہندو یا مسلمان کا لیبل لگانا ممکن نہ تھا۔ راجہ للت پرشاد تمکین یار جنگ کے لنگوٹیا یار تھے خود بھی کالی سرج کی شیروانی اور

ستار پہنے ہوئے تھے ان کی گہری نظر ہر طرف جا رہی تھی جہاں انتظام میں جھول آیا کہ انھوں نے اپنے منتظمین کو خشمناک نظروں سے دیکھا۔

باہر نوبت اور شہنائی والے اپنا تن من کا زور لگا رہے تھے۔ اور اندر میراثنوں کی بن آئی تھی ایک سے بڑھ کر ایک کلام پیش ہو رہا تھا۔ اور بیگمات امیر امرا کے شایان شان انھیں نواز رہی تھیں۔ بڑی سرکار کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایمن اس چکاچوند محفل میں نو وارد تھی لیکن اپنے حسن اور لباس کے اعتبار سے ان حسین لڑکیوں سے کم نہیں تھی جو خود اس محفل کی جان بنی ہوئی تھیں۔

میراثنیں گا رہی تھیں:

وہ جو مہمان بنے بیٹھے ہیں۔
میرا ایمان بنے بیٹھے ہیں۔
ان کی تعریف پوچھتے کیا ہو
حسن کی جان بنے بیٹھے ہیں

وہ رئیسوں کے آداب و اطوار سے واقف تھیں حضور نظام کے چھوٹے صاحبزادے بلند پایہ شاعر پرنس معظم جاہ شجیع کا کلام دل کا دامن تر کر رہا تھا۔

کل اسی گھر کے مکیں ہم تھے شجیعؔ
آج مہمان بنے بیٹھے ہیں

برات کے پہنچتے ہی چلمنوں اور جھروکوں میں خواتین کے جمگھٹ لگ گئے اور وہ غوغا ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ ایمن پھٹی پھٹی آنکھیں لیے بڑی سرکار کے ساتھ بیٹھی رہی اور بھی بہت سی بیگمات تھیں جو اپنی جگہ سے نہیں اٹھیں۔ انھیں دھکا پیل پسند نہیں تھی۔ بزرگ خواتین یوں بھی سنجیدگی سے اپنی مسندوں پر بیٹھی رہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں تھیں جو دریچوں میں جمگھٹے لگا رہی تھیں۔

"جاؤ ایمن بی بی۔ تم بھی جانا چاہو تو جاؤ، دیکھو۔" بڑی سرکار نے مسکرا کر ایمن سے کہا۔

ایمن اس ہنگامہ میں پھنسنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اب بڑی سرکار کی اجازت ملنے پر گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ بڑی دیر سے چاہ رہی تھی کہ چند سانسیں کھلی ہوا میں لے۔ وزنی دوپٹے سے اس کا بایاں کندھا دکھ رہا تھا۔ اور کنپٹیاں درد کے مارے پھٹی جا رہی تھیں۔ بہانہ ملتے ہی وہ اٹھی اور دوپٹا سنبھالتے ہوئے تازہ ہوا کی تلاش میں ہال سے باہر نکلی۔

جہاں وہ نکل آئی، وہ بھی ایک بند سی غلام گردش تھی جس کے دو تین دروازے اور دوسرے

کمروں میں کھلتے تھے ۔ ان میں صرف ایک دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلا تھا لیکن وہاں کے بھی سارے دریچے بند کر دیئے گئے تھے ۔کیونکہ وہاں ایک دن پہلے آئی ہوئی بری کے بڑے بڑے خوان رکھے تھے ـــ ڈھیروں خشک میوہ ، تازہ میوہ ، مصری کے فانوس ، مٹھائیاں ، بہرحال انواع واقسام کی چیزیں تھیں ۔ ایمن وہاں سے نکل آئی اور آگے بڑھ گئی ۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں تازہ ہوا کی تلاش میں وہ بھٹک نہ جائے ۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا ۔کیونکہ کاریڈور کے سرے پر پہنچ کر اس کا مقصد پورا نہ ہوتا تو وہ واپس لوٹ سکتی تھی ـــ کاریڈور کی لمبائی میں لکڑی کے پٹوں والی کھڑکیاں لگی تھیں ـــ ان سے در آئی ہوا دوسری طرف باغ کا پتا دیتی تھی ۔ وہ آگے بڑھی لیکن دوسرے کنارے دروازہ کسی باغ میں نہیں بلکہ ایک بہت ہی کشادہ برآمدے میں کھلتا تھا ۔جہاں لکڑی کے بڑے بڑے گملوں میں برسہا برس سے پنپے ہوئے چینی پام لگے تھے ۔ وہاں سارا ماحول رات کی رانی سے مہک رہا تھا ۔یہاں مکمل اندھیرا تھا ۔لیکن برآمدے اور اس کے ستونوں کا سنگ مرمر ایک مدھم سی سفیدی کا احساس دلاتا تھا ۔برآمدہ کافی بلندی پر تھا اور اس سے نیچے کو جاتی سیڑھیاں پائیں باغ میں ہی اترتی تھیں ۔برآمدے کو گھیرتی کنگر کافی چوڑی تھی ۔ ہر ستون کے آگے مختلف کروٹنوں کے گملوں کا جمگھٹا سا تھا ۔جن کے چکنے ، صحت مند پتے اپنے گوناگوں رنگ اندھیرے کو سونپے بے حس و حرکت تھے ۔

باہر باجے کا شور رک گیا تھا ـــ شاید نکاح پڑھایا جا رہا تھا ۔ایمن نے ہاتھ بڑھا کر ایک ستون کو چھوا ۔اس کی پسینا بھری گرم ہتھیلی کے متصل ستون کا لمس ٹھنڈا اور خوشگوار تھا ۔اس نے وہاں موجود ہلکی ہوا کے معطر جھونکوں کو سانس سے پی لینا چاہا ، اور وہیں ستون سے ٹیک لگا کر کنگر پر بیٹھ گئی ۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے قرار دے دیا تھا ۔لیکن طراوت کے ساتھ ہی اچانک اسے شدید احساس تنہائی نے آلیا ۔پھر بھی وہ تنہائی اس قیامت صغریٰ سے بہتر تھی جس سے وہ نکل آئی تھی ۔ یہ احساس تنہائی اس کے لیے نئی بات نہیں تھی ۔کبھی کبھی اچانک وہ اس جال میں گھر جاتی تھی ۔ اس نے اپنا سر ستون سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں ۔

پتا نہیں اور کتنی دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہتی کہ اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہے ـــ اس کے قریب ، بہت ہی قریب کوئی اور بھی آکھڑا ہوا تھا ، ایک ہاتھ ستون پر دھرے ، دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ تھامے ۔ وہ قدرے جھکا ہوا اسے بغور دیکھ رہا ۔ایمن گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس کی بیباکی میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ ایمن کی اس جنبش نے اسے اور بھی اس ہیولے کے قریب کر دیا ۔اندھیرے سے مانوس ایمن کی آنکھوں نے دیکھا کہ وہ چہرا جو اسے اپنی انتہا گہری اور پرکشش آنکھوں سے گھور رہا تھا بہت

وجیہہ تھا۔ لیکن اسے صرف وجیہہ کہہ دینا کافی نہیں تھا، کیونکہ ان گھنی پلکوں اور سگریٹ کے دھویں سے قدرے مچی ہوئی سیاہ آنکھوں کے درمیان ستواں ناک کے نیچے خمیدہ لب اور ٹھوڑی کا خم بتاتے تھے کہ وہ خود پسند بھی تھا، آدمی آستین کی سفاری شرٹ سے نکل کر ستون کو چھوتا ہوا ہاتھ اور مضبوط چوڑے شانے ایمن کے راستے میں ایسی دیوار بنے کھڑے تھے جسے پار کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر دیکھا۔ کمر کے پیچھے پتلون کی کریز دور تک چلی گئی تھی۔ جب ایمن نے آنکھیں اٹھائیں تو اس کی طرف دیکھنے کے لیے اسے اپنا سر بھی پیچھے جھکانا پڑا، کیونکہ وہ بمشکل اس کے کندھے تک پہنچ پاتی تھی

رفتہ رفتہ ایمن نے حواس یکجا کیے۔ اس شخص کی سیاہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کی سنہری آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی اسی کی طرح شور کا ستایا ہوا ہو جو شادی کے ہلڑ سے گھبرا کر باہر نکل آیا تھا۔ لیکن یقیناً اسے اس طرح ایمن کو محصور کر لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اور وہ بھی اس بالا دستی سے۔

ایمن کی آتش فشاں آنکھوں کا الٹا ہی اثر ہوا۔ ان ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ سے جھک آئے جس کی لہر اس کی سیاہ آنکھوں تک پہنچ گئی اس نے ہاتھ سے جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا۔

"خواب!"—— اس کی آواز مدھم لیکن موثر تھی۔ "میں اپنے خواب کی تعبیر یوں ڈھونڈا کرتا ہوں" اس نے کہا اور چشم زدن میں ایمن اس کی گرفت میں تھی۔ اس کے نروس کپکپاتے ہونٹوں کو دو اجنبی ہونٹوں نے اپنے بس میں کر لیا تھا—— ایمن اس کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی رہی لیکن وہ گرفت کا ہے کو تھی فولادی شکنجہ تھا، جو اسے اور زیادہ، اور زیادہ کسے جا رہا تھا۔ آخر اس کی آنکھوں سے غصے اور ہزیمت کے آنسو نکل آئے کسی جرنیل نواب زادے کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کی صنفی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ وہ کوئی خام آوارہ چھوکری نہیں تھی جو کسی بوالہوس رئیس زادے کی عارضی دلچسپی کا ساماں بن جاتی۔ وہ ایسے دس سڑک چھاپ شیدائیوں سے نپٹ سکتی تھی، لیکن یہ شب خون اچانک ہوا تھا جس کے لیے وہ ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھی۔

گرفت ڈھیلی ہوئی اور وہ تڑپ کر ان آہنی بانہوں سے نکل گئی۔ وہ آنکھیں اب بھی اسے فاتحانہ انداز سے دیکھ رہی تھیں اور وہ ہونٹ اب باقاعدہ مسکرا رہے تھے۔ جواب میں ایمن کا ہاتھ اٹھا اور ایک بھرپور تھپڑ اس نوجوان کے چہرے پر پڑا۔ اپنے حملے کا تاثر دیکھے بغیر وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور کلیاری میں داخل ہوتے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ تب اسے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنی حالت زار پر غور کرنے کا موقع ملا۔ وہ بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے

اس کے پاتو کی سکت سلب ہو رہی تھی وہ دہیں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپے بیٹھ گئی ۔ اس سے پہلے سیکڑوں مشتاق اور بوالہوس نظریں اسے چھوتی رہی تھیں، لیکن کسی شخص کی یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی پسندیدگی کا اس طرح عملی مظاہرہ کرے ۔ دفعتاً اس نے خود کو انتہائی بے سہارا پایا ۔ اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یہ دنیا ایک تنہا عورت کے لیے کس قدر اجنبی اور غیر محفوظ ہے ۔ اسے ایک مضبوط اجنبی ہاتھ اب بھی اپنی گردن پر اور انگلیاں بالوں میں سرسراتی محسوس ہو رہی تھیں ۔ دوسرے ہاتھ کا دباؤ اب بھی اس کے ہاتھوں پر موجود تھا، جو اس کی پیٹھ کے پیچھے جکڑ دیے گئے تھے ۔ اور ان گرم ہونٹوں کا لمس اب بھی اس کے کانپتے ہونٹوں پر مچل رہا تھا، جنھوں نے زندگی میں پہلی بار اسے غیر ہونٹوں سے آشنا کروایا تھا ۔ وہ لاانتہا ہی مدت تک وہاں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی ۔ بڑی سرکار کہیں اس کا انتظار نہ کر رہی ہوں ۔ اس نے ایک غیر مرئی کوشش سے اپنے حواس پر قابو پایا ۔ رومال سے اپنے ماتھے کا پسینا پونچھا۔ آنسو تو پہلے ہی خشک ہو گئے تھے کیونکہ وہ غصّے کے آنسو تھے، ہزیمت کے آنسو تھے، دکھ کے آنسو نہیں تھے ۔ دکھ کے آنسو دکھ بانٹ لیا کرتے ہیں، لیکن ان آنسوؤں نے تو اسے ششدر چھوڑ دیا تھا جاتے جاتے بھی اسے ایسا لگا جیسے استہزا سے مسکراتے ہوئے ہونٹ اور وہ گہری آنکھیں اب بھی اس کا پیچھا کر رہی ہوں، تمسخر اڑا رہی ہوں ۔ وہ اپنے کیے پر نادم ہرگز نہیں تھیں ۔

کون تھا وہ جس نے اس کی تنہائی کا فائدہ اٹھایا تھا؟

اس نے سوچا وہ ضرور بڑی سرکار سے اس واردات کی شکایت کرے گی ۔ لیکن کئی بار کوشش کرنے پر بھی اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا ۔ دوسرے، بڑی سرکار نے تو اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ اندھیری گلیاریوں میں بھٹکتی پھرے ۔ غلطی اسی کی تھی ۔ اسی نے اندھیروں کو ٹٹولا تھا۔

بڑی سرکار نے بیگم تمکین یار جنگ سے گلے مل کر شادی کی مبارک باد دی ان کی رشتہ داری تو تھی نہیں لیکن تمکین یار جنگ بڑے نواب صاحب کے معدودے چند عزیز دوستوں میں سے ایک تھے ۔ اس لیے بڑی سرکار نے چاندی کا بہت ہی خوب صورت ٹی سیٹ سلامی میں دیا جو وہ ساتھ لائی تھیں ۔ رات زیادہ ہو رہی تھی بیگم سے اجازت لے کر وہ لوگ واپس ہوئے ۔

علی الصبح انھیں ٹرین سے کرناٹک جانا تھا ۔ لیکن رات کے اندھیرے نے امین کو سونے نہیں دیا ۔

حیدر آباد سے دھارواڑ تک کے لمبے سفر نے بڑی سرکار کو تھکا دیا تھا ۔ امین کی رائے یہ تھی کہ کچھ دیر بڑی سرکار سرکٹ ہاؤس میں ستائیں اور پھر دھارواڑ سے ڈانڈیلی کا تیس میل کا سفر کار میں طے کیا جائے ۔ لیکن بڑی سرکار اس کے لیے تیار نہیں ہوئیں ۔

دھارواڑ۔ کرناٹک میں چھوٹی سی پرفضا جگہ ہے جسے Poor Man's Mahabaleshwar
کہا جاتا ہے۔ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن، سرسبز و شاداب پیڑوں کا مسکن، بلند و پست راستے
چھوٹا سا بازار جہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ لیکن جغرافیائی اعتبار سے چھوٹا ہونے کے باوجود، یہاں
کے لوگ علم کی روشنی سے مالا مال ہیں، جس کی شہادت ان کا علمی، ادبی اور ثقافتی ذوق دیتا ہے۔

اسٹیشن کے باہر ایک جیپ اور ایک اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ منشی صاحب ایک دن پہلے ہی پہنچ چکے
تھے۔ انھوں نے جیپ میں سامان رکھوا دیا، وہ اگلے وقتوں کے آدمی تھے۔ مالک کے مزاج کو خوب سمجھتے
تھے۔ بڑی سرکار اس عمر میں بھی چست تھیں اور یہی توقع اپنے متعلقین سے بھی رکھتی تھیں۔

دھارواڑ سے ڈانڈیلی تک ہموار سڑک تھی۔ فضا میں ایک فرحت بخش ٹھنڈک کا لمس تھا۔ امین نے
بڑی سرکار کے کندھوں پر شال اڑھا دی۔ جسے انھوں نے مسکرا کر قبول کر لیا، اور اپنی مخملی سیٹ میں آرام سے
بیٹھ گئیں۔

ڈانڈیلی دھارواڑ سے کچھ دور بانس اور ساگوان کے جنگلوں میں گھرا ایک خوشگوار مقام ہے —
بانس اور ساگوان ہی اس کا سرمایہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ مینگنیز فیلڈز کی دریافت کے بعد سے ڈانڈیلی کی اہمیت میں
اور بھی اضافہ ہو گیا ہے — ویسٹ کوسٹ پیپر ملز اور دوسری انڈسٹریوں کے باعث یہاں کی آبادی ملی جلی
ہے۔ ہندستان کے ہر مقام کے باشندے یہاں نظر آتے ہیں۔

ڈانڈیلی پہنچتے پہنچتے، ویسٹ کوسٹ پیپر ملز کے بڑے گیٹ کے بعد ہی راستہ ایک دم ڈھلوان ہو گیا
تھا، جس کی وجہ سے ایک وادی سی بن گئی تھی۔ بائیں طرف مڑ کر اسٹیشن ویگن ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہو کر
سرخ رنگ کی بجری سے گزرتے ہوئے ایک خوشنما بنگلے کے پورٹیکو میں ٹھہر گئی۔

مکمل خاموشی کو جھاڑیوں میں جھینگروں کی چرب چرب توڑ رہی تھی۔ باقی ایک وشال سناٹا تھا۔ کافی
بڑے سرسبز لان کے کناروں پر گلاب کی کیاریوں میں مختلف رنگوں کے گلاب سوئے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے
تنوں پر پوتھاس کی بیلیں اور پام کے پنکھے نما پتے اپنے چنور پھیلائے ہوئے تھے۔ فضا میں ایک مخصوص مہک
تھی جو دھارواڑ چھوڑنے کے کچھ دیر بعد ہی محیط ہو گئی تھی کیونکہ وہیں سے بانس اور ساگوان کے جنگل شروع
ہو جاتے تھے۔ بانس اور ساگوان ہی کی بدولت ٹمبر فیکٹریز اور پیپر ملز قائم کی گئی ہیں، جن میں ہزاروں لوگ
کام کرتے ہیں۔

ہر سال یہاں بانس اور ساگوان کے جنگلوں کا نیلام ہوتا ہے اور بڑے بڑے کنٹریکٹر قدرت کا یہ سرمایہ
بٹورے جاتے ہیں۔

بڑے نواب صاحب نثارالدولہ نے بھی ڈانڈیلی میں اپنی ٹمبر فیکٹری قائم کردی تھی، لیکن اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ یہ ان کے جاں نثار نوکر ہی تھے جو جیسے تیسے اسے چالو رکھ رہے تھے۔ وہ ٹمبر فیکٹری کا ہے کو تھی بس ایک آرائش تھی۔ زیادہ آمدنی تو بس جنگل کے ہراج (نیلام) ہی سے آتی، جو نواب صاحب کی ملکیت تھا ــــــــ وہ ایک دو بار ہی ڈانڈیلی آئے ہوں گے۔ وہ شہری تہذیب یافتہ زندگی اور نفیس محلوں کے عادی تھے۔ شعر و ادب کا بہترین ذوق رکھتے تھے۔ یہاں ڈانڈیلی میں کارخانے کی مشینوں میں زنگ لگ رہا تھا۔ لیکن ان سے کچھ کہنے کی مجال کس کو تھی؟ ان کا غصہ ضرب المثل تھا۔ اب کچھ دنوں سے ان کی مشینوں نے انگڑائی لی تھی تو ساتھ ہی کچھ مسائل بھی پیدا ہو گئے تھے۔ بڑی سرکار کے صاحبزادے آزر نواب نے ہی مشینوں کو گدگدایا تھا اور فیکٹری کے بندوبست میں مکمل دلچسپی لے رہے تھے اور اسی سلسلے میں وہ بیرون ملک گئے ہوئے تھے کہ فیکٹری میں ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا جنھیں سلجھانے کے لیے بڑی سرکار کو خود یہاں آنا پڑا۔

اس لیے سفر کی تکان بڑی سرکار کے چہرے سے ظاہر تھی ــ دھیرے دھیرے سیڑھیاں پار کر کے وہ ایمن کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوئیں۔ بنگلہ نسبتاً نیا تعمیر شدہ تھا، جو ایک گیسٹ ہاؤس کے مقصد کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ نہایت آرام دہ اور نئے طرز کا ــ اس سے متعلق گیلری دونوں جانب رہائش کے کمروں کے ساتھ پھیلی چلی گئی تھی۔ برآمدے سے اندر داخل ہوتے ہی بڑا سا لاؤنج تھا جس سے متصل ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا، لاؤنج کی دونوں جانب چار بیڈ روم بنے تھے۔ لاؤنج کی آرائش سادہ لیکن بہت آرام دہ تھی۔ دیواروں پر ایک بڑے سے میورل کے علاوہ ایک دو پینٹنگس لگی تھیں صدر دروازے کے عین اوپر بڑے نواب صاحب کی تصویر تھی جو مصوری کا اعلا نمونہ تھی۔

بڑی سرکار کے غسل خانے میں شمشاد نے گیزر چالو کر دیا تھا۔

"ایمن بی بی تم بھی اپنے کمرے میں جاؤ۔ آدھے گھنٹے بعد میں ڈائننگ ہال میں آؤں گی" بڑی سرکار نے کہا۔

اس آدھے گھنٹے میں ایمن کو بھی نہا کر کھانے کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں بڑی سرکار کے کس بل کو سراہا۔ اور مقابل والے کمرے میں چلی گئی جہاں پہلے ہی اس کا سامان رکھ دیا گیا تھا۔

فاریسٹ گیسٹ ہاؤس کے کمرے بہت ہی سادہ لیکن صاف ستھرے اور ضروری سامان سے مزین تھے۔ ایمن نے اپنا مختصر سا سامان ٹھکانے سے رکھا مصوری کا سامان جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی، اس نے کشادہ الماری کے وارڈروب میں پھینکا اور جلدی جلدی نہا کر تیار ہو گئی۔

کھانا اچھا اور مشّاق ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔

بڑی سرکار جب سونے کے لیے لیٹ گئیں تو امین بھی شمشاد کو وہیں چھوڑ کر آہستہ سے دروازہ بند کرکے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے وہ ایک منٹ کو بڑے نواب صاحب کی اس بہت بڑی رنگین تصویر کے نیچے رک گئی جو سنہری فریم میں جڑی داخلے کے دروازے پر لگی تھی۔ امین سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنے بدشکل ہوں گے۔ بڑی سرکار کا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ لیکن اس زمانے میں شکلیں دیکھ کر جوڑ تھوڑے ہی ملائے جاتے۔ نام اور رتبہ دیکھا جاتا تھا۔ بڑے نواب صاحب میں کچھ خوبیاں ایسی ضرور رہوں گی کہ بڑی سرکار نے ہنسی خوشی ان کے ساتھ زندگی گزار دی۔ امین کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح سرسبز اور سنہری تھی۔ نئی جگہ یوں بھی آنکھ جلدی کھل جاتی ہے۔ اور امین تو صبح جلدی اٹھنے کی عادی ہی تھی۔ خانساماں نے صبح ۶ بجے اسے بیڈ ٹی دے دی تھی۔ باہر کرناٹک کی صبح بہت سلونی تھی۔ وہ اپنا ہاؤس کوٹ پہنے باہر ہی کرسی پر چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے بیٹھ گئی۔ فضا پر ایک سحر سا چھا رہا تھا، جو کچھ وہ رات کو نہیں دیکھ پائی تھی، اب سویرے گویا بالکل اس کی ہتھیلی میں تھا۔ کیاریوں میں کھلے گلابوں نے اندھیری رات سے اپنے رنگ واپس لے لیے تھے۔ ان کی دبیز مخملی پنکھڑیوں پر شبنمی قطرے دمک رہے تھے۔ سن کیسرا اور یوکلپٹس کے طویل قامت پیڑوں تک پہنچ کر لان ختم ہو جاتا تھا۔ لان کے احاطے میں ایک رنگ برنگ جھولا اور اس پر لگا ہوا رنگ برنگا سائبان وہاں اگنے والے خوش رنگ پھولوں کا ہی ایک حصّہ معلوم ہوتا تھا۔

امین نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور سیڑھیوں سے اترنے لگی۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترنے کے بعد سرخ رنگ کی بجری والی روش دائیں ہاتھ کو مڑ جاتی تھی جس کے دوسری طرف کروٹن اور کیکٹس کی ملی جلی 'راکری' تھی جو لان تک جا ملتی تھی۔ لان میں دائیں طرف لکڑی کا ایک چھوٹا سا گیٹ نظر آتا تھا۔ جس چیز نے اس کے دل کو خوشی سے گدگدایا، وہ نہایت ہی خاموش اور شاہانہ انداز سے بہتی ہوئی ندی تھی۔ گیٹ اور لان کے بارڈر ہی سے جہاں سن کیسرا اور یوکلپٹس کے پیڑ تھے، پتھریلا ڈھلان شروع ہو گیا تھا، جن کے نشیب میں 'کالی ندی' کا چوڑا پاٹ تھا۔ سبک روی سے بہتی ہوئی یہ ندی ڈانڈیلی کی شہ رگ ہے۔ اس کے ذریعے بھی جنگلوں سے کاٹی ہوئی لکڑی دور تک پہنچا دی جاتی ہے۔ اس وقت بھی چند کٹے ہوئے ساگوان کے تنے شانِ استغنا سے اس میں بہے چلے جا رہے تھے ــــ ندی کے دوسرے کنارے پر بھی گھنے ساگوان کے درختوں کے درمیان کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے مکانوں کی سرخ چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ جہاں چٹانیں پانی میں کچھ دور تک چلی گئی تھیں۔ ایک رافٹ نظر آ رہا تھا جو ندی میں آمد و رفت کا ذریعہ تھا اس کے پاس ہی دو خوش رنگ چھوٹی کشتیاں جٹی سے بندھی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس کے پاس ندی نے جھیل کی شکل اختیار کی ہوئی تھی جس میں زمرّدی پیڑوں اور سرخ

چھتوں کا عکس تھرتھرا رہا تھا۔ صبح کے سورج کا ہلکا سا سنہرا پن بھی اس میں جھلکنے لگا تھا۔ وہ نظارہ بہت کیف آگیں تھا۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے موقع بھی آتے ہیں جب مٹھی میں کسی خزانے کا احساس نہیں ہوتا پھر بھی دل مالا مال ہو جاتا ہے۔ یہی حالت ایمن کی ہوئی۔ وہ قدرت کے اس دل آویز حسن کو نذرانہ عقیدت پیش کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان سب رنگوں کو اپنے کینوس میں مقید کر لینا چاہتی تھی لیکن اب وقت نہیں تھا۔ اس کے وقت پر کسی اور کا حق تھا۔ دوپہر کو جب بڑی سرکار آرام کر رہی ہوں گی تب وہ اپنا کینوس اور رنگ لے کر نکل آئے گی۔ اس نے اپنی زندگی کے تیئس سال اپنے باپ کے ساتھ اور پھر اکیلی ہی مردانہ وار کشمکش کے گزار دیے تھے۔ زندگی کا ہر روشن دن اس کے لیے ایک چیلنج بنے نمودار ہوتا تھا جو اسے آنے والے کل کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ اب ان فرصت کے لمحوں میں قدرت کا وہ ملکوتی حسن اور وہ خوشنما بنگلہ جس کے دریچوں کے شیشے چڑھتے سورج کی روشنی میں گلابی ہو رہے تھے، ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر اس کے ذہن میں ابھرے آج یہ سب کچھ حاصل ہے، کل کیا ہوگا؟ —— انھوں نے پوچھا۔

یہ ان دیکھا کل انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے یہ زندگی کی چادر کی ایسی شکن ہے جسے سیدھا کرتے کرتے انسان چادر ہی سے گزر جاتا ہے۔ یہ یاجوج ماجوج کی وہ دیوار ہے جسے چاٹتے چاٹتے اس کی زبان خاردار اور زخمی ہو جاتی ہے، لیکن دیوار بدستور قائم رہتی ہے۔

حویلی میں آئے ہوئے اسے کافی وقت گزر چکا تھا، لیکن وہاں کبھی وہ احساس وابستگی نہیں جاگا تھا جو یہاں ڈانڈیلی کے خوشنما بنگلے اور اس کے سحر آگیں ماحول نے جگایا تھا۔ کیا اس کا بھی کوئی گھر ہوگا؟ کوئی زندگی کا ساتھی ہوگا؟ جسے وہ اپنا سب کچھ سونپ کر بھی ایسا محسوس کرے گی جیسے اس نے سب کچھ پالیا ہو۔ ؟ کیا اس کی طرف اٹھتی ہوئی تعریفی نظروں میں کوئی نظر ایسی بھی ہوگی جو اس کے لیے اور صرف اس کے لیے ہی ہو —— اگر ہوگی تو اس کا مالک کیسا ہوگا؟ — اچانک اس کے تخیل میں دو گہری، سیاہ آنکھیں، مضبوط شانے اور سرکش ہاتھ جاگے، جنھوں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ گھنے بالوں والا حسین سر اور تنی ہوئی گردن جو اس کی طرف جھکتی ہی جا رہی تھی اور وہ مغرور مسکراتے ہونٹ ۔ اسے ایک جھرجھری سی آگئی — یہ کیا خرافات سوچنے لگی تھی وہ بیشک ان ہونٹوں نے اسے زندگی کا پہلا حسین تجربہ دیا تھا، لیکن اس میں ایک تلخ حقیقت کا امتزاج بھی تو تھا جو ایمن کی خودداری کو ٹھیس پہنچا گیا تھا۔ پتا نہیں کون تھا وہ، کہاں سے آیا تھا؟ لیکن اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اس حویلی کے لیے نیا نہیں تھا، وہ سنگ مرمر کا برآمدہ اس کے قدموں کے لیے جانا پہچانا تھا۔ کیا وہ تمکین یار جنگ کے صاحبزادے ہی تھے؟ ۔ وہ بگڑے ہوئے نواب زادوں کی سہل کرداری، کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی اور اس روز خود ہی اس کا شکار ہو گئی تھی ۔ اسے بھرم تھا کہ

دنیا کا کوئی مرد اس کی مرضی کے خلاف اس کا استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی انا کی یہ پہلی شکست اس کے قدموں کو ڈگمگا گئی تھی۔ اسے اب زیادہ چوکنا رہنا ہوگا۔ وہ کسی خودپسند امیرزادے کی عارضی دلبستگی کا سامان بننے کے لیے تیار نہیں تھی، خواہ وہ کتنا ہی ہینڈسم کیوں نہ ہو۔

وہ جلدی جلدی سیڑھیوں سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئی۔ سامنے ہی ہیٹ ہینگ کے شیشے میں اس کی نظر خود سے دوچار ہوئی۔ اپنے گالوں میں اتر آنے والی شفق کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی

ناشتے کے بعد بڑی سرکار نے ٹمبر فیکٹری کے منیجر بھسنور مٹھ کو طلب کیا۔ وہ پستہ قد، سیاہ فام شخص تھے۔ کم گو اور سلجھے ہوئے مزاج کے، لیکن اس بار فیکٹری کی گتھی نے انھیں بوکھلا دیا تھا۔ فیکٹری کے مزدوروں کو کام چاہیے تھا، لیکن فیکٹری میں ٹمبر کی سپلائی کا کام رکا رہنے کی وجہ سے مشینیں بند تھیں۔ ٹیک پلائی کے باہر بھجوانے والے کریٹ تیار تھے لیکن ان کی نکاسی نہیں ہو رہی تھی۔ نتیجتاً منیجر نے لیبر میں تخفیف کر دی تھی تقریباً دو سو مزدور اور ان کے متعلقین کے پیٹ کا سوال تھا۔ اب وہ مشتعل ہو رہے تھے۔

"یہ برا ہوا"۔ بڑی سرکار نے کہا "کیا اس کے سوائے کوئی اور صورت نہیں تھی؟"

"چھوٹے سرکار کو میں نے اس بارے میں چٹھیاں ڈالیں تھیں"۔ بھسنور مٹھ یا تو کنڑی بول سکتے تھے یا انگریزی۔ انھوں نے انگریزی میں کہا۔

"ہو سکتا ہے، آپ کے خطوط انھیں نہ ملے ہوں۔ کیونکہ کچھ دن پہلے آزر نواب نے انگلستان سے مجھے لکھا تھا کہ بزنس کے سلسلے میں ان کا جرمنی جانا ضروری ہوگیا ہے اور شاید وہ مہینا بھر بعد ہی لوٹ سکیں گے۔"

'بزنس کے سلسلے میں یا رنگ رلیوں کے لیے؟' امین نے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے سوچا۔ تمکین یار جنگ کی حویلی کے حادثے کے بعد اس کی رائے نواب زادوں کے بارے میں اور بھی خراب ہوگئی تھی۔

اچانک باہر کچھ غل ہوا۔ نعرے لگ رہے تھے۔ منیجر کو کوسا جا رہا تھا۔

"یہ وہی مزدور ہیں جن کو نکال دیا گیا ہے"۔ بھسنور مٹھ نے کچھ نروس ہو کر کہا "آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

بڑی سرکار کچھ دیر سوچتی رہیں، پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چلو" انھوں نے اپنی آپا شاہی جوتیوں میں پاؤں ڈالتے ہوئے دوپٹا سنبھالا۔

بھسنور مٹھ کچھ جھجکے "ہڑتالی مشتعل بھی ہو سکتے ہیں۔ میں چھوٹے سرکار کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"ہمارے لیے آپ فکر مت کیجیے منیجر صاحب ۔ انھیں مشتعل ہونے ہی کیوں دیا جائے۔"
بھسنور مٹھ بڑی سرکار کا مطلب سمجھ کر اندر جانے لگے "میں پولیس کو فون کر دوں؟"
"اس کی ضرورت نہیں"۔ بڑی سرکار بولیں۔ "آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا۔"
اس وقت تک ہڑتالی سیڑھیوں کے آس پاس آگئے تھے۔
"نانگے کیلسا بیکو ۔ نانگے کیلسا بیکو"۔ انھوں نے کنڑی زبان میں نعرے لگائے۔
"یہ کہہ رہے ہیں ہمیں کام چاہیے"۔ بھسنور مٹھ نے ترجمہ کیا۔
کالی جھنڈیاں لاؤنج سے بھی نظر آنے لگی تھیں، لیکن جیسے ہی بڑی سرکار برآمدے میں نکل آئیں، وہ سب خاموش ہو گئے۔
وہ دھیرے دھیرے چل کر سیڑھیوں تک پہنچ گئیں ۔ مزدور کچھ ششدر کچھ غصے سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ وہ نوجوان اور محنت کش چہرے، جن کو کل کی فکر تھی، وہ کھردرے ہاتھ جنھوں نے کبھی مخمل کو چھوا بھی نہیں تھا، وہ انگلیاں جو مرغن غذاؤں سے کبھی تر نہیں ہوئی تھیں ۔ ان بچاروں کو دو وقت جو کی تلاش تھی۔
بڑی سرکار نرمی سے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھتی رہیں ۔ وہ اس پاکیزہ مسکراہٹ کے لیے بالکل تیار نہیں تھے ۔ کچھ پیروں نے پینترے بدلے کچھ آنکھوں نے سوال کیا کہ اس ممتا بھری مسکراہٹ کے کیا معنی ہیں؟
"میرا استقبال میرے بچے اس طرح کریں گے میں نہیں جانتی تھی"۔ بڑی سرکار بولیں۔ "میں تو تم سے ملنے آئی تھی، تمھاری خفگی کا سبب جاننے آئی تھی۔"
بھسنور مٹھ نے ان کے الفاظ کا کنڑی میں ترجمہ کیا۔
"ہمیں کام سے الگ کر دیا گیا ہے"۔ ہڑتالیوں کا لیڈر آگے بڑھ کر بولا۔
"کیلسا، کیلسا!" مجمع کورس میں بولا ("کام، کام!")
ایمن نے حالات کے تناؤ کو محسوس کر کے سانس روک لی تھی۔
"تمھیں کام کی ضرورت نہیں، بلکہ کام کو تمھاری ضرورت ہے"۔ بڑی سرکار بولیں۔ "منیجر نے حالات کی وجہ سے جو کچھ کیا اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ خود تمھاری سفارش مجھ سے کر رہے تھے"۔ بڑی سرکار نے صاف بھسنور مٹھ کو بچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ آزر نواب کی غیر حاضری میں اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

"آزر نواب کب آئیں گے۔ ہم اس وقت تک بھوکے نہیں رہ سکتے!"
"آزر نواب کو بزنس کے ضروری کام کے سلسلے میں جرمنی جانا پڑا ہے۔ وہ ابھی نہیں آئیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بھوکے رہو گے۔ تم سب فوراً کام پر چلے جاؤ۔"
بھسنور مٹھ بے چین ہو گئے۔ انھوں نے مدھم سروں میں بڑی سرکار سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ان سے بہت اونچی آواز مزدوروں کی تھی۔ "فیکٹری میں ہمارے لیے کام نہیں ہے۔"
"آزر نواب نئی مشینیں خریدنے گئے ہیں۔ خدا نے مجھے اتنا دیا ہے کہ اپنے بچوں کو کچھ دن بٹھا کر بھی کھلا سکتی ہوں۔ نئی مشینیں آنے سے فیکٹری میں پہلے سے بھی زیادہ کام بڑھ جائے گا۔"
ہڑتالی بالکل ساکت تھے۔
آخر اُن میں سے ایک شخص بڑھا۔ اس نے سفید گلاب کا ایک پھول توڑا اور لاکر اسے بڑی سرکار کے قدموں میں رکھ کر "ہو دو، نیو دنتا ادا" (ہاں، تم ہماری ماں ہو) اس کے بعد مظاہرہ کرنے والے منتشر ہو گئے۔
"میڈم بڑی سرکار"، بھسنور مٹھ نے ہڑتالیوں کے جانے کے کہا۔ "مزدوروں کی تنخواہ کی رقم بہت زیادہ ہو جائے گی، شاید چھوٹے سرکار پسند نہ کریں گے۔"
بڑی سرکار نے منہ سے کچھ نہیں کہا، صرف انھیں دیکھ کر خاموش ہو رہیں۔
"جنگل کا نیلام کب ہے؟" انھوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔
"پرسوں سویرے"۔ بھسنو میٹھ بولے۔
"ہم سمجھیں گے اس بار نیلام میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایمن بی بی۔" انھوں نے بھسنور مٹھ کے جانے کے بعد کہا "تم چاہو تو باہر گھوم آنا۔ آج ہم بہت تھک گئے ہیں، آرام کریں گے۔ ہاں ہمارے لیے بازار سے Smelling Salt لے آنا۔ ہم سے یہاں کی ٹمبر کی بو برداشت نہیں ہوتی۔"
واقعی فضا میں ایک مخصوص سی مہک رچی ہوئی تھی۔
گیارہ بج رہے تھے۔ دھارواڑ سے تازہ اخبار اور ڈاک آئی تھی۔ ڈاک میں بس ایک ہی لفافہ تھا، جس میں ٹیلی گرام بند تھا۔۔۔ وہ بڑی سرکار کی سالگرہ پر مبارکباد کا ٹیلی گرام تھا جو جرمنی سے آزر نواب نے بھجوایا تھا۔ وہ اسی روز سویرے صبح حیدرآباد پہنچا تھا جس روز سویرے تڑکے انھوں نے ٹرین پکڑی تھی دفتر والوں نے فوراً اسے ڈانڈیلی بھجوا دیا تھا۔
بڑی سرکار کے لبوں پر تار دیکھ کر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ دیر ایمن انھیں اخبار پڑھ کر سناتی رہی۔

پھر بڑی سرکار نے تسنیم پاشا کو ایک خط لکھوایا۔ منشی صاحب کو کچھ ہدایتیں دیں۔ لنچ کے بعد تو بڑی سرکار آرام کرنے لیٹ گئیں اور امین اپنے کمرے میں چلی آئی۔

نواب نثار الدولہ صرف بدشکل ہی نہیں تھے بلکہ بڑے غصیلے بھی تھے۔ ان کی جنون کا آتار چڑھاؤ ہی ماتحتوں کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ شعر و سخن کا دلدادہ تھے۔ گو انھوں نے زندگی میں کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن مجروں کے شوقین تھے۔ رقص و سرور کی ایسی زبردست محفلیں حویلی "فرمان" میں منعقد کی جاتیں کہ آج بھی گھنگھروں کی چھنک بڑے ہال کے فرش کے سینے میں تڑپتی ہوگی۔ نواب نثار الدولہ لڑکپن ہی سے غیر ذمہ دار تھے۔ معاملہ فہمی انھیں چھو کر نہیں گئی تھی کھو کھلے خوشامدی اور موقع پرست لوگ انھیں گھیرے رہتے تھے ان کو صحیح طور پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔

پتا نہیں خدا نے یہ ظلم کیسے روا رکھا کہ بڑی سرکار سے ان کی شادی ہوگئی دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا جبکہ بڑی سرکار کے والد نے بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی/موجودہ حویلی کی انمول لائبریری ان ہی کی یادگار تھی جو ان کے انتقال کے بعد بڑی سرکار اپنے ہاں سے آئی تھیں۔ نواب نثار الدولہ بڑی سرکار کی قدر نہ کرسکے۔ انھیں بڑی سرکار کا علمی ذوق ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ شاید یہ ان کا احساس کمتری تھا کہ وہ بڑی سرکار کا دل، کھانے کے نئے نئے طریقے اختیار کرتے تھے۔ لیکن کسی نے کبھی بڑی سرکار سے کوئی حرف شکایت نہیں سنا۔ وہ خندہ پیشانی سے سب کچھ سہتی رہیں۔

نواب صاحب کی مصروفیات کی وجہ سے، آزر نواب اکلوتے صاحبزادے ہونے کے باوجود کبھی اپنے والد سے قریب نہیں ہوسکے، اور عمر کے ساتھ ان کے مابین یہ خلیج بڑھتی۔

بڑی سرکار اپنے خاموش اور سلجھے ہوتے انداز میں اپنے صاحبزادے پر جان چھڑکتی تھیں۔ انھوں نے خود ہر ستم برداشت کیا اور اس وقت کی منتظر رہیں جب آزر نواب نے لڑکپن کی حدوں میں قدم رکھا، تب اچانک بڑی سرکار کی ساری صلاحیتیں ابھر آئیں۔ آزر نواب کو انھوں نے بڑے نواب صاحب کے نقش قدم پر کبھی نہ چلنے دیا۔ آزر نواب نے ہوش سنبھالا تو اس ربط سے محروم رہے جو ایک شفیق باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے۔ ان کے لڑکپن کے دور میں والد کا انتقال ہوگیا، تب سارا بار بڑی سرکار کے کندھوں پر آپڑا کیونکہ وقار جنگ تو پہلے ہی جایداد جاگیر کے بکھیڑوں سے دست بردار ہوچکے تھے۔ اس شرط پر کہ تاحیات ان کے اخراجات کے ذمہ دار ان کے بڑے بھائی اور پھر ان کے وارث رہیں گے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ انھوں نے بھائی کی موت پر بھی مالی بکھیڑوں میں دخل نہیں دیا۔ اس وقت حالانکہ آزر نواب کمسن تھے اور بڑی سرکار انھیں ابھی جایداد کے جھمیلوں میں پھنسانا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ آزر نواب پہلے زیورِ تعلیم سے مالا مال ہو جائیں ___ اگر

اس وقت بڑی سرکار نے کمر ہمت نہ باندھی ہوتی تو جاگیر کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ انھوں نے صاجزادے کو اعلا تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھجوا دیا اور خود جاگیر کا کام سنبھالتی رہیں۔ ایسے میں پرانے نمک خواروں نے بہت ان کا ساتھ دیا۔ منشی صاحب کی اسی لیے وہ بہت قدر کرتی تھیں۔

آزر نواب جب اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹے تو اس قابل ہو گئے تھے کہ خاندانی امارت کا بوجھ سنبھال سکیں وہ عادات واطوار میں اپنے والد سے بہت مختلف تھے ـــــ وہ نہ شعر و سخن کے دلدادہ تھے، نہ ان رنگین محفلوں کے رسیا جو رئیسوں اور نوابوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں انھوں نے اپنے لیے مطالعہ کے علاوہ شکار اور شہ سواری کے میدان چنے تھے۔ وہ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ لیکن ان کی کم گوئی ان کی بدنامی کا باعث ہونے لگی تھی ـــ ان کے ہم عصر انھیں مغرور سمجھتے تھے۔ آزادی کے بعد جب بزنس کی طرف ان کا رجحان ہوا تو ان کی پیٹھ پیچھے ان پر خوب پھبتیاں کسی گئیں لیکن ساتھ ہی لوگ ان کی دوراندیشی کا طوعاً و کرہاً اقرار بھی کرتے تھے حقیقت یہ تھی کہ جیسا باد بدلنے سے سماجی ڈھانچے میں ایک بوکھلاہٹ نمایاں ہو چلی تھی۔ جس کا منہ جدھر اٹھتا، چلا جا رہا تھا۔ اس افراتفری میں "کیسے کیسے، ایسے ویسے اور ایسے ویسے، کیسے کیسے" ہو جاتے ہیں۔ جاگیروں اور جایدادوں کا سورج زوال پر تھا۔ بورژوائی طبقے کا توڑ کرنے کے لیے حکومت نئے نئے قدم اٹھا رہی تھی۔ ایسے میں صدیوں کی خاندانی روایات کو نئے سانچے میں ڈھالنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

حیدرآباد کے رئیس خاندانوں کے اور بھی بہت سے لڑکے انگلستان تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے، لیکن آزر نواب نے بدیس جا کر عیاشی اور بورژوائی نوجوانوں کی طرح اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ وہ وہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آئے تھے۔ اور جو کچھ ادھورا چھوڑ کر آئے تھے اسے حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھار انھیں وطن سے باہر جانا پڑتا تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم حاصل کرنے کے لیے ایک چست ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ آزر نواب کے پاس تھا۔

آزر نواب عادت واطوار میں اپنے والد سے اتنے مختلف تھے کہ امین سوچا کرتی، کیا شباہت میں بھی وہ مختلف ہوں گے؟ آتے جاتے بڑے نواب صاحب کی تصویر بڑے ہال میں امین کو گھورا کرتی۔

"کیا آزر نواب بھی ایسے ہی ہیں؟" ایک بار اس نے بشارت نواب سے پوچھا تھا۔
"ان کے گل مچھے نہیں ہیں، لیکن ان کی کسر انھوں نے وکٹورین عہد کا فیشن اپنا کر پوری کر دی ہے۔
بشارت نواب نے کہا تھا۔ "زلفیں گردن تک رکھتے ہیں لیکن غصے میں ماشاء اللہ جناب عالی سے دو گز آگے ہی ہیں۔"

یہ سن کر امین سوچ میں پڑ گئی تھی ـــــ اس روز ڈانڈیلی میں بھی جب وہ باہر نکلی تو بڑے نواب صاحب

کی تصویر دیکھ کر دل ہی دل میں اس نے دعا کی کہ کاش آزر نواب اسی طرح اپنی واپسی کی گھڑی کو آگے بڑھاتے جائیں ـــ بشارت نواب کی طرح وہ بھی ان سے خائف ہو رہی تھی۔

آسمان پر سورج بادلوں سے چھپنا چھپتی کر رہا تھا۔ لیکن دھوپ میں تمازت بالکل نہیں تھی ـــ رات کو بارش ہوئی تھی جس نے ہر شے کو نکھار دیا تھا۔ سیڑھیوں سے اتر کر پورٹیکو کی بائیں جانب وہ بجری پر ہولی ـــ بنگلے کا عقبی حصہ اس نے دیکھا نہیں تھا ـــ دراصل اسے عقبی کہنا غلط تھا کیونکہ یہی حصہ باہر نکلنے والے گیٹ کے سامنے پڑتا تھا۔ لمبوترے برآمدے میں کھلنے والے دو دروازے تھے، جن پر دوسرے اور دروازوں کی طرح مچھروں سے بچاؤ کے لیے جالیاں لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ بنگلہ مثلث نما تھا، جس کے تینوں حصے مشابہ تھے۔ کچھ دور باغ کے ایک سرے پر سرونٹ کوارٹرز بنے تھے۔ ان سے متصل اصطبل میں بہت ہی بانکا سیاہ مشکی گھوڑا بندھا تھا۔ سائیس اس کی مالش کر رہا تھا اور سردی میں اس گھوڑے کی دم بار بار ہوا میں لہرا رہی تھی۔ بہت ہی جی دار گھوڑا تھا وہ۔

آزر نواب گھوڑوں کے شوقین معلوم ہوتے تھے۔ یہ گھوڑا ان کے سوا اور کس کا ہو سکتا تھا؟

گیٹ سے نکل کر ایمن بائیں طرف مڑ گئی کیونکہ سیدھی کچی سڑک فارسٹ آفیسر کے بنگلے اور مینگنیز بلڈرز کی طرف جاتی تھی، جو وہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھی ـ اس طرف ایک چڑیا گھر بھی بنایا جا رہا تھا۔ بائیں طرف جاتی ہوئی سڑک پر چھوٹا سا بازار، کلیسا اور چند چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ یہ سڑک مسلسل اوپر کی طرف چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جس کے بہت آگے جنگل اور پہاڑوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ وہاں پہاڑ کی کافی بلندی پر گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس تھا۔ گیسٹ ہاؤس اور اس کے سامنے کھڑی جیپ اس بلندی پر کھلونے جیسی نظر آ رہی تھی۔

چھوٹے سے صاف ستھرے کلیسا پر لگی ہوئی صلیب اس لافانی قربانی کی یاد دلا رہی تھی جو سیکڑوں سال پہلے ایک انسان نے نوع انسانی کے لیے دی تھی۔ تب سے یہ سلسلہ جاری ہے ناکردہ گناہی کا، دل کی تاریکی اور ظرف کی کوتاہی کا، تب سے اب تک نہ جانے کتنے مسیح دار پر چڑھ گئے۔ لیکن داغ انسانیت ہٹتا ہی نہیں زخم آدم مندمل ہوتا ہی نہیں۔

کیمسٹ کے پاس سے Smelling salts لے کر ایمن دکان سے نکل آئی اور آگے بڑھی۔

جب وہ گھر سے نکلی تھی تو سورج اور بادلوں میں تال میل ہو رہا تھا۔ اب سیاہ بادلوں سے اندھیرا سا رہنے لگا تھا۔ ڈانڈیلی میں یوں بھی بارش اچانک آتی ہے۔ ایمن کو پل پار کرنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا جو کالی ندی

کے چوڑے پاٹ پر بنا تھا۔ پل کے دوسرے کنارے ایک بڑے سیاہ بورڈ پہ لکھا تھا — Dandeli Sanctuary اور اس سے آگے گھنا جنگل تھا۔ امین نے ڈانڈیلی سینکچویری کا نام پہلے نہیں سنا تھا، حالانکہ وہ شروع ہی سے کرناٹک میں رہتی آرہی تھی۔ اس کے والد بھی اپنی جوانی کے قصے اسے سناتے تھے۔ جب انھیں شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا اور وہ اپنے ساتھیوں میں اچھے نشانہ باز مانے جاتے تھے۔ اسی دوران وہ اسے مختلف جانوروں کے عادات وخصائل اور ان کی طرزِ زندگی کے بارے میں بھی بتاتے تھے۔ اسی لیے اب سینکچویری کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ کر امین کا دل مچل گیا کہ اس میں داخل ہو اور قدرت کے تخلیق کیے ان جانوروں کو قریب سے دیکھے جو پنجڑوں یا گھروں کے قید و بند سے آزاد قدرتی ماحول میں اپنی زندگی گزار رہے تھے۔

وہ ضرور بڑی سرکار سے درخواست کرے گی کہ کسی کو کہہ دیں، اسے ساتھ لے جاکر سینکچویری دکھلا لائے۔

بادل بس پھٹ پڑنے کو تھے۔ وہ پلٹی اور جلدی جلدی قدم بڑھاتی بنگلے کی جانب چل پڑی۔ ادھر ڈھلان بھی تھا، اس لیے اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی اور راستہ جلد طے ہوتا رہا۔ لیکن ابھی وہ آدھے راستے ہی میں تھی کہ موٹی موٹی بوندوں نے اسے آلیا اور پھاٹک میں داخل ہوتے ہوتے وہ شرابور ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح امین معمول سے پہلے ہی جاگ گئی۔ خانساماں نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے صبح پانچ بجے ہی چائے دے دی۔ چائے پی کر اس نے جلدی جلدی منہ دھویا۔ بارش کی وجہ سے موسم میں خنکی آگئی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پر اپنا اکلوتا پولو گلے کا زرد سوئیٹر پہنا اور ایک کندھے پر اپنا مصوری کے سامان والا بیگ اور دوسرے پر ایزل لیے باہر نکل پڑی۔ وہ ڈانڈیلی میں اپنی پہلی صبح دل پر نقش کر چکی تھی جس نے رنگوں کی تابناک دنیا اس کے دامن میں انڈیل دی تھی وہ ابھرتے سورج کی نرم کرنیں اپنے رنگوں میں مقید کرلینا چاہتی تھی جو ندی کی دوسری جانب پہاڑوں کے دامن میں ایستادہ بلند و بالا پیڑوں کو چھوتے ہی مختلف النوع سبز رنگوں کو اجاگر کر دیتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی روشنی پگھلتے ہوئے سونے کی طرح زمین کی طرف بہ آتی۔ تب ان پیڑوں کا عکس کالی ندی کے پانی میں ایک غیر مرئی تصویر پیش کرتا۔

وہ لان سے گزر کر لکڑی کے چھوٹے سے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ چٹانوں پر سنبھل کر اترتے ہوئے وہ جیٹی کے برابر سے گزر گئی۔ ندی میں اس جگہ ہلکی سی ہلچل تھی۔ پانی کے ہلکے تھپیڑے رافٹ سے اٹکھیلیاں

کررہے تھے وہ ان کے برابر سے ہو کر بڑھ گئی۔ کچھ آگے جہاں چٹانی حصے سے ملحق زمین تھی۔ اس نے اپنا ایزل اسٹینڈ کھڑا کیا، اس پر کینوس لگایا اور رنگ ملانے لگی۔ اتنی دیر میں سورج کی پہلی کرنیں جھانکنے لگی تھیں جن کے فراق میں وہ وہاں پہنچی تھی ـــــ بہت جلد وہ رنگوں میں کھو گئی۔

"یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے!" ایک مردانہ آواز نے دھیمے لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا جیسے وہاں اس کی موجودگی سخت ناگواری کا باعث بنی ہو وہ اچھل پڑی۔ اس کے رنگوں کی نرم و نازک دنیا کو کسی نے تہ و بالا کر دیا تھا۔ اتنی مہذب اور رعب دار آواز چوکیدار کی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ برش ہاتھ میں لیے پلٹی کہ دیکھے اس کی وہاں موجودگی پر اعتراض کرنے والا کون ہے۔ اس کے ہاتھوں سے رنگوں کی پلیٹ گرتے گرتے بچی ـــــ وہ اس آواز کے مالک کو چہرے کے ان خطوط کو فوراً پہچان گئی۔ اور وہ بھی اس کی سنہری آنکھوں کو غور سے دیکھتا جو زرد سویٹر کی وجہ سے اور بھی کندن بن گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کی اجنبیت جاتی رہی اور اس کی جگہ ایک پہچان، ایک آگہی نے لے لی۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے ایک معنی خیز مسکراہٹ میں بدل گئے۔

"کون ؟ خواب ؟" اس نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے!"

ایمن کا چہرہ کسی واردات کی یاد سے گلنار ہو گیا۔ وہ جتنا دراز قد اسے سمجھ رہی تھی، وہ اس سے کچھ لمبا ہی تھا، اور شاید زیادہ ہینڈسم بھی لیکن اس سے زیادہ واضح اس کا پرسکون اور نڈر انداز تھا۔ اس کی آنکھوں کی کھلی تنقید تھی جو ایمن کو بھی جتنے سے اکھڑنے لگی۔ وہ اس کے ذہنی انتشار اور چہرے پر رنگوں کی ہولی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی مشق کی ضرورت ہے"۔ اب اس نے ایمن کی ادھوری پینٹنگ پر نظریں جمائیں۔

"آپ مصوری کے بارے میں کیا جانیں" ایمن نے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا "اندھیروں میں بھٹکنے والے رنگوں کی نزاکت کیسے سمجھ سکتے ہیں!"

اس کے ابروؤں پر گرہ ابھر آئی۔ جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم شاید ہماری پچھلی ملاقات کی طرف اشارہ کر رہی ہو"

ایمن نے جھنا کر دوسری طرف دیکھا۔ وہ اپنے چہرے کی اس چڑھتی لہر کو لیے اس سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی۔ وہ خود اپنی تیار کردہ زمین پر پھسلی تھی اور وہ اس کی حالت زار سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"قصور تمہارا ہی تھا۔ شادی کے بھرے پرے گھر میں جب کوئی حسین لڑکی بھی دیکھی، حویلی کے مردانہ حصّے میں، اندھیرے میں ۔ ۔ ۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "جاتی ہے تو یہ سمجھ کر ہی جاتی ہے کہ اس کے ساتھ ضرور کوئی رومانٹک واردات ہوگی۔"

ایمن سنّاٹے میں آگئی ۔ تو کیا واقعی وہ نادانستہ حویلی کے مردانہ حصّے میں چلی گئی تھی ۔ لیکن اس کے لیے اپنی مدافعت کرنا بھی ضروری تھا۔

"جب میں وہاں پہنچی تھی تو کوئی نہیں تھا۔" ایمن نے اسے غصّے سے دیکھا ۔ وہ ہنسا ۔ سہل بے پرواسی ہنسی ۔

"جھوٹ! تم نے مجھے دیکھ لیا تھا ۔ میں برآمدے میں پام کے گملوں کے پاس ہی دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔"

ایمن اب بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ وہ سراسر جھوٹ کہہ رہا تھا ۔ وہ جب برآمدے میں پہنچی تھی تو وہاں کوئی نہیں تھا ۔

"خواب، کچھ بھی ہو، ہماری پچھلی ملاقات تھی بڑی دلچسپ۔" وہ بولا ۔

ایمن نے کچھ نہیں کہا۔ اب وہ وہاں پل بھر بھی نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی ۔ وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا ۔ مصوّری کا سارا موڈ فنا ہو چکا تھا۔ وہ سامان اٹھائے اس کے برابر سے گزرنے لگی ۔ ایک طرف چٹان تھی اور دوسری طرف تڑوڑ کی جھاڑیاں۔ راستہ تنگ تھا۔ لیکن اسے آتا دیکھ کر وہ ایک اپنچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا ۔ اب ایمن کے غصّے کا پارہ اپنی بلندی پر پہنچ گیا تھا ۔ وہ اس کے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی ۔ اور اپنی آنکھوں میں چنگاریاں بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "اور شاید تم بھی ہماری پچھلی ملاقات نہیں بھولے ہوگے تمہارا یہ مغرور جبڑا پتھر کا ہوتا تو ٹوٹ گیا ہوتا۔"

"دوسری بار تجربہ کر کے دیکھنا چاہو گی؟" اس نے زیرِ لب کہا ۔ لیکن ایمن نے اس کی سرگوشی کے پیچھے اُبلتے لاوے کو محسوس کر لیا تھا ۔

"میں فری اسٹائل تماچے بانٹتی نہیں پھرتی۔" اس کے چہرے سے مسکراہٹ مٹا کر ایمن دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی ۔ "وہ تمہاری بدتمیزی کا ردِّ عمل تھا۔" ایمن نے ایک شانِ استغنا سے آگے بڑھ جانا چاہا ۔ لیکن اس نے ایمن کا شانہ مضبوطی سے پکڑ کر پلٹا دیا ۔ ایمن نے خود کو تو گرنے سے بچا لیا، لیکن اس کے ہاتھ سے ایزل گر گیا۔

"پھر تجربہ کرنا چاہو گی ؟" اس نے ایمن کی کلائی کو اپنی آہنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں پھر وہی عمل دہرانے کو تیار ہوں، لیکن یاد رکھو اس بار یہ تجربہ مہنگا پڑے گا۔"

ایمن کو پسپا ہونا پڑا۔ وہ اس سے لفاظی کی جنگ تو کر سکتی تھی لیکن اس کی قوت مردانہ سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اور اس حقیقت کا احساس اس کی کلائی میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتے درد سے اور بھی زیادہ ہو رہا تھا۔

"میں نہیں جانتی تم کون ہو" اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پچھلی بار بدتمیزی کی میں نے بڑی سرکار سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس بار میں تمہاری شکایت ضرور کروں گی۔"

"پچھلی بار کیوں شکایت نہیں کی تھی تم نے ؟" اس نے ایمن کی کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"جہاں تک ہو سکے میں اپنے معاملے خود ہی نپٹایا کرتی ہوں۔"

"لا حاصل تماچے مار کر ؟" اس نے دوسرے ہاتھ سے ایمن کی ٹھوڑی اونچی کرتے ہوئے کہا، جسے ایمن نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

"جو کچھ میں نے کیا، مجھے اچھا لگا۔" اب اس نے خود اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"اور جو کچھ میں نے کیا، وہ مجھے بھی اچھا لگا۔" اب وہ باقاعدہ ہنسی روک رہا تھا لیکن اس نے ایمن کی کلائی نہیں چھوڑی۔

"میں نے نواب زادوں کی آوارگی کے قصے سنے تھے . . ."

"لیکن خود تجربہ کر کے دیکھنا چاہتی تھیں۔" اس نے ایمن کی بات کاٹ کر کہا۔ ایمن نے بھنا کر اسے دیکھا۔ وہ صاف شرارت کر رہا تھا۔ لیکن اب ایمن کی کلائی چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اسے گھور رہا تھا۔

"کون ہو تم ؟" اس نے ایمن کو کلائی مسلتے دیکھ کر پوچھا۔

"میں جو کوئی بھی ہوں" ایمن نے درد سے ابلتے آنسوؤں کو پی کر کہا "اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"پھر کس سے ہے ؟"

ایمن کا دل چاہا اس کے مسکراتے چہرے پر دائیں سینڈل اٹھا کر دے مارے۔ لیکن وہ اب دوبارہ ایک بچکانہ حرکت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بڑی سرکار سے — یا پھر ان کے صاحبزادے آزر نواب سے۔" ایمن جلد سے جلد وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنا گرا ہوا سامان اٹھانے کو جھکی، لیکن اس شخص کے گستاخ جملے نے اسے تیر کی طرح کھڑا کر دیا۔

"آزر نواب سے تمہارا تعلق ہے کب سے؟" اس نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔
ایمن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "تعلق ہے — لیکن وہ تعلق نہیں جو تمہارا گندا ذہن سوچتا ہے۔ وہ تم جیسے لچر اور بے ہودہ نہیں ہیں۔"
"تم انھیں بہت دنوں سے جانتی ہوگی؟"
"اور نہیں تو کیا۔" ایمن نے دیکھا کہ آزر نواب کے ذکر نے اسے کچھ زیر کر دیا۔ اس نے شہ پاکر کہا "میں ان سے تمہاری شکایت کر دوں تو وہ تمہاری یہ تنی ہوئی گردن مروڑ کر پھینک سکتے ہیں۔"
ایمن کا حربہ کام آیا۔ وہ کچھ دیر خاموش اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر ایزل اٹھایا اور ایمن کو تھما دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر ایمن کی کلائی پر گئی، جہاں اس کی گرفت نے انگلیوں کے نشان چھوڑے تھے۔ اس نے ہولے سے اس نشان کو چھوا اور بولا Sorry — اس کی دھیمی آواز میں واقعی افسوس کا شائبہ تھا۔ وہ ضرور آزر نواب سے خائف تھا۔ ایمن بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گئی۔ وہ جلد سے جلد اس کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔

یہ کون شخص تھا جو ہر بار اسے اس کی نسوانی کمزوری کا احساس دلا جاتا تھا۔ اسے خائف کر دیتا تھا۔ اگر وہ وہیں کہیں رہتا ہو تو ایمن کو محتاط ہو جانا چاہیے۔ وہ ہر بار تو اسے آزر نواب سے نہیں ڈرا سکے گی۔ اسے حکمت عملی سے کام لے کر اپنے غصے کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ اس شخص سے پہلی ملاقات کا بوجھ ہی ابھی اس کے ذہن سے نہیں ہٹا تھا کہ وہ دوسری بار اس کا راستہ کاٹ گیا۔

"کاش اب اس سے پھر کبھی مڈبھیڑ نہ ہو۔" ایمن نے جلدی جلدی چٹانیں پھلانگتے ہوئے سوچا۔ لیکن ڈانڈیلی چھوٹی جگہ تھی۔ کیا پتا وہ وہاں کتنے دن کے لیے آیا تھا۔ اور حیدر آباد سے یہاں چلا آنے پر اس کا مقصد کیا تھا۔ بظاہر بڑی سرکار اسے ہرگز نہیں جانتی تھیں — ورنہ وہ انھی کا مہمان ہوتا۔

بنگلے کے احاطے میں داخل ہو کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بوٹ میں بیٹھا تھا اور بوٹ بیچ ندی میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے مضبوط بازو بوٹ کو دوسرے کنارے کھے رہے تھے۔ اور اس کا پرکشش سرخ و سفید چہرہ اس فاصلے پر دھندلا گیا تھا۔

'اس بار امین' نے سوچا ضرور بڑی سرکار سے اس شخص کی شکایت کر دیگی ۔ لیکن دوبارہ سوچنے پر امین نے اس کے خلاف فیصلہ کرلیا ۔

امین نے اپنے بوجھل ذہن کو نہا کر ہلکا کیا اور تیار ہوکر بڑی سرکار کے حضور پہنچی ۔

بڑی سرکار ہمیشہ کھانے کی میز کے چھوٹے کنارے پر اکیلی بیٹھا کرتی تھیں اور امین ان کی بائیں جانب بیٹھتی تھی ـــــ ابھی امین بڑی سرکار کے لیے پارج میں دودھ ملا رہی تھی کہ بڑی سرکار کی نظر سامنے والے دروازے پر ٹکی اور ان کی نظروں کے تعاقب میں امین نے بھی اپنی نظریں اٹھائیں، اور دیکھتی رہ گئی ۔

دروازے کے بیچ میں اگر وہ سینکچویری سے بھاگے ہوئے چیتے کو بھی کھڑا دیکھتی تو اس کی وہ کیفیت نہ ہوتی جو اس وقت اس اجنبی کو وہاں دیکھ کر ہوئی جس نے اس کے ذہنی سکون کو درہم برہم کردیا تھا ۔

"آز رنواب"! ــ بڑی سرکار کی پرشوق آواز آئی اور امین کے ہاتھ سے دودھ چھلک گیا ـــ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی ۔ اپنے شش و پنج کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے اس نے اس بلند و بالا قامت کو دیکھا جس کی شخصیت نے کوئی اور ہی چولا پہن لیا تھا ۔ اس کی وجاہت وہی تھی ۔ لیکن نہ اس کی آنکھوں میں وہ گہرائی تھی جو اسے معمّا بناتی تھی، نہ ہونٹوں کے خم میں وہ استہزا ایک گرمجوش مسکراہٹ تھی جو آنکھوں سے بھی جھلک رہی تھی ۔

انھوں نے ایک نظر امین پر بھی ڈالی لیکن ان کی آنکھوں میں شناخت کی کوئی علامت نہیں جاگی ۔ وہ اسے مکمل نظرانداز کرکے اسی طرح مسکراتے ہوئے آگے بڑھے ۔ قریب پہنچ کر جھکے اور بڑی سرکار کے گال پر بوسہ دے کر بولے "بندگی عرض کرتا ہوں سرکار"

بڑی سرکار نے دونوں ہاتھوں میں ان کا سر تھام کر پیشانی چوم لی ۔

"جیتے رہو' میرے بچّے ـــ مگر تم یہاں کیسے؟ ـــ کل ہی تو تمھارا جرمنی سے بھیجا تار امین نے پڑھ کر سنایا تھا؟"

"امین؟" ـــ انھوں نے امین کی طرف نظریں اٹھائیں اور امین نیچے دیکھتے ہوئی اپنے پارج میں چمچہ چلانے لگی ۔

"جب تم انگلینڈ چلے گئے تو ہمیں بڑی تنہائی محسوس ہونے لگی"۔ بڑی سرکار نے بیٹے سے کہا "ہم نے اخبار میں ایک جنرل اسسٹنٹ کے لیے اشتہار نکلوایا"

"جنرل اسسٹنٹ!" آزر نواب ابرو پر بل ڈال کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی سرکار کی آنکھیں بیٹے کو دیکھ کر چمکنے لگی تھیں۔

ایمن نے خیریت اسی میں دیکھی کہ خاموشی سے اپنا پارج کھاتی رہے۔ حالانکہ اس وقت اس کا رواں رواں کان بنا ہوا تھا۔

"لیکن تم نے ہمیں بتایا نہیں کہ تار کے ساتھ ہی تم کیسے پہنچ گئے۔" بڑی سرکار نے پھر پوچھا۔

"وہ تار آپ کی سالگرہ پر بینک سے جرمنی سے بھجوایا تھا لیکن میٹنگ کو کسی ناگزیر وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔ اسی لیے میں بھی چلا آیا۔"

"لیکن پانچ دن پہلے تو ہم حیدرآباد ہی میں تھے ۔۔۔ تم تو اس وقت تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔"

"جی میں حیدرآباد پہنچ چکا تھا۔ جب میں شام کے پلین سے پہنچا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ تمکین چچا جان نے بڑے اصرار سے شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی ان کا دعوت نامہ مجھے لندن میں ملا تھا ۔۔۔ اس لیے جب میں حیدرآباد پہنچ ہی گیا تھا۔ تو سوچا کیوں نہ نکاح میں شریک ہو لوں۔ مجھے تو کپڑے تبدیل کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی ۔۔۔ سیدھے ایرپورٹ سے شادی میں چلا آیا۔"

خانساماں نے آزر نواب کے آگے پلیٹ لگا دی تھی۔ وہ تو بڑے اطمینان سے اپنے آملیٹ میں چھری بھونکتے رہے، لیکن ایمن کے حلق میں ہر نوالہ پتھر بن کر اٹکتا رہا، جسے وہ چائے کے گھونٹ لے کر اتارتی رہی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شادی میں شریک تھے اور ہمیں خبر ہی نہیں ۔۔۔ کمال ہے" ۔۔۔ بڑی سرکار بولیں۔ خوشی کے مارے ان کی عام طور پر نرم اور دھیمی آواز کچھ اونچی ہو گئی تھی۔

"خبر کیسے ہوتی؟ میں اتنا تھک گیا تھا کہ تمکین چچا جان کو بس اپنی حاضری کی اطلاع دی اور برآمدے میں پڑے دیوان پر جا کر لیٹ رہا۔" انھوں نے بس ایک نگاہ غلط انداز ایمن کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے پر ڈالی ایمن نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر ان کی نظریں ملی رہیں۔ پھر ایمن ہی کو نیچے دیکھنا پڑا۔

"ہو سکتا ہے کچھ لوگ جانتے ہوں" آزر نواب نے زیر لب کہا۔ "اور خبر کیسے ہوتی سرکار؟ آپ نے بھی تو خیر سے پارہ طبیعت پائی ہے۔ جب میں شادی سے لوٹا تو آپ سو چکی تھیں۔ اور جب جاگا تو آپ جا چکی تھیں۔"

بڑی سرکار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"ہاں دوسرے دن صبح کو پانچ بجے کی گاڑی سے ہی ہم امین بی بی کو لے کر نکل گئے تھے۔ ہمیں فیکٹری کے مزدوروں کی ہڑتال اور نیلام کی فکر تھی۔"

"آپ کی اسی بات پر تو ہم فخر کرتے ہیں۔" آزر نواب بولے "اب آپ ہلکان نہ ہوں، میں آگیا ہوں"

"یہاں تم کب پہنچے آزر نواب؟" ــــ بڑی سرکار نے پوچھا۔

"میں کل رات بس سے پہنچا ہوں۔ میں نے دھاروا ڑسے بس پکڑ لی تھی۔"

"بس سے آئے ہو تم؟" ــــ بڑی سرکار نے گویا کلیجہ تھام کر کہا ان کے لہجے میں حیرت اور مایوسی تھی۔

آزر نواب نے ہنس کر شانے اچکائے "تو کیا ہوا؟ بس ذرا انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ جنھیں گرم پانی سے نہانے کے بعد رات کو آرام سے سو کر کس لیا۔ رات گئے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا سوچا، سویرے بندگی کروں گا۔"

اس کے سامنے، فاختئی رنگ کے ہلکے پھلکے سوٹ میں بیٹھ کر توسٹ پر مکھن لگاتے، اپنی والدہ سے مسکراتے ہوئے ادب اور تہذیب سے بات کرتے اس شخص میں اور اس اجنبی میں جسے امین نے تھپڑ مارا تھا اور دوسری بار مارنے کی دھمکی دی تھی، زمین آسمان کا فرق تھا۔ ڈاکٹر Jekyll کی طرح اس کی شخصیت کے دو متضاد پہلو تھے اور وہی شخص شوئی قسمت سے اس کی مالکہ کا چہیتا بیٹا تھا یعنی خود اس کا مالک۔ "اب تمھارے دن گنے چنے ہیں امین بی بی یہاں" ـ امین نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ اس حقیقت سے زیادہ پریشان کن ایک حقیقت اور بھی تھی ــــ شاید اس کی مالکن کا بیٹا، کسی عورت کو ــــ ہر عورت کو اپنی دسترس میں سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ ان گنت کہانیاں ابھریں جن میں سرمایہ داروں کی ہوس نے بے مایہ معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ لیکن اب وہ منہ بند کلیاں نہیں تھیں۔ اب انھیں چھونے والوں کی انگلیاں زخمی بھی ہو سکتی تھیں۔ لڑکیوں میں اپنے تحفظ کا احساس جاگ گیا تھا اور اسی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں وہ سرگرم عمل نظر آتی تھیں۔

حیدرآباد کے وہ باشندے جو عورتوں کا ملازمت کرنا تو کجا معلوماتِ تعلیم کو بھی معیوب سمجھتے تھے اب دھڑلے سے اپنی بہو بیٹیوں سے نوکریاں کروا رہے تھے ــ یہ مرغ باد نما تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں عبوری دور آیا تھا۔ پرانا سماج مر چکا تھا اور نئے سماج نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ حیدرآباد کے کچھ خاندان ایسے تھے جنھوں نے وقت کی نبض کو پہچان لیا تھا۔ انھیں عظیم ہندستانی سماج کا ایک حصہ بننے میں اتنی دشواری نہیں ہوئی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب امین بنگلور سے حیدرآباد آئی تھی ۔ حالات نے بہت کمسنی میں ہی اسے سکھا دیا تھا کہ اسے دنیا کا مقابلہ اکیلے ہی کرنا ہے۔

اس نے آزر نواب کا مقابلہ بشارت نواب کے ہنس مکھ کھلنڈرے انداز سے کیا ۔ وہ بشارت نواب کے ساتھ کبھی نروس نہیں ہوئی تھی ۔ نہ کبھی اس نے ان سے دور بھاگنے کی ضرورت محسوس کی ۔ اس کی بشارت نواب سے اچھی چھنتی تھی ۔ جب سے وہ ڈانڈیلی آئی تھی، اسے کئی بار ان کا خیال آیا تھا۔ حویلی کے بارعب بوڑھے ماحول میں بشارت نواب تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھے ۔ وہ حویلی کے پراسن ماحول کا ایک حصّہ بن رہی تھی ۔ اور اب اچانک آزر نواب کی آمد نے اسے بے یقینی کے غار میں دھکا دے دیا تھی۔ کیوں نہ وہ حویلی چھوڑ دے اور چلی جائے ۔ اس نے سوچا ۔ لیکن کہاں ؟ ۔ حویلی سے باہر دنیا بہت بڑی تھی ۔ وہاں کھو جانے کا اندیشہ تھا ۔ باہر کی دنیا اور بھی بڑے درندوں سے بھری تھی ۔ اسے مسز آتر اک کا خیال آیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، کیونکہ زندگی گزارنے کے لیے بہر حال اسے کام تو کرنا ہی تھا اور اب وہ در در کے جھکولے کھاتے کھاتے تنگ آگئی تھی ۔ کوئی بھی نوکری وہ آج تک جم کر نہیں کر سکی تھی ۔ آخر کار حویلی اسے راس آرہی تھی وہ جگہ اس کے لیے گوشہ عافیت تھی ۔ سب سے زیادہ حویلی کا اونچا تہذیبی ماحول تھا جس سے وہ خود کو منسوب کر سکتی تھی ۔ وہ ان سب نعمتوں کو محض ایک شخص کے ڈر کی وجہ سے کیسے چھوڑ سکتی تھی ؟ ۔۔ وہ ہرگز حویلی نہیں چھوڑے گی جب تک کہ وہ مجبور نہ کر دی جائے اس نے فیصلہ کر لیا ۔ وہ بھی آزر نواب اور ان کے غرور کا مقابلہ کرے گی ۔

اس کا دماغ جب ان پریشان کن جالوں سے پاک ہو گیا تو اس نے خود کو اپنے بستر میں پایا ۔ وہ شاید دن بھر اسی ادھیڑ بن میں رہی تھی ۔ اس نے چونک کر کتاب بند کی تو دیکھا کہ گھنٹوں سے اس کی نظر بس اسی ایک صفحے پر ٹکی تھی ۔ اس نے کتاب تپائی پر رکھی، بتی بند کی اور سو گئی ۔

"امین بی بی، آپ کو چھوٹے سرکار دفتر میں آو بولے ۔" دوسرے دن شمشاد نے آکر کہا ۔

امین کے ہاتھ رسالے کے اوراق پلٹتے پلٹتے وہیں رک گئے ۔ وہ دراصل اطالوی پیزا کی ترکیب اس رسالے میں دیکھ رہی تھی ۔ وہ جب سے ڈانڈیلی آئی تھی ۔ اسے کچھ زیادہ وقت مل رہا تھا ۔ وہ کبھی کبھی کچن میں چلی جاتی اور نئے نئے پکوان آزما کر دیکھتی ۔ اس کی بنائی ہوئی بعض چیزیں بڑی سرکار کو بھی پسند آتی تھیں ۔ گھاگ اور آزمودہ کار باورچیوں، خانساماؤں کے ہاتھ کے بنے پکوان کھاتے رہنے کے بعد شاید امین کی ناتجربہ کار کوشش ان کے منہ کا مزہ بدلتی تھیں ۔ یا پھر ہو سکتا ہے وہ امین کا دل رکھنے کو اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتی ہوں ۔

شمشاد کی بات سن کر اس نے بے اختیار بڑی سرکار کی طرف دیکھا جیسے سرکار اسے روک لیں گی۔ لیکن وہ بڑی محویت سے اپنی نوٹ بک میں کچھ نوٹس لکھ رہی تھیں نہ انھوں نے اپنا قلم روکا نہ سر اٹھایا۔ ایمن نے برداشتہ خاطر رسالہ اور دوسرے رسالوں کے ساتھ جما کر رکھا اور جانے کے لیے اٹھی۔ برآمدے تک پہنچتے ہوئے بھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کاش بڑی سرکار کسی کام سے اسے واپس بلالیں اور بات ٹل جائے ــــ لیکن کب تک؟ ــــ اسے جانا ہی تھا۔

بجری کی روش سے ہوتے ہوئے وہ بنگلے کے بیرونی حصے میں پہنچی، جو گیٹ کے بالکل سامنے پڑتا تھا۔ خوب صورت باغیچے کی روش پر چلتے ہوئے وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ لیکن ہر سیڑھی پر خطرات اور شبہات نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ پھر اس نے جھلا کر خود کو لوکا کہ وہ کسی شیر کے پنجرے میں تو نہیں جا رہی تھی جہاں کوئی بھوکا شیر اسے پھاڑ کھائے گا۔ اس نے دو لمبی لمبی سانسیں لے کر اپنے حواس مجتمع کیے اور آگے بڑھی۔ کچھ ٹھٹک کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔

برآمدے کی حد پر سفید، نازک سے پنجروں کی قطار میں خوش رنگ چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ ان میں سے بعض تو اتنی چھوٹی تھیں کہ اس کی مٹھی میں بند ہو سکتی تھیں۔ ایمن سب کچھ بھول کر چڑیوں میں گم ہو گئی۔ اس کی توجہ دیکھ کر کچھ تو بالکل خاموش ہو گئیں، لیکن کچھ نے اور بھی زیادہ غل مچانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی آبدار موتیوں جیسی آنکھوں سے اسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں۔

اسے اس ننھی چڑیا کا نام یاد نہیں آ رہا تھا جس کا رنگ گہرا سبز تھا۔ چہرہ دائیں بائیں سفید اور آنکھ کے پیچھے ایک سیاہ دھاری سی اس نے کالج کے باغات میں یہ چڑیا بہت دیکھی تھی ــــ وہ آنکھیں چندھیائے دماغ پر زور دے کر اس چڑیا کا نام یاد کرنے لگی۔

ایک گمبھیر آواز نے اسے چونکا دیا۔ GREEN BARBET "اسے ہم بسنتا چڑیا کہتے ہیں اردو میں۔"

ایمن نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے ہی دروازے میں ہاتھ باندھے کندھا دروازے سے ٹکائے، آزر نواب کھڑے تھے۔ ایمن نہیں جانتی تھی کہ وہی ان کے آفس کا دروازہ تھا۔

"وہ .... میں ...." گھنٹوں میں حاصل کی گئی تمکنت منٹوں میں غائب ہوتی محسوس کر کے وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

آزر نواب اطمینان سے آگے بڑھ کر اس کے برابر کھڑے ہو گئے وہ اس وقت بہترین سلی ہوئی سفید پتلون پہنے ہوئے تھے، اور سفید ہی قمیص تھی، جس کی آستینیں انھوں نے کہنیوں تک الٹ

رکھی تھیں ۔ کالر کے ایک کھلے بٹن سے ان کی گردن کی مضبوطی جھلک رہی تھی ۔

"اور یہ Babona ہے ۔ جسے ہندستان میں کرچھیا کہتے ہیں ۔" آزر نواب نے دلچسپی سے ایک ننی سی چڑیا کی طرف اشارہ کیا ۔ جو اُن کا التفات دیکھ کر پھدک کر دوسرے کنارے جا بیٹھی تھی ۔ اس کی سفید حلقے میں بیٹھی چمک دار آنکھوں سے بے اعتباری جھلک رہی تھی ۔

Cranya Minivet واقعی بہت ہی خوب صورت چڑیا تھی ۔ اس کا رنگ نیلگوں سیاہ تھا جسم کا پچھلا، نچلا حصہ چمکیلا سرخی مائل اور پنکھ سیاہ اور زرد ۔

تھوڑی دیر میں ایمن بھول ہی گئی کہ آزر نواب نے اسے کسی کام سے بلایا تھا ۔ وہ اسے اس روانی سے مختلف چڑیوں کے عادات و خصائل کے بارے میں بتا رہے تھے جیسے انھوں نے اسے اسی کام کے لیے بلایا تھا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے واقعی انھیں اپنے چھوٹے سے چڑیا گھر میں کافی دلچسپی تھی ۔

"لیکن بس شہاب ۔" انھوں نے گویا اپنا فرض ادا کرنے کے بعد کہا "میں نے آپ کو چڑیاں دکھانے کے لیے نہیں بلایا ہے ۔" اور ایمن حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی ۔

ویسے بھی اسے آزر نواب کے برتاؤ میں واضح تبدیلی دیکھ کر اچھا ہو رہا تھا ۔ یہ تبدیلی غالباً حویلی میں اس کے مقام کو جاننے کے بعد آئی تھی ۔ انھوں نے پہلے کی طرح اسے 'تم' کہہ کر مخاطب نہیں کیا، بلکہ رسمی انداز تخاطب پر اتر آئے تھے ۔ اور یہی ایمن کو منظور بھی تھا ۔

"یہ . . . یہ بڑی سرکار نے کچھ فائلیں دی تھیں ۔" ایمن نے ہوا کے جھونکے سے اڑتے ہوئے کاغذات کو دبوچ کر کہا ۔ بڑی سرکار نے کچھ فائلیں آزر نواب کے پاس آفس میں بھجوانے کو دی تھیں ۔ ظاہر ہے آزر نواب کے آجانے پر وہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئی تھیں، جو آزر نواب کی غیر حاضری میں ان پر آپڑی تھیں ۔

آزر نواب نے اوپر سے نیچے تک اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور کمرے میں چلے گئے ۔ یہ گویا ایمن کے لیے بھی اندر آنے کا سگنل تھا ۔

یہ کمرہ کافی کشادہ تھا، عقبی دریچوں کے پردے ہوا میں جھول رہے تھے ۔ وہیں کچھ آگے کو ہٹ کر بڑی سی شیشہ لگی ٹیبل تھی، جس کے ایک طرف کو رکھے ہوئے پورسلین کے گلدان میں 'جربیرا' کے تازہ خوش رنگ پھول اپنی نازک پتلی گردنیں اٹھائے کھڑے تھے ۔ دائیں طرف دیوار پر کچھ بڑے نقشے لگے تھے ۔ جن میں بانس اور ساگوان جنگلوں کے حدود دکھائے گئے تھے ۔ آزر نواب کا یہ دفتر عام شہری دفاتر کے مقابلے میں سیدھا سادہ لیکن سنجیدہ اور موثر تھا ۔ کمرے کا فرش مکمل طور پر چاکلیٹی قالین سے

چھپا ہوا تھا۔

اس کمرے کے برابر میں ایک اور کمرہ تھا ۔۔۔ امین نے اُٹھتے ہوئے پردے سے وہاں اسٹیل کی الماری اور ایک اسٹینڈ پر فائلیں رکھی دیکھیں اور ایک ٹیبل جس پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔

آزر نواب گھومنے والی چمڑے کی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ امین کو سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ اور خود ایک خط پڑھنے میں مصروف ہو گئے ۔ امین جلد سے جلد اپنے بلائے جانے کی وجہ جاننا چاہتی تھی ۔ آزر نواب نے کرسی میں اس کی بے چینی اور ذہنی تناؤ کو شاید محسوس کر لیا ۔۔۔ انھوں نے خط پڑھتے پڑھتے رک کر ایک ابرو چڑھا کر اسے دیکھا وہ نظر سوالیہ تھی جس میں ناگواری کا شائبہ بھی تھا ۔ گویا وہ اس سے اس کی بے چینی کا جواز مانگ رہے ہوں ۔

" وہ ... شمشاد نے کہا تھا ..." وہ رک گئی

"کیا کہا تھا شمشاد نے ؟ اور شمشاد نے جو کچھ کہا تھا اس سے میرا تعلق کیا ہے ؟" انھوں نے پوچھا۔

امین نے گلا صاف کیا اور جم کر بولی " شمشاد نے کہا تھا کہ آپ نے مجھے بلایا ہے "۔

" کوئی اعتراض ہے آپ کو ؟" آزر نواب نے اسی طرح اسے گھورتے ہوئے کہا " کیا حویلی کی جنرل اسسٹنٹ کو کسی کام کے لیے بلانا میرے اختیارات میں شامل نہیں ہے ؟"

" نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں تھا " امین نے گلا صاف کرتے ہوئے صفائی پیش کی ۔

" پھر کیا مطلب تھا آپ کا ؟" آزر نواب نے خط رکھ کر ٹیبل پر دونوں ہاتھ جماتے ہوئے کہا " آپ سمجھ رہی تھیں کہ اچھی خاصی تنخواہ پر آپ کا تقرر اس لیے کیا گیا ہے کہ زندگی آپ کے لیے محض ایک بے فکر لمبی پکنک بن جائے جہاں آپ ایک آرام دہ ماحول میں اطمینان سے مصوری کا شوق پورا کریں یا چڑیوں کے خوش رنگ پر گن سکیں ؟"

امین سن سی رہ گئی ۔ آزر نواب کی ترش روئی نے اس سے جواب مانگا بھی ہوگا تو اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی رہیں ۔

آزر نواب کچھ دیر تک فائلوں کا مطالعہ کرتے رہے ۔ یہ وہ کاغذات تھے جوان کی غیر حاضری میں منشی صاحب نے تیار کیے تھے

" اوہ !" آزر نواب نے زچ ہو کر کئی صفحے ایک ساتھ پلٹے ۔ " منشی صاحب اگلے وقتوں کے آدمی ہیں ۔۔۔ اب اس زبان کو سمجھنے والے کہاں رہے ہیں ۔۔؟ جلانے والی لکڑی کی جگہ ' ہیزم سوختنی ' کو کون سمجھے گا ؟"

ایمن دم سادھے سنتی رہی۔ خود اسے ہیزم سوختنی کے معنی نہیں معلوم تھے۔

"میرا خیال ہے ان سارے کاغذات کو ہمیں انگریزی میں تیار کرنا ہوگا"۔ انھوں نے ایمن سے کہا۔

"کچھ فائلیں انگریزی میں بھی تو ہیں"۔ ایمن بولی۔

"کچھ فائلیں ہیں ــــ سبھی نہیں۔ آپ پہلے ڈکٹیشن لیجیے، بعد میں ان فائلوں کو دیکھا جائے گا۔

ایمن فوراً اپنا پیڈ اور پنسل سنبھال کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی غیر ضروری گفتگو سے احتراز کرنا چاہتی تھی۔ اسے اس تند خو نواب زادے سے خوف ہونے لگا تھا۔

وہ بلا مداخلت لنچ کے وقت تک کام کرتے رہے۔ پہلے پہلے تو ایمن کو مشق نہ ہونے کی وجہ سے دقت ہوئی۔ آزر نواب بہت تیزی سے اپنی آکسو نین انگریزی میں ڈکٹیشن دیتے تھے۔ اسے دو تین بلاک کرلٹ سے دوبارہ پوچھنا پڑا۔ جس پر وہ جھلا کر بولے "کس بدنصیب دفتر میں کام کرتی تھیں آپ پہلے؟"

"پہلے کسی باقاعدہ دفتر میں کام نہیں کیا ہے"۔ ایمن نے بھی اپنے غصّے کی لہر کو دباتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آنکھیں سنجیدہ تھیں یا جان بوجھ کر اس کو چھیڑنا چاہتی تھیں "میں یہاں جنرل اسسٹنٹ کی پوسٹ پر آئی تھی"۔

"کتنی سادہ اصلاح ہے!" آزر نواب نے کرسی پر پسرتے ہوئے کہا" اور غالباً آپ کی ذمّہ داریوں میں بشارت نواب کی موبائک پر گولکنڈے کی سیر بیٹنگ، چڑیوں سے بات چیت اور جن سفوکر شادیوں کی تقریبوں میں جانا شامل ہے"

ایمن نے اپنا تمتمایا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ــ یہ دوسرا موقع تھا جب آزر نواب اس کی ذاتیات پر کیچڑ پھینک رہے تھے۔

"بڑی سرکار ایسا نہیں سوچتیں، انھوں نے مجھے نوکری دی تھی وہ بہت نیک دل اور روادار ہیں ـ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں چند گھنٹوں پر میرا بھی حق وہ مانتی ہیں"

"ٹھیک ہے خواب"۔ آزر نواب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔" سرکار کا دیا ہوا حق کون چھین سکتا ہے؟ لیکن آج سے آپ کی ذمّہ داریوں کا میں کچھ تبدیلی کی اجازت چاہتا ہوں"۔ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"میں یہاں کام کرنے آئی ہوں اور مجھے کام کرنا ہے"۔ وہ بھی کرسی سے اٹھتی ہوئی بولی ...

اور میرا نام خواب نہیں ہے۔"

"سرکار سے عرض کر دیجیے گا کہ آج لنچ پر مجھے ولیسٹ کومٹ پیپرملز کے ڈائرکٹر کے ہاں جانا ہے۔ میرا انتظار نہ کریں۔" آزر نواب نے اس کے احتجاج کو ان سنی کر کے کہا اور کمرے سے باہر جانے لگے۔

ایمن خاموش پنسل اور پیڈ تھامے انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ان کی چال بڑی باوقار اور مستحکم تھی جو ان کے اعلا خاندانی ہونے کی غماز تھی۔ استوار چوڑے شانوں پر قوی گردن اور خوش وضع سر اُن کی چال کو اور بھی غرور بخشتے تھے۔ گھنے لہریے دار بال کانوں کے پیچھے سے ان کی گردن پر ہوتے ہوئے، قمیص کے کالر تک پہنچ رہے تھے۔ اس روز کافی دیر تک ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد اسے آزر نواب کے بارے میں اپنی قائم کی ہوئی رائے کو بدلنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ ان کا تضاد اس کے لیے معما بن رہا تھا۔ انھیں جتنا کھوکھلا اور سہل انگار سمجھا تھا وہ غالباً ایسے نہیں تھے۔ ان کا انداز مغرورانہ ضرور تھا۔ شاید وہ خود پرست بھی تھے — اور — اور شاید عورت کو محض ایک کھلونا بھی سمجھتے تھے۔ وہ بڑی سرکار کے لاڈلے ہوتے ہوئے بھی ان کا بہت ادب کرتے تھے — پھر شادی میں ایمن کے ساتھ اس غیر ذمہ دارانہ برتاؤ کا جواز کیا تھا؟

جاتے جاتے آزر نواب اچانک گردن پر ہاتھ رکھ کر پلٹے جیسے انھوں نے وہاں ایمن کی سرسراتی نظریں محسوس کی ہوں۔ ان کی نظریں ملیں اور ایمن کے ہاتھ سے ڈکٹیشن بک گر پڑی۔

"سنبھلو خواب!" آزر نواب نے ایمن سے کہا "بکھرے ہوئے صفحے جمع کر لو۔" اور کمرے سے نکل گئے۔

اسے ان بکھرے ہوئے اوراق کی طرح اپنے منتشر خیالات کو مرتب کرنا ہوگا — اسے ایسا لگا جیسے اس کی زندگی کا اصل چیلنج تو اب شروع ہو رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بکھرے ہوئے اوراق سمیٹے اور انھیں ٹائپ کرنے کو برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ ایک بجنے میں کچھ وقت تھا کچھ کام تو لنچ سے پہلے نپٹایا جا سکتا تھا۔ لنچ کے بعد الماری کے کاغذات کی جانچ ہونی تھی یہ کوئی لمبا چوڑا کام نہیں تھا، نیلام کے بارے میں منشی صاحب کی مدد سے معلومات حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس نے جلدی جلدی خطوط ٹائپ کیے ضروری کاغذات آزر نواب کے ٹیبل پر ملاحظہ کے لیے رکھے اور واپس ہوگئی۔

دوسرے دن صبح کو نیلام تھا۔ آزر نواب نیلام پر خود وہاں موجود تھے۔ آزر نواب کے ساتھ بھسنور مٹھ اور منشی صاحب بھی براجمان تھے۔

آزر نواب نے نیلام کے بعد کچھ لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا جن میں محکمہ جنگلات اور پولیس کے کچھ افسر اور مینگنیز کی کان سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ تھے۔ ان دنوں مینگنیز فیلڈز کے کچھ بدیسی ایکسپرٹس بھی ڈانڈیلی آئے ہوئے تھے۔ کل ملا کر کوئی پچاس کے قریب مہمان تھے جن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔

آزر نواب کو گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ ایمن بڑی سرکار کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی ان ساریوں اور بلانکٹوں کا حساب لکھ رہی تھی جو ہر سال نیلام کے دوسرے دن بڑی سرکار غریب کارندوں میں بانٹا کرتی تھیں۔ اتنے میں شمشاد کچھ پریشان سی داخل ہوئی۔ بڑی سرکار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"تقصیر، ناشی ملا باورچی صبح سے غیب ہے، اور دیکھئے تو کیا، رات میں اللہ رکھواتے مہمان آرہیں، پکیں گے کیا ــــ ؟"
شمشاد کی فکر بجا تھی۔ بڑی سرکار بھی چپ سی ہوگئیں۔ کوئی اور خانساماں مقامی طور پر ملنا مشکل تھا۔ فائنڈلی چھوٹی سی جگہ تھی۔ وہاں کے باورچی مطبخ کی باریکیوں کو کیا جانیں۔
"وجہ معلوم ہوئی، کیوں نہیں آیا وہ؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔
"اس کی بیوی کی زچگی ہوئی ہے سرکار۔" پھر شمشاد نے آواز دبا کر کہا جیسے اسے وہاں، ان بیاہی ایمن کی موجودگی کا احساس ہوئے۔ "بچہ مر کو پیدا ہوا ــ حالت خراب ہوگئی تھی۔ دھارواڑ کے بڑے ہسپتال لے جانا پڑا۔"
"تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا ــــ ؟ ہو سکتا ہے اسے کسی مدد کی ضرورت ہو؟" بڑی سرکار نے پان دان کھول کر سو کا ایک نوٹ نکالا۔ "کسی کو ابھی بارہ بجے کی بس سے بھجواؤ۔ کہنا یہ پیسے خانساماں کو دے دے۔ اور ہاں اس سے کہنا کہ کوئی فکر نہ کرے۔ ہسپتال کا جو بھی خرچ ہوگا وہ ہمارے ذمے ہوگا۔ آزر نواب کے آنے پر ہم وہاں کے بڑے ڈاکٹر کو فون کروا دیں گے۔"
"وہ ڈاکٹر خود دھارواڑ سے آج رات کے ڈنر پر آرہے ہیں۔" ایمن نے مہمانوں کی لسٹ دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس وقت عبدالکریم یہاں ہوتا تو اچھا تھا۔" بڑی سرکار کی فکر بدستور قائم تھی۔
"شمشاد اور میں مل کر نپٹا لیں گے، آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔" ایمن بولی۔
"ارے ہم تو بھول ہی گئے تھے۔" بڑی سرکار ایک دم ہشاش بشاش ہو کر بولیں۔ "کہ تم نے ہوم سائنس کا کورس کیا ہوا ہے۔" وہ مسکرائیں "لیکن آج کل کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، کیا عملی زندگی میں بھی کام آتا ہے؟"
"اب یہ تو شام ہی کو دیکھیے گا۔" ایمن نے کہہ تو دیا لیکن اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ بڑی سرکار نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ کافی حد تک سچ تھا۔ اسے کلاس میں آملیٹ بنانا چار گھنٹے میں سکھایا گیا تھا۔
"شام کی دعوت کا سارا سامان آگیا یا نہیں؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔
"وہ تو منشی صاحب چھوٹے سرکار کے ساتھ جانے سے پہلے ایچ میرے حوالے کر گئے تھے۔"

"امین بی بی، تم ابھی جا کر سب دیکھ دکھا لو تو بہتر ہوگا۔ تاکہ کسی چیز کی کمی ہو تو فوراً منگوالی جائے"
امین مسکرا کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی سرکار نے زندگی میں کبھی کچن میں قدم نہیں رکھا تھا
ان کی فکر حق بجانب تھی۔

کچھ مہمان ویجی ٹیرین بھی تھے۔ ان کے لیے الگ مینو بنانا تھا۔ مرغ، گوشت اور انڈوں کے علاوہ اس نے مچھلی کی ایک ایسی ڈش چنی جو اس کے والد کو بہت پسند تھی۔ اچانک اسے ان کی بہت یاد آئی —— وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید اس کی زندگی بہت مختلف ہوتی۔ کسی اور کی چھت اس کا آسرا نہ ہوتی۔ وہ ان کے ساتھ گزارے ہوئے دن کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ ان کا خوب صورت پُرخلوص چہرہ، آنکھوں کی گرم جوشی، مزاج کا انکسار ایک متموّل خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود، اپنے اصولوں کی خاطر انھوں نے محض ایک معمولی ڈرافٹس مین کی نوکری قبول کرلی تھی۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ بڑے بڑے نقشے بنانے میں ان ہی کا ہاتھ رہتا تھا، لیکن نام ان کے افسروں کا ہوتا تھا۔ انھوں نے خود ایک نفیس ماحول میں پرورش پائی تھی، اسی لیے ان کا ذوق بھی اعلا درجے کا تھا۔ جب وہ اپنے نقشوں پر کام کرتے ہوتے تو امین انھیں چپ چاپ دیکھتی رہتی۔ وہ اس کے ہاتھ میں بھی کاغذ پنسل تھما دیتے تاکہ وہ انھیں ڈسٹرب نہ کرے —— وہ اپنے باپ کی نقل کرتے ہوئے، آڑی ترچھی لکیروں سے اپنا کاغذ رنگ دیا کرتی۔ لیکن انھوں نے کبھی اسے مذاق میں نہیں ٹالا۔ اس کے بنائے ہوئے نقشوں پر اسی سنجیدگی سے بحث کرتے، جیسے کسی بڑے آرکیٹکٹ کے پلان کو دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ رفتہ رفتہ وہ واقعی اپنے باپ کے پیشے میں دلچسپی لینے لگی تھی۔
اسے ان کے ساتھ وہ روزانہ کی سیر یاد آئی جب وہ دونوں دور تک کھلی اور تازہ ہوا میں نکل جاتے تھے۔ یہی وقت تھا جب انھوں نے باتوں باتوں میں اسے دنیا میں جینے کے ڈھنگ سکھائے تھے —— اس کے کردار کو مضبوط بنایا تھا۔ اس کے خیالات میں شدّت پیدا کرنے کی بجائے زندگی کے بارے میں ایک سلجھا ہوا انداز نظر دیا تھا، اسے سماج کے اصولوں کا غلام نہ بنتے ہوئے بھی، سماج کی عزت کرنا سکھایا تھا۔
اسے اس وقت ہوش آیا جب شمشاد نے اپنے پلّو سے اس کے آنسو پونچھے اور ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"کا ہے کو رو رہیں بی بی؟" شمشاد نے ہمدردی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں شمشاد" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ ایسے لوگوں کی یاد آگئی تھی جنھیں تم نہیں جانتیں"
"وہ کون ہیں بی بی تمہارے کو رلانے والے —— کیا بگاڑیں تم ان کا؟"

"تمھیں اپنے ماں باپ بھی یاد نہیں آتے؟" امین نے پوچھا۔

"اوئی، بھاڑ میں پھروان لو ۔۔۔ بیچ کو کھائے سویرے کو" شمشاد کا لہجہ تلخ ہوگیا ۔۔۔ ساٹھ ساٹھ سال میں بھی اس زہر کی تلخی کم نہیں ہوئی تھی۔

شمشاد کا یہ ارمان تو کبھی کا پورا ہوگیا ہوگا" امین نے سوچا شمشاد کو بیچ کر جو اناج لے گئے اس نے کب تک ساتھ دیا ہوگا ان کا؟

"مگر تم بھول رہی ہو شمشاد" اس نے کہا ہو سکتا ہے انھوں نے اپنے پیٹ کی خاطر نہیں، تمھیں تمھاری زندگی کی خاطر بیچا ہو۔"

"تم اسے زندگی بولتیں بی بی ۔۔۔ اجاڑ ہو جاؤ، یہ تو دوزخ کی بھٹی ہے ۔ جتا پھوکو آتی ایچ بجھی ۔ بند ایچ نئیں ہوتی۔"

ان محسوسات کے باوجود ۔ شمشاد نے پھر بھی خود کو حویلی کے شب وروز کے حوالے کر دیا تھا۔ حویلی اور اس کے مالک ہی اس کے لیے سب کچھ تھے ۔ کہاں ایسی مثالیں ہیں جہاں رہا ہونے پر بھی قیدیوں نے قید خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا؟

گیسٹ ہاؤس کا کچن کشادہ اور ہوا دار تھا۔ لیکن حویلی کی طرح ماڈرن اور خود کفیل نہیں تھا۔ ڈائننگ ہال بھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ بیک وقت پچاس لوگ سما سکیں۔

جب شام کو امین اپنا کام ختم کر کے نکلی تو مالی نے باغ کو زمرد کی طرح نکھار دیا تھا۔ وہاں ایک تنکا بھی غیر ضروری نہیں تھا ۔ لان پر کھانے کی بڑی ٹیبل لگا دی گئی تھی، جس پر سفید براق میز پوش پڑا تھا نشیب میں گنگناتی کالی ندی اور آس پاس ٹگوں کا طوفان تھا میز کو مزید پھولوں سے سجانا حماقت تھی، اسی لیے امین نے میز کی سجاوٹ ڈرفٹ ووڈ اور پھلوں سے کی ۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر ڈرفٹ ووڈ کے عجیب وغریب شکلیں اختیار کیے لکڑی کے ٹکڑے جو وہ کالی ندی کے کناروں سے چن لائی تھی اور ان کے ساتھ ملے جلے خوش رنگ پھل ۔۔۔ جھولے پر بھی تکیوں کے تازہ دھلے کور بدل دیے گئے تھے۔ یہ سب کچھ کرتے کرتے سات بج گئے اور وہ تھک کر چور ہو گئی ۔ اس نے طے کیا کہ وہ ڈنر میں شامل نہیں ہوگی۔ اس نے شمشاد اور دوسرے خدمت گاروں کو ہدایات دیں اور نہانے چل دی۔

اس نے نہانے میں کافی وقت لگایا اور جب ٹالکم پاؤڈر کے ہالے میں اپنی ہلکی پھلکی سفید ساری پہنے وہ واپس کچن میں آئی تو اس کی آدھی تھکن دور ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک ولولے نے لے لی تھی۔

کاروں کے آکر رکنے اور بات چیت کی آوازوں سے پتا چلا کہ مہمان آچکے تھے۔ ڈنر کا سلسلہ چل رہا تھا۔

ایمن دبے پاؤں برآمدے میں چلی آئی، ہائی بیکس کے پیچھے سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ لوگ ہاتھوں میں گلاس تھامے بات چیت میں مشغول تھے خواتین میں کچھ تو بالکل سیدھی سادی تھیں، جنھوں نے اپنا گروپ بنالیا تھا۔ اور کچھ بدیسی عورتیں تھیں جو مسحور کر دینے والے ماحول کا لطف لے رہی تھیں ایمن کی آنکھیں آزر نواب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب ایمن نے انھیں دیکھا تو اس کی نظریں وہاں جم گئیں۔ وہ دن بھر کی مصروفیات کے باوجود تھکے ہوتے بالکل نہیں لگ رہے تھے۔ انھوں نے تازہ دم ہو کر اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ گہرے رنگ کے سوٹ میں ان کا مردانہ حسن اور بھی نکھر آیا تھا وہ جھولے کی ایک سلاخ پکڑے، ہاتھ میں گلاس لیے کسی لڑکی سے مصروف گفتگو تھے جو جھولے پر رکھے تکیوں کا سہارا لیے ایک شان بے نیازی سے بیٹھی تھی۔ سرخ ساری میں وہ ایک دہکتا شعلہ تھی۔ بار بار اس کے سرخ ہونٹ مسکرا پڑتے اور اس کے موتی جیسے دانتوں کی برق کوند جاتی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی گلاس تھا جسے وہ کبھی کبھار ہونٹوں سے بھی چھو لیتی تھی ——— اس کی ساری توجہ کا مرکز آزر نواب کا وجود تھا۔

ایمن کو آزر نواب کا اس طرح سب مہمانوں کو چھوڑ کر بس اس لڑکی کا ہو رہنا اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ حسین عورت ہی آزر نواب کی کمزوری تھی۔ اچانک انھوں نے جھک کر اس لڑکی سے کچھ کہا اور اس نے اپنا گلاس ان کے سپرد کر دیا ——— وہ آگے بڑھ کر ڈرنکس کی ٹرالی کی طرف جانے لگے۔ راستے میں رک کر انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ایک ادھیڑ عمر جوڑے سے کچھ کہا اور وہ خاتون ان کے شانے پر ہلکے سے ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔ ایمن نے دیکھا جھولے پر بیٹھی اس لڑکی کی نظریں ہر طرف آزر نواب کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس نے ایک بیزار سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ پھیر لیا۔

دیر ہو رہی تھی اور بڑی سرکار اب تک باہر نہیں نکلی تھیں۔ آزر نواب کی نظریں دو تین بار برآمدے کی طرف اٹھ چکی تھیں۔ جھانکتی ہوئی پکڑی جانے کے ڈر سے ایمن، دبے پاؤں کچن میں لوٹ آئی ——— اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی ساری چیزوں کی طرف ایک تنقیدی نظر ڈالی اور اطمینان کر لیا کہ گرم رکھنے والی ڈشیں ٹھنڈی نہ ہو گئی ہوں۔ ٹیبل پر کھانا گرم رکھنے کے لیے Dish Warmers تیار تھے۔ بس کھانا چننے کا انتظار تھا۔

اسی لمحے ایک کار کی آواز آئی۔ شاید اسی مہمان کا انتظار تھا۔ ضرور کوئی خاص مہمان ہوگا ——— ایمن کو اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، اور وہ پھر دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ لان پر موجود سب مہمان خاموش ہو گئے تھے۔ آزر نواب نے اپنا گلاس ٹیبل پر ٹکا دیا اور آگے بڑھے۔ اس سے پہلے کہ شوفر اتر کر دروازہ کھولتا، انھوں نے خود بڑھ کر اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھولا، اور سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا کر بڑی

سرکار کو آتارا۔

امین انھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے مصروفیت میں پتا ہی نہیں چلا تھا کہ بڑی سرکار باہر گئی ہوئی تھیں۔

بڑی سرکار نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بیرونی مہمانوں کا لحاظ کرتے ہوئے، انگریزی میں اپنے دیر سے آنے کی معافی مانگی۔ اور آزر نواب نے اپنے بازو کے گھیرے میں لیجا کر انھیں ایک آرام دہ کرسی پر بٹھادیا ۔۔ جو مہمان بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے بھی اٹھ کر بڑی سرکار کو تعظیم دی، لیکن وہ سرخ ساری والی لڑکی، اسی شانِ استغنا سے بیٹھی رہی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ہی بڑی سرکار کو سلام کرلیا۔ اس کی وہ حرکت امین کو بہت ناگوار گزری۔ اسے اور بھی زیادہ غصہ آزر نواب پر آیا، جو اس لڑکی پر ریجھے جا رہے تھے۔

بڑی سرکار کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے، لیکن پھر بھی وہ مہمانوں سے تپاک سے مل رہی تھیں۔ آزر نواب نے مہمانوں کی نظر بچا کر جھک کر بڑی سرکار کے کان میں کچھ کہا اور انھوں نے اس لڑکی پر توجہ کی۔ بڑی سرکار کی آنکھوں کی بدلتی ہوئی کیفیت مسکراہٹ میں گم ہوگئی۔ اتنے میں ایک بدیسی نوجوان بڑی سرکار کی طرف بڑھا اور ان کی توجہ اس کی طرف تبدیل ہوگئی۔

امین پارٹی کا نظارہ کرنے میں اتنی محو تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی نہیں دی۔

"یہ چوری چھپے کیا دیکھا جا رہا ہے؟ باہر کیوں نہیں آئیں؟" اسے پیچھے سے آزر نواب کی آواز آئی اور وہ اچھلی۔

"مجھے یہ پینے پلانے کی محفلیں اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے جل کر صفائی پیش کی، حالانکہ ابھی تک وہ پوری دلچسپی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"پینا کوئی ضروری تو نہیں۔" آزر نواب نے بھی تیکھے پن سے کہا۔

"آپ تو پی رہے ہیں۔" امین کے منہ سے نکل گیا۔ حالانکہ آزر نواب کو پیتا دیکھ کر اسے غصہ آیا تھا لیکن اسے امیرزادوں کا خاصہ سمجھ کر دس سنے دیا بات کو ختم کردیا تھا لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

"مائی ڈیر جنرل اسسٹنٹ صاحبہ۔" آزر نواب نے اپنا گلاس دیواری ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے ریشمی لہجے میں کہا "کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ میرے پینے یا نہ پینے سے آپ کا کیا تعلق ہے۔" اور امین سے کوئی جواب نہ بن پڑا، واقعی اسے کیا۔ اس کی طرف سے وہ بھاڑ میں جائیں۔

"اب چلیے ۔۔ سرکار آپ کو بلاتی ہیں۔" وہ سراسر جھوٹ بول رہے تھے جب سے بڑی سرکار آئی تھیں، پل بھر کو بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھیں۔

"میں نہیں چلوں گی — میرے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں" اس نے متانت سے سر اٹھاتے ہوئے کہا — لیکن فوراً ہی اس کی نظریں جھک گئیں اور چہرے پر گلابی لہر دوڑ آئی — ان کے ہونٹ معنی خیز مسکراہٹ سے سکڑ گئے تھے اور وہ گھنی پلکوں والی آنکھیں گویا اس کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھیں — سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک۔

"تم اس وقت غسل خانے میں بھی ہوتیں تو میں تمہیں اسی طرح گھسیٹ کر لے جاتا" اور انھوں نے واقعی ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔ اور وہ بگلے کے پر کی طرح ان کے ساتھ اڑنے لگی۔

"چھوڑ دیجیے میرا ہاتھ" آدھے راستے تک جا کر اس نے دانتوں تلے کہا "میں خود چلی چلوں گی" اور آزر نواب نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"یہ تمہارے احساس کمتری کی سزا تھی" انھوں نے مسکرا کر کہا اور مصنوعی ادب سے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اس کی طرف مردوں کی مسحور اور عورتوں کی استفساریہ نظریں اٹھ رہی تھیں

" Miss Aiman Shahab, our General Assistant "

آزر نواب نے اسے آگے بڑھاتے ہوئے تعارف کرایا — ان کے لہجے میں جو مضحکے کا شائبہ تھا اسے صرف وہی محسوس کر پائی — سفید آرگینڈی کی ساری میں وہ یوں بھی مومی گڑیا سی لگ رہی تھی — اب اور بھی اس کا چہرہ تمتما گیا سب اس سے خوش اخلاقی سے ملے۔ جیسے وہ تعارف بالکل نارمل تعارف تھا۔

ایک مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر چپکائے اس نے آگے بڑھ جانا چاہا، لیکن اس کا بازو آزر نواب کی گرفت میں تھا اور وہ اسے جھولے کی طرف لے جا رہے تھے۔ جھولے پر بیٹھا وہ شعلہ انھیں ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ایمن وہاں جانا، اس سے ملنا ہرگز نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن ایسے ہی میں دور سے بڑی سرکار سے اس کی آنکھیں ملیں۔ وہ اپنے کسی نامناسب برتاؤ سے انھیں چونکانا نہیں چاہتی تھی اس لیے اندر ابلتا لاوا اور باہر شبنمی مسکراہٹ بنی وہ جھولے تک پہنچ گئی۔ آزر نواب غالباً اس لیے اسے لائے ہوں گے کہ اس لڑکی کی ہم عمر وہاں کوئی نہ تھی۔ ورنہ انھیں کیوں وہاں اس کی کمی محسوس ہوتی۔

"مس ریحانہ باجی ! یہ ایمن شہاب ہیں" ایمن منتظر رہی کہ آزر نواب اب ضرور کہیں گے "ہماری جنرل اسسٹنٹ" — مگر انھوں نے آگے کچھ نہیں کہا۔

ایمن، کیل کانٹے سے لیس اس حسین لڑکی کے ساتھ جس کی پلکیں تک مصنوعی تھیں، بیٹھی بہت

نامکمل محسوس کر رہی تھی۔ سادہ سفید، شانوں سے لپٹی ساری میں اس کا حسن بے حد ملکوتی اور پارسا لگ رہا تھا۔ کچن میں کام کرتے کرتے اس کا چہرہ یوں بھی دہک گیا تھا۔ اور آزر نواب کے خسروانہ برتاؤ نے اس کے خون کے دباؤ کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ ڈھیلے گوندھے ہوئے بالوں سے نکلی آزاد لٹ اس کے رخسار پر جھوم آئی تھی جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ آنکھوں کے سنہری پن میں برق کوندیں لے رہی تھی۔ آزر نواب کچھ دیر ادھ کھلی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھتے رہے۔ ایمن گوان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس کے اضطراب سے پوری طرح لطف لے رہے تھے۔ اس نے انھیں نظر انداز کر کے اپنی توجہ مینیجنگ فیلڈز کے مینجنگ ڈائرکٹر ریاض احمد کی بیٹی کی طرف مبذول کر لی۔

"آپ شاید یہاں نہیں رہتیں۔" ایمن نے برسبیل گفتگو پوچھا۔

"یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے۔" ریحانہ بولیں، "پچھلے سال جب میں یہاں آئی تھی تب تو آپ کا نشان بھی نہیں تھا۔" ریحانہ نے جس انداز سے یہ بات کہی اس نے سچ مچ ایمن کو اجنبیت کا احساس دلایا۔

"دراصل یہاں میرا دل نہیں لگتا۔"

"ڈانڈیلی میں؟ — اتنی خوب صورت جگہ ہے، آپ کو پسند نہیں؟" ایمن نے بات چیت کو آگے بڑھانے کی دوسری کوشش کی۔

"یہاں پسند آنے والی کیا بات ہے — یہ خاموش پہاڑ دیکھتے دیکھتے میں تنگ آجاتی ہوں۔"

ایمن نے سوچا یہ وادیاں سچ مچ گہری ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے نہیں بولتیں۔

"یہاں جب بھی آزر نواب ہوتے ہیں تو زندگی میں کچھ ہلچل آجاتی ہے۔"

"ضرور آتی ہوگی۔" ایمن نے دل میں سوچا۔

"لیکن آپ کے پاس بدیسی بھی کافی آتے رہتے ہیں نا — تنہائی تو محسوس نہیں ہوتی ہوگی؟" اس نے ریحانہ سے کہا۔

"ہاں کبھی کبھی آتے ہیں — لیکن زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس میرے لیے وقت نہیں ہوتا۔"

"لیکن اس بار تو شاید ایکس پرٹس میں کچھ کم عمر لوگ بھی آتے ہیں۔"

"ہاں وہ رابرٹ ہے۔" مس ریاض نے ایک نوجوان بدیسی کی طرف اشارہ کر کے کہا —

"لیکن وہ جب بھی ملتا ہے تو انگلینڈ میں اپنی منگیتر کی بات کرتا ہے ۔ میرے کان پک جاتے ہیں سنتے سنتے ۔"

"کیوں نہ ہم ملتے رہیں ؟ " ایمن نے دوستانہ رویہ اپنایا۔ "فرصت میں ہم دونوں ان پہاڑوں میں Trekking کے لیے چل سکتے ہیں ۔"

مس ریاض کی آنکھوں میں ناگواری جاگی "مجھے پہاڑوں میں بھاگ دوڑ بے مقصد لگتی ہے ۔"

اب ایمن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان سے اور کیا بات کرے ۔ ریحانہ کی نظریں برابر آزر نواب کا تعاقب کر رہی تھیں ، جو ایک گروپ میں کھڑے شاید کسی سنجیدہ مسئلے پر بات چیت کر رہے تھے ۔

ایمن معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ کھانا چننے کا وقت آگیا تھا ۔ مس ریاض دور تک اس کی جھولتی ہوئی لمبی چوٹی دیکھتی رہیں ، جو سفید ساری میں اس کی پشت پر اور بھی اجاگر ہو گئی تھی ۔

کچن میں جاتے جاتے اس نے برآمدے میں ٹیبل پر رکھے ہوئے رنگین SMC KED گلاس کو اٹھا لیا جو آزر نواب وہاں چھوڑ گئے تھے ۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی ۔ پھر نادانستہ وہ گلاس اس کی ناک تک پہنچ گیا ۔ اس نے زندگی میں کبھی شراب نہیں دیکھی تھی ۔ سونگھنا تو کجا ۔ لیکن اس کا تجسس خاک میں مل گیا جب گلاس اس کے اسکواش کی خوشبو آئی ۔ اس نے گلاس کو نظروں سے دور لے جا کر دیکھا ۔ کیا وہ قیمتی گلاس آزر نواب ہی کی طرح تھا جو دیکھنے والوں کی نظر کو باہر ہی روک دیتا تھا ۔ وہ بھی کیا بیکار باتیں سوچنے لگی ۔ بھلا آزر نواب کے شرابی ہونے یا نہ ہونے سے اسے کیا سروکار اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کسی نے اس کی یہ حرکت دیکھ تو نہیں لی ۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اس نے بچا ہوا اسکواش باکس میں پھینکا اور کچن میں چلی گئی ۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کھانے میں سب کے ساتھ شریک نہیں ہوگی ۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ پتا نہیں کھانا کیسا بنا ہو ۔ لیکن شمشاد کی مدد سے تیار کی گئی سبھی چیزیں غنیمت ہوں گی ۔ تبھی سب شوق سے کھا رہے تھے ۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لی تھی ۔

پھلوں کی باری جب آئی تو مہمانوں میں استعجاب کی ایک لہر دوڑ گئی ، کیونکہ جو پھل اس نے ڈرنٹ ووڈ کے ساتھ ٹیبل پر سجائے تھے وہ اصلی پھل نہیں بلکہ بادام کی مٹھائیاں تھیں ۔ خوش رنگ

اناناس، سیب، سنترے اور انگور جنھیں چابکدستی سے بنا کر کھانے والے رنگوں سے اس طرح رنگا گیا تھا کہ وہ بالکل اصلی معلوم ہو رہے تھے۔ ایمن کو ایسا لگا جیسے اس کی ساری محنت کا پھل مل گیا ہو ــــ ان ہی پھلوں کی تیاری پر اس نے سب سے زیادہ محنت کی تھی۔ ہائی لبکس کے پیچھے سے اپنی کامیابی کا منظر دیکھ رہی تھی۔

کھانے کا دور ختم ہوا۔ کچھ لوگوں نے کافی لی۔ کچھ نے انکار کیا۔

سب مہمان بڑی سرکار اور آزر نواب کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ جاتے ہوئے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے ایمن چونک پڑی۔ اس کو گویا کسی نے جھنجھوڑ کر نیند سے جگا دیا ـــ سب مہمان جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے اور کافی جا بھی چکے تھے۔ لیکن مس ریحانہ ریاض اسی طرح بیٹھی رہیں۔ بھاری بھرکم جسم کے ریاض صاحب ان کی طرف بڑھے، لیکن ان سے پہلے رابرٹ وہاں پہنچ گئے۔

"May I?" ـــــــ اس نے کہا اور نہایت آسانی سے مس ریاض کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور کار کی طرف لے چلا۔

ریحانہ کی دونوں ٹانگیں پولیو نے بیکار کر دی تھیں۔

ایمن کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر کھائی میں پھینک دیا ہو۔ شمشاد کے زور دینے پر بھی اس نے کچھ نہیں کھایا۔ اس کا دم سا گھٹنے لگا تھا۔ تازہ ہوا کی ضرورت محسوس کر کے وہ باہر نکل آئی۔ مہمان سب جا چکے تھے۔ خدمت گاروں نے سامان اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دیر تک ہوا میں ڈولتے ہوئے اس جھولے کو دیکھتی رہی جس پر سے ریحانہ اٹھ کر گئی تھیں۔

"ایمن بی بی، میں تمھارے صدقے۔ ذرا بڑے سرکار کو آپ دودھ دے دیو۔" شمشاد نے کہا۔ وہ بہت مصروف تھی۔

جب ایمن دودھ کا گلاس لیے بڑی سرکار کے کمرے میں پہنچی تو ٹھٹک گئی کیونکہ اندر آزر نواب بھی موجود تھے۔

"سرکار آپ نے تو مجھے چونکا دیا۔" آزر نواب کی آواز آئی، "کہاں تشریف لے گئی تھیں آپ تنہا؟"

"دھار واڑ ہسپتال چلے گئے تھے ہم۔" بڑی سرکار بولیں "بچارے خانساماں کی بیوی کے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا تھا۔"

"لیکن آپ اکیلی کیوں تشریف لے گئیں۔" آزر نواب بولے "وہ ـــ کیا نام ہے ـــ جو آپ

کی جنرل اسسٹنٹ ہیں ...."

امین اپنا ہونٹ چبا کر رہ گئی ۔ آزر نواب اس کی غیر حاضری میں بھی اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور جنرل اسسٹنٹ، اس کی چڑھ ہو گئی تھی ۔

"آزر نواب !۔" بڑی سرکار نے تہدید کی " تم اچھی طرح جانتے ہو، اس لڑکی کا نام 'امین' ہے ۔ مس شہاب، وہ بڑی سمجھدار لڑکی ہے ۔ اس کا مذاق مت اڑایا کرو ۔"

"میں دیکھ رہا ہوں وہ سرکار کو رفتہ رفتہ جیت رہی ہے ۔"

امین کو یوں چھپ کر باتیں سننا اچھا نہیں لگا ۔ وہ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہو گئی ۔ بڑی سرکار دیوان پر بیٹھی تھیں اور آزر نواب اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے ۔ وہ شاید امین کو ان ہی لوگوں میں سے ایک سمجھ رہے تھے جو کسی بہانے امرا کے گھرانوں میں اپنا راستہ بناتے ہیں اور باعزت طفیلیوں کی طرح زندگی گزار دیتے ہیں ۔

" سرکار، میرے خیال میں خانساماں انعام کا مستحق ہے" آزر نواب نے امین کو دیکھ کر بات بدلی " اپنی پریشانی کے باوجود اس نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ ہمارا اڈا نڈیلی کا خانساماں صرف مغلئی پکوان اچھا بنا سکتا تھا ۔"

بڑی سرکار امین کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ۔ " ہم نے ایک نیا خانساماں رکھا ہے" ۔ وہ بولیں ۔"

" واقعی ؟" آزر نواب نے ان کا مذاق نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے کہا ۔ " یہاں ۔ اس جنگل میں آپ کو کانٹی نینٹل پکوان کرنے والا خانساماں کیسے مل گیا ؟"

" یہ رہا ہمارا خانساماں ۔ آج امین بی بی نے کھانا بنایا تھا" بڑی سرکار بیٹے سے بولیں ۔

"Oh, You Mean Your General Assistant".

آزر نواب ٹہلتے ٹہلتے رک کر بولے ۔

" سرکار آپ بہت تھک گئی ہیں آج ۔" امین نے ان کی بات کو ان سنی کر کے مودبانہ دودھ کا گلاس بڑی سرکار کو پیش کر دیا ۔

" تم بھی تو بہت تھکی ہو گی آج ۔" بڑی سرکار نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا " کل تم آرام کرنا، ہم شمشاد سے کہہ دیں گے کہ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہ کرے ۔"

" وہ کچھ ... دفتر میں ..." امین نے کہا ۔

"سرکار نے اگر آپ کو چھٹی دی ہے تو ہماری کیا مجال کہ آپ کو کام سے باندھ رکھیں۔" آزر نواب نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ "اچھا سرکار، شب بخیر۔" آزر نواب نے جھک کر بڑی سرکار کا ماتھا چوما اور باہر نکل گئے۔

ایمن نے بڑی سرکار کے بستر سے بیڈ کور اٹھایا ۔ تکیے درست کیے اور خود بھی چلی آئی۔

چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیے ایمن اپنے بستر میں بیٹھی سوچتی رہی کہ آج فرصت کا دن کس طرح گزارا جائے ۔۔ سب سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ اگر باہر جاتے تو آزر نواب سے ٹکراؤ نہ ہو ۔ کیونکہ وہ اس کی طمانیت کو درہم برہم کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے ۔ اسی لیے اس نے طے کر لیا تھا کہ حتیٰ الامکان وہ ان کے سایے سے بھی دور رہے گی ۔ جو وقت دفتر میں ان کے ساتھ گزرتا تھا اسے سختی سے دفتری اصولوں کا پابند رکھے گی، کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی ان کی سادیت پسندی جوش میں آجاتی تھی اور نتیجے کے طور پر وہ ہر بار اسے کوئی گھاؤ دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے ۔ اتنے کم عرصے میں وہ ان کے ابروؤں کے تناؤ اور ہونٹوں کے طنزیہ خم کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔ کشادہ پیشانی پر گھنے بالوں کا خوب صورت جھکاؤ ۔۔ وہ ان بالوں کے پیچ وخم کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی آنکھوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبنا نہیں چاہتی تھی ۔۔ اسے ان سب باتوں کا ڈر تھا۔ خاص طور سے ان کا برتاؤ ریحانہ کے ساتھ دیکھ کر اس کا دل کانپ گیا تھا ۔ وہ کتنے سنگدل اور دل پھینک تھے ۔ وہ ریحانہ کی معذوری کے باوجود اس سے کھلا فلرٹ کر رہے تھے ۔ اس کے دلی جذبات سے کھیل رہے تھے ایمن کے دل میں آزر نواب کے لیے ڈر، نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات جاگے ۔۔ لیکن اسے کیا؟ وہ خود کیوں ان کے بارے میں اتنا سوچنے لگی تھی ۔ ریحانہ کوئی بچہ تو نہیں تھی جو آزر نواب کے کھیل کو نہ سمجھ سکے ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ اسے کیا؟

اس نے جلدی جلدی چائے ختم کی نہا کر اپنی نیلی پتلون اور جیکٹ چڑھائی پچھلی رات کی بچی ہوئی کچھ چیزیں فریج میں رکھی تھیں، ان سے سینڈوچ بنائے اور کافی سے تھرماس بھر لیا ۔ پھر چند سیب اپنے بیگ میں بھر لیے اور باہر نکل آئی ۔ وہ سب کے اٹھنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتی تھی ۔

گیٹ سے نکل کر وہ بائیں جانب سڑک پر مڑ گئی جو بازار کی طرف جاتی تھی ۔ وہ بے مقصد بڑھی جا رہی تھی ۔ اسے اچانک خیال آیا کہ ادھر ہی ندی پر پل کی دوسری جانب اس نے سینکچوری کا بورڈ لگا دیکھا تھا ۔ اپنی منزل مقرر کر کے وہ آگے بڑھی ۔ وہ جانتی تھی کہ فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کی گاڑیاں ادھر جاتی رہتی تھیں ۔ ان گاڑیوں میں درخواست کرنے پر بھی وہ سینکچوری دیکھنے کے شائق

لوگوں کو بھی جگہ دے دیتے تھے۔

بازار میں اکّا دکّا دکانیں اور ہوٹل کھل گئے تھے۔ ایمن آگے بڑھتی گئی۔ محکمہ جنگلات کی ایک اسٹیشن ویگن اس کے برابر سے گزر گئی۔ لیکن جب تک ایمن اسے روکے، وہ بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ ایمن کالی ندی کے پل سے گزر رہی تھی کہ ایک جیپ اور اس کے برابر سے نکل گئی۔ اسے مایوسی ہونے لگی۔ ایک تو اس کے پاس سینکچوری میں داخل ہونے کا پاس نہیں تھا، دوسرے وہ چوری چھپے چلی بھی جاتی تو اکیلی وہاں جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ واپس چلی جائے۔ کیونکہ اس کے لیے سینکچوری میں داخل ہونے کی ایک ہی صورت تھی کہ فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کی کوئی گاڑی اسے ساتھ لے چلنے پر راضی ہو جائے، اور ان کی دو گاڑیاں گزر چکی تھیں۔ جنھوں نے یا تو اسے دیکھا نہیں یا اس کی آواز سنی بھی ہو تو نظر انداز کر گئے۔ وہ پلٹ گئی، کیونکہ تیسری جیپ بھی اس کے سگنل پر رکے بغیر چلی گئی۔ وہ پلٹ کر جانے ہی والی تھی کہ رک گئی کیونکہ کچھ دور جاکر وہ جیپ رک گئی تھی اور اب وہ پیچھے آرہی تھی۔ ایمن کی کچھ امید بندھی اور وہ رک کر اس جیپ کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگی۔

ڈرائیور نے جیپ اس کے برابر لاکر روک دی۔ اور اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے اسے گھورنے لگا۔ وہ اس ڈرائیور کو دیکھ کر سناٹے میں آگئی کیونکہ یہ وہی شخص تھا جس سے وہ کم سے کم رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔ آزر نواب نے اپنا ہنٹنگ والا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ بت بنی کھڑی ہو گئی۔ اور آزر نواب کی بھی شاید ضد تھی کہ وہی پہلے بولے۔ انھیں اسے دیکھ کر حیرت ہوئی بھی ہو گی تو اس کا کوئی ثبوت ان کے چہرے پر نہیں تھا۔

جب دیر تک وہ کچھ نہیں بولی تو انھوں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں روکا تھا مجھے؟"

"نہیں کچھ نہیں . . . آپ کو دھوکا ہوا۔" ایمن نے بوکھلا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" آزر نواب بولے "سنتے میں جنگل کی طرف جاتی ہوئی بلیں راستہ روکتی ہیں۔" اور جیپ اسٹارٹ کرنے لگے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے انھوں نے ایک دانستہ شرارتی نظر اس پر ڈالی۔

ایمن کا جی چاہا کہ ہینڈ بیگ پھینک کر ان پر دے مارے۔

"سنیے!" — ایمن چلائی۔ وہ سینکچوری دیکھنے کا اکلوتا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا نہیں چاہتی تھی۔ آزر نواب رک گئے لیکن انجن بند نہیں کیا۔

"مجھے بھی سینکچوری جانا ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"تو شوق سے جائیے ــــ وہ رہی سینکوپری" آزر نواب نے پتا بتانے میں مدد کی اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے آگے بڑھ گئے۔

ایمن نے اب سوچ لیا کہ اب مزید خود کو ذلیل نہیں کرے گی۔ بھاڑ میں گئی ایسی سینکوپری لیکن اس کا دل بوجھل بھی ہو گیا تھا، کیونکہ سویرے سویرے ہی سارا دن ستیاناس ہو گیا تھا ــــ اس نے سوچا تھا کہ فرصت کے حاصل ان لمحوں کو ہر بندھن اور بندش سے آزاد کھلی فضا میں گزار دے گی۔ جیسے کبھی وہ اپنے والد کی زندگی میں کیا کرتی تھی ــــ اور اب سارے ارادوں پر پانی پھر گیا تھا وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹی حالانکہ آنے سے پہلے اس نے شمشاد سے کہہ دیا تھا کہ وہ فکر نہ کرے اسے واپس آنے میں دیر ہو جائے گی۔ وہ چند ہی قدم واپس ہوئی ہو گی کہ جیپ دوبارہ اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

"چڑھ آیئے مس ایمن شہاب" آزر نواب بولے۔

"نہیں . . . مجھے نہیں جانا ہے"

وہ کچھ دیر اپنے دستانوں والے ہاتھ اسٹیرنگ وھیل پر رکھے اسے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ جب وہ جانے لگی تو بے صبری سے بولے۔

"سیدھی طرح چڑھ آتی ہیں آپ یا مجھے خود آپ کو اٹھا کر جیپ میں ڈالنا پڑے گا" ــــ اور وہ جیپ روک کے واقعی اترنے لگے۔

ایمن گھبرا گئی ــــ وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ پل پر کام کرنے والے مزدور اپنا کام روکے اب دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھنے لگے تھے وہ خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔ اسے غصہ آرہا تھا ــــ بہت غصہ ــــ لیکن دل کی سو دھڑکنوں میں ایک پھڑک خوشی کی بھی تھی جس سے وہ مسلسل انکار کرنا چاہتی تھی اور نہیں کر پا رہی تھی۔ اب جب وہ بیٹھ ہی گئی تھی تو منہ پھلا کر بیٹھنا بیکار تھا۔

"مجھے سینکوپری دیکھنے کا بڑا شوق تھا" ایمن نے ہمت کر کے سکوت توڑا۔

"بہت سوں کو ہوتا ہے" ــــ آزر نواب نے کٹا ہوا سا جواب دیا اور وہ جیپ میں بیٹھ کر پچھتائی "لیکن ہر کوئی یوں کسی کے راستے کا روڑا تو نہیں بن جاتا"

ایمن چونکی "تو کیا . . . تو کیا، آپ سینکوپری نہیں جا رہے تھے؟" اس نے مجرم بن کر پوچھا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ جو بھی ادھر سے جائے سینکوپری ہی جاتے ہیں؟" انھوں نے اس کے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا ــــ ایمن بھول ہی گئی تھی کہ وہی راستہ موڑ سے ٹمبر فیکٹری کی طرف بھی جاتا تھا

"لیکن اتنے سویرے، ٹمبر فیکٹری ...." اسے اچنبھا ہوا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے ٹمبر فیکٹری ہی جانا تھا"
ایمن زچ ہو کر خاموش بیٹھ گئی ــــ وہ گوکھرو کے کانٹے تھے جدھر مڑا ادھر سیدھے ــــ
"بیگ میں کیا ہے؟" کچھ دیر بعد آزر نواب نے اس کی نروس ٹٹولتی ہوئی انگلیوں کو دیکھ کر پوچھا۔
"کافی، سینڈوچ اور پھل" ایمن نے بھی مختصر جواب دیا۔
"چلو یہ بھی اچھا ہوا" آزر نواب نے اطمینان سے کہا "میں اپنے ساتھ آئس بکس میں کوک کی بوتلیں لے آیا ہوں"
"جب انھیں کہیں نہیں جانا تھا تو جیپ میں آئس بکس کیوں لے آئے تھے؟" ایمن نے سوچا، لیکن اس نے خاموش رہنے میں ہی خیریت دیکھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ آزر نواب جب اپنے گھوڑے قلزم پر صبح کی رائڈنگ کے لیے نکلے تو سائیس نے انھیں خبر دی تھی کہ بڑی سرکار کے ہمراہ شہر سے آئی میم صاحب ابھی ابھی باہر گئی تھیں۔ آزر نواب کی جبیں شکن آلود ہوگئی تھی۔ ڈانڈیلی لاکھ چھوٹی جگہ سہی لیکن اتنا سویرے اکیلی لڑکی کا سنسان جگہوں پر پہنچ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا جہاں بھانت بھانت کے لوگ کام کی تلاش میں آتے رہتے تھے۔ انھوں نے رکاب میں رکھتے رکھتے پاؤں نکال لیا۔ قلزم کو واپس اصطبل بھجوا کر خود جیپ لے کر باہر نکل آئے تھے۔ ایمن کو انھیں بالکل ڈھونڈنا نہیں پڑا۔

جیپ سینکچویری کی حد میں داخل ہوگئی، لیکن جنگل کا یہ بڑا حصہ کافی چھدرا تھا۔ درمیانی سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں بانس کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے جن کے آگے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔

"چند ہی دن پہلے یہاں سے بھیڑیا ایک بچے کو اٹھا لے گیا تھا"
ایمن کے حلق میں کوئی چیز اٹکی "پھر یہ لوگ یہاں کیوں رہتے ہیں۔ یہاں خطرہ ہے"
آزر نواب طنز سے ہنسے "ایمن بی بی، ہر کسی کو اتنی آسانی سے جنرل اسسٹنٹ کی پوسٹ نہیں مل جاتی"

ایمن خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ جہاں تک ہوسکے وہ ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دینے کی کوشش تو کر رہی تھی۔ آزر نواب اور کیا چاہتے تھے؟ اگر وہ یا بڑی سرکار اس کے کام سے مطمئن نہیں تھے تو وہ اسے ہٹانے کے لیے کہہ سکتے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں کوئی موزوں جواب ترتیب دے رہی تھی کہ جھاڑیوں میں بھاگتے خرگوش نے اس کی تمام تر توجہ اپنی

طرف مبذول کرلی۔
"ابھی جنگل کے اس بیرونی حصے میں معصوم جانور ہی ملیں گے۔"
"لیکن یہاں کا قدرتی حسن انسان کے تکلف سے بنائے ہوئے باغوں سے اچھا ہے ۔۔۔" ایمن نے ارد گرد کا جائزہ دے کر کہا۔
"ہاں کیوں نہیں"
"کبھی جب رات میں تنہا اندرونی گھنے جنگل میں پھنس جائیے گا تو جنگل آپ کو اتنا خوب صورت نہیں معلوم ہوگا۔" آزر نواب نے رکی ہوئی جیپ پھر اسٹارٹ کی" البتہ یہاں کے شیر اور چیتوں کے لیے ایک حسین اور لذیذ ڈنر کا انتظام ضرور ہو جائے گا۔"
ایمن کچھ سہم گئی، لیکن وہ بھی کوئی بچّہ نہیں تھی جسے آزر نواب شیر اور چیتے کا نام لے کر ڈرائیں۔
اس نے جیپ سے باہر دیکھتے ہوئے کہا" میں جنگل کے شیروں اور چیتوں سے نہیں ڈرتی ۔۔۔ میں نے شہروں کے بڑے بڑے چیتے دیکھے ہیں۔
"واقعی!" ۔۔۔ آزر نواب نے حد سے بڑھی ہوئی حیرت ظاہر کی "کیا کہا تھا ان چیتوں نے آپ سے؟ ۔۔۔ "Hello Colden Eyes?" ۔۔۔ انھوں نے ایسے کہا جیسے کسی چار سال بچّی سے مخاطب ہوں۔
"آدم خور، ایکدم حملہ کرتے ہیں ۔۔۔ وہ سلام دکلام میں یقین نہیں رکھتے ۔۔۔" ایمن نے بھنا کر کہا۔
"یہ ان کے عملی ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کا انحصار کچھ نوالے پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان کی بھوک بڑھاتا ہے ۔۔۔" آزر نواب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔
وہ اس ذومعنی گفتگو میں پھنسنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن اس سے رہا نہیں گیا۔ "آدم خور اتنے چھانٹنے والے کہاں ہوتے ہیں۔ جو آن کے راستے آتے، ان کا نوالہ بن جاتا ہے۔"
آزر نواب نے جیپ روک لی۔ ایک ہاتھ ایمن کی سیٹ کی پشت پر رکھے پوچھا "مثلاً"؟۔
ان کی آواز میں ایسی دھمکی تھی جس نے ایمن کے غصے کو بھی ابھار دیا۔ وہ مس ریاض کے ساتھ جو کھیل کر رہے تھے اسے ایمن معاف نہیں کر سکتی تھی۔
"مثلاً ۔۔۔ آپ خود" ۔۔۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہہ ہی دیا۔

وہ کچھ دیر اسے چپ چاپ دیکھا کیے ۔ پھر خلاف توقع انھوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے
" پتا نہیں تم میرے کس شکار کی بات کر رہی ہو" ؟
" آپ کے شکار کا ریکارڈ رکھنا میری ذمہ داریوں میں سے نہیں ہے " ۔ ایمن بولی " میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ بہت سنگدل اور بے پروا انسان ہیں ۔۔ جیسے سب رئیس ہوتے ہیں " ۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ آج اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لے گی ۔
" تو آپ کے خیال میں، ہر رئیس کا عیاش اور ظالم ہونا ضروری ہے ؟ "
" یہی تو لوازم ہیں رئیسوں کے " ۔ ایمن نے بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ۔۔ اپنے یقین کا اظہار کر ہی دیا ۔
" اور چونکہ میں بھی آپ کے خیال میں ایک امیر و کبیر شخص ہوں اس لیے لازماً، عیاش، سنگدل اور بے پروا ہوں " ۔
ایمن نے ان کو جھٹلائے بغیر اپنا سر موڑ لیا ۔
" میرا یہ تعارف بشارت نواب نے کرایا ہوگا ؟ " آزر نواب مسکرا کر بولے ۔
" جس کسی نے بھی کرایا ہو ۔۔ رائے میری اپنی ہے " ۔
" چلو مان لیا ۔۔۔ بشارت نواب کہتے ہیں تو پھر جھوٹ نہ کہتے ہوں گے لیکن آپ نے کس وجہ سے اس بات پر یقین کر لیا ؟ "
ایمن کی زبان بند ہوگئی ۔ وہ کچھ دیر کشمکش میں رہی کہ کہے یا نہ کہے کیونکہ یہ آزر نواب کا نجی معاملہ تھا اور وہ ان کے کردار کے ذمہ دار نہیں ہو سکتی تھی ۔ لیکن بات اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ اب چپ رہنا بیکار تھا ۔ اس نے تقریباً التجا بھرے لہجے میں کہا ۔
" آپ کو بس ریاض پہ رحم نہیں آتا ؟ "
آزر نواب نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ دیے اور سامنے گھورتے ہوئے بولے " میں رحم بہت کم کھایا کرتا ہوں ۔۔۔ کیوں کہ یہ وہ عمل ہے جو کسی بھی خوددار انسان کا دل دکھا جاتا ہے ۔۔۔ اور میرے خیال میں ہر انسان تھوڑا بہت خوددار ضرور ہوتا ہے ۔۔ میں رحم کا مستحق صرف جانوروں کو سمجھتا ہوں " ۔
" پھر یہ ہر سال جو آپ حاجتمندوں میں کپڑے تقسیم کرتے ہیں یتیم خانوں کو چندے دیتے ہیں ! "

"یہ ان کا حق ہے۔" آزر نواب نے بے چین ہو کر اس کی بات کاٹی" میں ان کو ان کا حق دیتا ہوں، ان پر احسان نہیں کرتا۔"

"پھر بھی آپ کے آباؤاجداد نے جو دولت جمع کی وہ کسی کا حق مار کر ہی تو جمع کی ہوگی"۔ ایمن نے کہا۔
کامریڈ میں اپنے آباؤاجداد کی حرکتوں کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا"۔ آزر نواب اس کے اظہار کی شدت کا لطف لیتے ہوتے بولے۔"نہ ہاتھ آئی دولت کو لٹا کر خود بھیک کا کٹورا لیے سڑکوں پر نکل سکتا ہوں۔ میں دولت کے صحیح استعمال کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ جس سے میرا بھی فائدہ ہو اور سماج کا بھی۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں نکموں اور کام چوروں پر اپنی دولت کیوں نہیں لٹا دیتا تو آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ جنرل اسسٹنٹ صاحبہ آپ نے بھی اپنا مصرف ثابت نہ کیا ہوتا تو آج نہ آپ یہاں ہوتیں نہ مجھے امیر ہونے کے طعنے سننے پڑتے۔"
ایمن چپ ہو گئی۔
"اب اگر آپ چاہیں تو میں انکم ٹیکس کی رپورٹ بھی آپ کے حضور پیش کر دوں۔"
ایمن پچھتا رہی تھی۔ اس نے آزر نواب کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اسے خود اپنی حد تک رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا تعجب یہ تھا کہ آزر نواب نے اس کی بات کا برا نہیں مانا تھا۔
"اب اجازت ہو تو آگے بڑھوں؟" آزر نواب نے اسے خاموش دیکھ کر اسٹارٹ دبایا۔
سورج چڑھتا جا رہا تھا لیکن ساتھ ہی پیڑوں کے سایے گنجان ہوتے جا رہے تھے۔ ایک سبز مخملی سا سناٹا تھا، جس میں کبھی کبھی کسی چڑیا یا جانور کی آواز کان کو چھو جاتی تھی۔ اچانک آزر نواب نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ ایمن نے چونک کر انھیں دیکھا تو انھوں نے لبوں پر انگلی رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ دم سادھے، کچی سڑک کی بائیں طرف دیکھنے لگی، جدھر آزر نواب انگلی سے اشارہ کر رہے تھے۔ وہاں جانوروں کا ایک جھنڈ سا تھا جن کے صرف پیر نظر آ رہے تھے۔ ان کا باقی جسم جھاڑیوں اور درختوں کے بڑے بڑے پتوں میں چھپا تھا۔ وہ سارے ہی پیر سفید تھے۔ جیسے سب نے ہی سفید جرابیں پہن رکھی تھیں۔ وہ جھنڈ آگے بڑھا۔

"بائسن یہ..... یہ ارنا بھینسوں کا جھنڈ ہے"۔ آزر نواب نے سرگوشی کی۔" انھیں اگر چھیڑا نہ جائے تو یہ بالکل خطرناک نہیں ہوتے۔ اگر غصہ دلایا جائے تو ان میں کا ایک بھینسا ہماری جیپ کو تنکے کی طرح ہوا میں اچھالنے کے لیے کافی ہے۔"
ایمن نے غور سے ادھر دیکھا۔ سیاہ چٹان جیسے قیم تحیم بھینسے تلاش رزق میں گروہ بنا کر ہی پھرتے رہتے ہیں

پہلے تو یہ خود ہی انسان کی پروا نہیں کرتے اور ذرا سی آواز پر ہی بہت دور چلے جاتے ہیں، لیکن کبھی ان کا سامنا ہو بھی جائے تو ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی جاتی ہے اور یہ آہستہ آہستہ میدان چھوڑ دیتے ہیں۔

شاید بھینسوں کے اس جھنڈ نے ان کی آہٹ پالی تھی۔ وہ سڑک سے مزید دور ہونے لگے تھے۔

آزر نواب نے جیپ اسٹارٹ کی اور وہ آگے بڑھے۔

"ابھی کچھ دن پہلے یہاں بدیسیوں کی ایک ٹیم آئی تھی، وہ اپنے کیمرے ساتھ لائے تھے۔ کسی غافل کا کیمرہ ایک بندر لے اڑا۔"

"پھر کیا ہوا؟" امین نے بچّوں کی سی دلچسپی ظاہر کی۔

"پھر کیا ہوتا؟ اس بندر نے اپنی فلم کمپنی کھول لی ہوگی۔" آزر نواب اس کے خروش پر ہنس پڑے۔ اتنی سادگی سے ہنستے ہوئے امین نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں کے کنارے پر لکیریں سی ابھر آئی تھیں اور خوش نما ہونٹ، نرم سی مسکراہٹ میں پھیل گئے تھے۔ امین نے دیکھا ان کے دانت آبدار موتیوں کی طرح تھے۔ ایسے میں وہ بالکل خطرناک اور خود پرست نہیں لگ رہے تھے۔ وہ صاف بڑی سرکار کے بیٹے نظر آئے۔

امین ان کی شخصیت میں اپنی دلچسپی پر خود ہی چونک پڑی۔ لیکن یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا جب اس نے ان کی چھوٹی چھوٹی حرکات و سکنات کا مطالعہ کیا تھا، ان کے بارے میں تنہائی میں اس وقت تک نہ سوچا تھا جب تک اس نے خود ہی جھلّا کر اپنے آپ کو ٹوک نہیں دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا تھا کہ وہ صرف ان ہی کے بارے میں تو نہیں سوچتی — بشارت نواب بڑی سرکار اور منشی صاحب کے بارے میں بھی تو سوچتی ہے۔ اس نے آزر نواب کی جاذبیت سے منشی صاحب کا موازنہ کیا اور اسے ہنسی آگئی۔ خاص طور سے منشی صاحب خفا ہوتے تھے تو ان کی شاعری کا ذکر ہی انھیں ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ اور وہ خفا اکثر تسنیم پاشا پر ہوتے تھے۔ انھیں تسنیم پاشا کے اطوار بالکل پسند نہیں تھے۔ لیکن وفادار خادم تھے۔ مالکوں سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے اپنے غصّے کا بخار امین کے سامنے نکال لیتے تھے۔

آزر نواب نے ایک دم بریک لگائے اور وہ اچھل پڑی۔ اس کا ماتھا جا کر شیشے سے ٹکرا گیا۔

"کہاں کھو گئی تھیں؟"۔۔۔ آزر نواب نے بغیر تاسف کے پوچھا۔
"میں منشی صاحب کے بارے میں سوچ رہی تھی"۔ ایمن نے ماتھا ملتے ہوئے سچی سچی بات بتادی۔
"ماتھا پھڑوا دیا ہوتا منشی صاحب نے ابھی ۔ کم سوچا کرو اُن کے بارے میں"، آزر نواب اسٹیرنگ پر کہنی ٹکاتے بولے۔
"ماتھا تو آپ نے زخمی کر دیا ہوتا، منشی صاحب نے نہیں" وہ قدرے بھنا کر بولی۔
"دیکھوں؟" آزر نواب نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر پلٹا دیا۔ جیسے کوئی ڈھکن کھول رہے ہوں ۔۔۔ ایمن کی ان سے آنکھیں ملیں اور نظر جم کر رہ گئی ۔ آزر نواب اس کی پیشانی کی بجائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے ۔ جو چوٹ کی وجہ سے نمناک ہو گئی تھیں ۔ نہیں، وہ مسکرا نہیں رہے تھے ۔ یہ اس کا وہم تھا ۔۔۔ وہ آنکھیں خاموش بھی نہیں تھیں، لیکن کیا کہہ رہی تھیں وہ؟ ان کی اتھاہ گہرائی میں اترنا ایمن کی ہمت سے باہر تھا۔
"بجائے میرے کسی اور کے بارے میں سوچو گی تو یہی ہو گا"۔۔۔ آزر نواب نے بہت دھیرے سے کہا۔ ایمن بر وقت جاگ پڑی اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر الگ کر لیا۔
"مجھے اور بھی بہتیرے کام ہیں ۔ میں آپ کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی"۔۔۔
"کبھی نہیں؟"۔۔۔ آزر نواب شرارت سے جھک کر بولے۔
"کبھی نہیں"۔۔۔ اپنے لہجے کی تھرتھراہٹ پر اسے غصہ آیا اور اس نے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیا ۔۔۔ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی ۔ اس لیے ان سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی ۔۔۔ کوشش کے باوجود اس کے خیالات میں آزر نواب کا تانا بانا بڑھتا جا رہا تھا ۔۔۔ کیا ہو گا جب تخیل کی یہ چادر مکمل ہو جائے گی؟ وہ کبھی ڈر کر سوچتی وہی چادر کہیں اس کا کفن نہ بن جائے ۔ اور اسی احساس سے وہ ڈرتی تھی ۔ وہ خود سوزی کی موت مرنا نہیں چاہتی تھی ۔ اور آزر نواب سے محبت کرنا یک طرفہ راستہ تھا جو صرف بربادی کی طرف لے جاتا تھا ۔۔۔ اس کی دنیا ان کی کائنات سے بہت مختلف تھی ۔۔ وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی ۔۔ پھر بھی ۔ ۔ ۔
"بھوک لگی ہے"۔۔۔ آزر نواب نے گھڑی دیکھی ۔ ڈھائی بج رہے تھے انھوں نے گیارہ بجے کافی لی تھی، جب جنگل کے گھنے سایوں سے نکل کر وہ ایک میدان سے گزر رہے تھے ۔ وہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں بے شمار کنول کے پھول کھلے تھے جن کی وجہ سے سارا ماحول پاکیزہ ہو رہا

تھا۔

"پھولوں میں سب سے متبرک کنول ہی تو ہے"۔ آزر نواب نے کنارے پر جھک کر دو کنول کے پھول نکال کر امین کو دیے۔ "پرانوں کے مطابق برہما ایک ایسے کنول کے پھول سے نکلے تھے جو وشنو کی ناف سے پیدا ہوا تھا۔ دولت اور خوش حالی کی دیوی لکشمی کنول کے پھول پر کھڑی دکھائی دیتی ہے"۔ آزر نواب نے امین کو کنول کی متبرک اہمیت بتاتے ہوئے کہا۔ "پھول کا روز کھلنا سورج سے اس کے عشق کا راز ہے۔ اسی لیے اسے سوریہ وکاسی بھی تو کہتے ہیں۔ موہنجو دارو کے زمانے میں کنول کے پھولوں کا ہار سورج دیوتا کے سر کے گرد لپیٹا جاتا تھا ——— اور کیا اب آپ اکیلے ہی کافی پی لیں گی ؟" انھوں نے اسی لہجے میں اپنا شبہ ظاہر کیا اور امین نے ہنس کر ان کا مگ آگے بڑھا دیا ——— ہرنوں کی ایک ڈار ——— تالاب کی دوسری طرف چوکڑیاں بھرتی غائب ہوگئی۔

دنیوی تہذیب اور سماج کی بندشوں سے دور جب انسان اسی طرح کے ماحول میں رہتا ہوگا تو اس کے مسائل کیا ہوں گے ؟ ۔ امین نے سوچا، کیا اس انسان نے کبھی محبت کی ہوگی ؟ نفرت کی ہوگی ؟ اگر محبت کی ہوگی تو کیا کبھی اپنے محبوب کے لیے جان دی ہوگی ؟ اگر اس نے آنسو بہائے ہوں گے تو کس کے لیے ؟ یا پھر صرف جسمانی درد اور تکلیف کے احساس نے ہی اس کی آنکھیں نم کی ہوں گی ؟

"گو یہاں کوئی آدم خور نہیں ہے"۔ آزر نواب نے انگوٹھے سے خود کی طرف اشارہ کیا۔ "سوائے میرے۔ لیکن جنگل کے اس حصے میں ہمارا راتز کرستا نا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ آس پاس کہیں بھی ہم سے سیاہ چیتے کی ملاقات ہوسکتی ہے"۔

"سیاہ چیتے تو اب ہندستان میں بہت کم رہ گئے ہیں"۔ امین نے پیچھے سے ہیورسیک نکالتے ہوئے کہا "میں نے کبھی نہیں دیکھا"۔

"آج ہوسکتا ہے نظر آجائے۔ آج کا دن کامیاب دن ہے، کیونکہ ہمیں بہت سے جانور نظر آچکے ہیں، ورنہ کسی کسی دن سخت بوریت ہوتی ہے۔ ایک خرگوش تک نظر نہیں آتا"۔

"ارے میں تو سمجھتی تھی کہ سینکچویری میں ہر وقت ہی سب ہی جانور نظر آتے ہوں گے"۔ امین بولی۔

"امین بی بی، سرکس کے ایرینا اور قدرتی سینکچویری میں بہت بڑا فرق ہے ——— یہاں جانوروں کی اپنی مرضی چلتی ہے۔ وہ کوڑوں کی آواز پر نہیں ناچتے"۔

آزر نواب نے آئس باکس سے کوک نکال کر کھولے اور امین نے تھیلے سے سینڈوچ کا

ڈبا نکالا۔

''سینڈوچ اچھے ہیں، لیکن ان کی Filling میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے''۔ آزر نواب غور کرتے ہوئے بولے۔

ایمن ہنس پڑی "کل کی پارٹی کی بچی ہوئی سبھی چیزوں کا مسکچر ہے" ایمن سیب نکالتی ہوئی بولی۔

''اوہ'' Adulteration جانتی ہیں آپ ملاوٹ کرنا جرم ہے" آزر نواب بولے"اور یہ سیب" انھوں نے ایمن کا بڑھایا ہوا خوش رنگ سیب قبول کرتے ہوئے کہا" ہزاروں سال پہلے اماں حوّا نے اسے کھلا کر بابا آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔ آپ مجھے کہاں سے کہاں پہنچا رہی ہیں؟"

ایمن ہنس پڑی ـــ "خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں"

آزر نواب کچھ دیر اسے نظروں سے تولتے رہے "خواب ـــ کیا تم خود، خواب اور سچائی میں فرق محسوس کر سکتی ہو؟"

''ہاں'' ایمن نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

"لیکن پھر بھی تم خواب دیکھتی ہو!" آزر نواب نے مسکرا کر کہا۔

"صرف حقیقت کی دنیا میں واپس آنے کے لیے" وہ سامان سمیٹتے ہوئے بولی۔

How Unromantic آزر نواب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ شاید اسے چھیڑ رہے تھے۔

"But how practical" ایمن نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا" جب خواب، خواب ہی رہتے ہیں تو خود کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟"

"لیکن کچھ خواب حقیقت بھی تو بن سکتے ہیں" آزر نواب بولے۔

"جو حقیقت بن جائے وہ خواب نہیں رہتا"

"یہ تو خواب دیکھنے والے پر منحصر ہوتا ہے ـــ معصوم لیکن فی الحال فلسفی ایمن، میں اگر چاہوں تو اپنے خواب کو حقیقت بنا لیتا ہوں"

''آپ جس مقام پر ہیں نواب صاحب" ایمن نے تنک کر کہا" وہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ پتا نہیں آئے دن کتنے خواب آپ کی طرح کے سرمایہ داروں کی خواب گاہوں میں دم توڑتے ہوں گے'' اس نے گھسا پٹا جملہ کہا، لیکن وہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا چنانچہ اس کا اثر بھی ہوا۔ آزر نواب کے مسکراتے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے سیب گرا دیا اور

اس کی کلائی کو اپنی سخت گرفت میں لے کر کہا۔ "مجھ سے ٹکر لینے کی کوشش مت کرو ایمن بی بی میں تمھیں پھر سمجھاتا ہوں ۔ مجھے کلائی مروڑنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا آتا ہے"

ایمن منہ سے کچھ نہ بول سکی ۔ کلائی کے اس درد کی، نظر کی اس برائی کی وہ خود ذمہ دار تھی ۔ اس نے آنکھوں میں درد سے ابلتے آنسوؤں کو پی کر صرف سر ہلا دیا اور آزر نواب نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

"چلو اب آگے بڑھیں" ۔ آزر نواب نے بچا ہوا کوک ایک گھونٹ میں ختم کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ کتنی آسانی سے اس کے ساتھ "آپ" سے "تم" کی سطح پر آجاتے تھے جبکہ وہ دیر تک ان کے برتاؤ کے تضاد کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہتی تھی۔

"ہمیں کچھ اور ملاقاتیں کرنی ہیں ۔ پھر تمہیں ایک ایسی جگہ لے جائیں گے جس کے بارے میں تم نے سنا بھی نہ ہوگا" اور پھر وہ جیپ میں آ بیٹھے ۔ وہ دن واقعی اچھا تھا ۔ انھیں سیکوریری میں بہت سے جانور نظر آگئے جو اپنے آزاد ماحول میں مست تھے۔

گھنے سایہ دار درختوں کے بیچوں بیچ ایک پتلے سے راستے پر ان کی جیپ سست رفتاری سے رینگتی رہی۔ نیچے زمین گیلی اور نرم تھی اور درختوں کے سائے سیاہی مائل سبز ۔ ہر طرف نباتات کی مخصوص مہک تھی جس میں کبھی کبھی ایک جھونکا خوشبو کا بھی آجاتا ۔ کچھ دیر سے چھوٹے موٹے جانور بالکل نظر نہیں آتے تھے۔

"یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اس علاقے میں کوئی شیر یا چیتا ضرور ہوگا" لیکن کوشش کے باوجود جنگل پر زیادہ حاوی ان درندوں کا کوئی نشان نہیں ملا ۔ حتیٰ کہ وہ لوگ تن آور پیڑوں کے اس گنجان علاقے سے باہر نکل آئے ۔ یہ میدان نما علاقہ تھا جہاں سیکڑوں پیڑوں کے کٹے ہوئے تنے نظر آرہے تھے ۔ لیکن ساتھ ساتھ وہیں نئے پودے بھی لگائے گئے تھے ۔

"نیلام کے جتنے پیڑ کاٹے جاتے ہیں اتنے ہی پہلے سے لگا دیے جاتے ہیں ۔ ورنہ یہ جنگل تو دو دن میں صاف ہو جائیں"

"لیکن یہ پودے جو اب لگائے گئے ہیں ۔ کتنے دنوں میں کاٹنے کے قابل ہو جائیں گے؟" ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

"کتنے دن نہیں کتنے سال کہو ۔ ساگوان کے پیڑ تیس سال میں کاٹنے کے قابل ہوتے ہیں ۔ لیکن بعض غیر ذمہ دار لوگ بہت چھوٹے پیڑوں کو بھی کاٹ لے جاتے ہیں"

"یعنی چور؟" ـــــ ایمن نے کہا۔

"ہاں، ساگوان کا ایک ٹرک تیس ہزار میں بکتا ہے جس کے دام اب بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔"
"تو یہ فارسٹ گارڈ کیا کرتے ہیں — ان چوروں کو پکڑتے کیوں نہیں؟"
"ان چوروں کی طرف سے منہ پھیر لینے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔ ورنہ غریبوں کی نوکری چوپٹ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ افسر یہ برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ان کی رشوت کے درپے ہو جائے۔" آزر نواب بولے۔

اب جیپ قدرے تیزی سے آگے چڑھاؤ پر بڑھ رہی تھی۔ سیدھی جانب کافی فاصلے پر سربلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ عجیب پُرفضا مقام تھا۔ جھٹپٹے میں اس جگہ کی دل آویزی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہیں لکڑی کے ایک بورڈ کے پاس آزر نواب نے جیپ روک دی۔ بورڈ پر لکھا تھا۔

" SYKES POINT "

"یہی وہ جگہ ہے جو میں تمہیں دکھانا چاہتا تھا" آزر نواب اترتے ہوئے بولے — ساتھ ہی ایمن بھی اتر آئی۔

آگے دلکش پیڑوں کے ایک جھنڈ کے پاس ہی ایک چھتری نما چوبی سمر ہاؤس بنا تھا اور اس کے قریب ہی لکڑی کا بہت اونچا مچان تھا جس پر پہنچنے والی سیڑھیاں بھی چوبی تھیں۔

"یہ یہاں کا سب سے اونچا مقام ہے۔" آزر نواب سیڑھیاں پار کرتے ہوئے بولے "یہاں کے ایک انگریز گورنر کرنل سائکس نے اسے دریافت کیا تھا جس کے نام پر اسے سائکس پوائنٹ، نام دیا گیا۔ وہ یہاں شکار کرتا ہوا پہنچا تھا۔ اور اس جگہ کی خوبصورتی میں ڈوب گیا تھا۔"

ایمن خود بھی اس جگہ کی خوبصورتی اور سحر میں کھوئی کھوئی آزر نواب کے پیچھے پیچھے چڑھ آئی تھی۔ ان کی بلندی سے مخالف پہاڑوں کی بلندی کے درمیان، ہزاروں فٹ گہری وادی میں بہتی ندی سانپ کی طرح نظر آ رہی تھی جو دونوں طرف بڑی چٹانوں کے بیچ کسی دوشیزہ کی پتلی کمر کی طرح تھی۔

"یہ کالی ندی ہے،" آزر نواب نے اس کی آنکھوں سے دوربین لگاتے ہوئے کہا "یہ کیونکہ کالی مٹی کی زمین پر بہتی ہے اسے کالی ندی نام دے دیا گیا ہے۔ حکومت یہاں ایک بہت بڑا ڈیم بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ جس سے سیکڑوں ایکڑ زمین سیراب ہو گی اور کئی ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی،" انھوں نے دوسرے ہاتھ سے دوربین کو فوکس کیا۔

ڈوبتے سورج کا سونا قطرہ قطرہ مقابل پہاڑ کے پیڑوں سے ٹپک رہا تھا۔ وادی کی وسعت اس کی پُراسراریت کو بڑھا رہی تھی، ہلکی سرسراتی ہوائیں جنگل کی انوکھی خوشبوئیں گھل رہی تھیں — لیکن ایمن ان

سب باتوں سے بے خبر تھی اسے صرف آزر نواب کے ان ہاتھوں کا احساس تھا جو اس کی دوربین تھامے ہوئے کانپتی انگلیوں سے پیچھے پھسل آئے تھے اور اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایمن کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس کا سر آزر نواب کے کندھے سے جا ٹکا۔ ان کا گرم سانس اس کے رخسار کو چھو رہا تھا۔ اور وہ اسے کسی میٹھی بہاشٹے کی طرح سنبھالے کھڑے تھے۔

"خواب !!۔۔۔ اپنا رخسار اس کے بالوں پر ٹکاتے آزر نواب نے سرگوشی میں کہا اور ان کی بانہوں کا گھیرا کچھ تنگ ہوگیا۔ اس ایک لفظ کا لمس، بہت ہی نرم ملائم اور سبک تھا۔ لیکن اس نے ایمن کی خوابیدگی اور خود فراموشی پر تازیانے کا کام کیا۔ اور وہ اچھل کر ریلنگ سے جا لگی۔ وہ کانپ رہی تھی اسے یہ کیا ہوگیا تھا؟ وہ کیسے اس خود سپردگی کے عالم میں کھو گئی تھی۔ ریلنگ کو تھامے ہوئے اس کی انگلیاں اپنے ہی دباؤ سے سفید پڑ گئی تھیں۔ آزر نواب سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ جو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت نہ ان کے چہرے پر استہزا کی جھلک تھی نہ ماتھے پر شکن، صرف ایک عمیق گہرائی تھی جو ان کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

"اوہ، میں . . . میں چکرا گئی تھی۔ اس بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے" اس نے اپنی پوری قوتیں ایک جا کر کے بات بنانی چاہی ۔۔۔ وہ پسینا پسینا ہو رہی تھی۔

"جاگو خواب ۔۔۔ ورنہ بہت گہرائی میں جا گرو گی"۔ انھوں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور پلٹ کر سیڑھیوں سے اترنے لگے۔

ایمن کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس بلندی پر خنکی کے باوجود وہ پسینے میں نہا گئی تھی ۔۔۔ آزر نواب کی پیشین گوئی پوری ہوگئی تھی۔ وہ خود کو اس گہرائی میں گرنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ لیکن اس کے ذمہ دار آزر نواب بھی تھے۔ اس نے دکھ سے سوچا وہ ہر بار اسے ڈگمگا دیتے تھے۔ انھوں نے نہایت سفاکی سے اسے بھی اپنی مفتوح ان لڑکیوں کی قطار میں لا کھڑا کیا تھا جو ان کے دل بہلاوے کا سامان تھیں۔ اور یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ خود کو نہیں بچا سکی تھی۔ اس نے ان کے مغرور جادو کا توڑ اپنی برافروختگی سے کرنا چاہا ۔۔۔ خود کو کئی بار سمجھایا، لیکن اس کا ہر حربہ بیکار ہوگیا۔ وہ بہت بودی نکلی ۔۔۔ لیکن آزر نواب بھی اتنے بے رحم کیوں تھے ان کی تجربکار زندگی میں تو کتنی لڑکیاں آئی اور گئی ہوں گی۔ لیکن اس کی معصوم اور الھڑ دنیا میں وہی ایک تو آئے تھے۔ انھوں نے اسے خود کے آگے سر جھکانے پر کیوں مجبور کر دیا؟ ۔ کیوں اس کا سجدہ مانگا جس کی انھیں ضرورت

نہیں تھی کیوں اس کا بھرم توڑا؟

آزر نواب، یمین کے اس ذہنی خلفشار سے بالکل لاتعلق اطمینان سے سیٹی پر کوئی انگریزی دھن بجاتے نیچے اتر رہے تھے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے ان کے پیچھے اتر آئی۔ ان کی چال کا وقار، دونوں بازوؤں کو ہلاتے منضبط ہاتھ، سر کا متناسب، چوڑے کندھوں پر تناؤ، ان کے نجیب الطرفین ہونے کا غماز تھا۔

ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ انھیں کہیں رکنا بھی نہیں تھا۔ رات سے پہلے وہ واپس پہنچ سکتے تھے۔

جیپ میدانوں کو پار کرتی ہوئی پھر اسی گنجان حصے میں پہنچی جہاں جنگل کے زیادہ سربرآوردہ جانوروں کو دیکھنے کی ان کی کوشش اکارت گئی تھی اچانک آزر نواب نے بریک لگائے اور یمین کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھی ہی گم صم سا اس کا دل اکھڑ چکا تھا۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن جو کچھ سامنے تھا وہ بہت عیاں تھا۔ سڑک سے کچھ دور، چھدری جھاڑیوں کی اوٹ میں دو آنکھیں انگاروں کی طرح چمکیں اور آزر نواب نے جیپ کی روشنیاں بند کر دیں۔

"سیاہ چیتا!" انھوں نے یمین کے کان میں کہا۔ چونکہ اندھیرا اتنا بڑھا نہیں تھا، اور درندے اور ان کے درمیان فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ یمین کو صاف نظر آ گیا۔ لیکن جو کچھ اس نے دیکھا اس نے اس کے حواس اور بھی معطل کر دیے۔

ایک عظیم سیاہ چیتا ایک بے بس ہرن کو دبوچے ہوئے تھا۔ دہشت سے اس ہرن کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کے پیروں میں تشنج تھا۔ چیتے نے اسے بھنبھوڑا اور خون کا ایک فوارہ سا چھوٹا۔ یمین نے اپنا منہ پھیر لیا اور اس کے لبوں سے ایک سسکی نکل گئی۔ آزر نواب نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ یہ ان کا بڑا بے ساختہ اور ہمدردانہ برتاؤ تھا۔

آزر نواب دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے اس کا سر تھپتھپاتے رہے۔ انسانوں کی موجودگی بھانپ کر چیتا اپنا خون ٹپکتا شکار لیے نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ آزر نواب نے جیپ چلا دی۔ یہ دہشت ناک منظر یمین کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک چپکے چپکے روتی رہی۔ آزر نواب اور وہ جیپ میں آگے بڑھتے رہے۔ چیتا اور ہرن ساتھ ساتھ!

تھکن کے باوجود یمین رات کو بالکل نہیں سو سکی۔ جس طرح ہاری ہوئی فوج کا سپہ سالار اپنے جوانوں کو صف آرا کرتا ہے، اسی طرح یمین نے اپنے احساسات کے ٹوٹے تاروں کو جوڑا ۔۔ وہ اب

بھی خود کو منظم نہ کر سکی تھی۔

"لو بھئی امین بی بی"۔ بڑی سرکار نے اس کی سرخ، سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا "ہم نے تمھارے لیے ایک تحفہ رکھا ہے"۔ انھوں نے ایک مخملی ڈبیا امین کی طرف بڑھائی امین نے بظاہر پوری دلچسپی دکھاتے ہوئے ڈبا کھولا۔ اس کے اندر ایک بہت خوبصورت اور نازک سونے کی زنجیر تھی جس میں انگریزی کے پہلے حرف 'A' کی شکل کا لاکٹ پڑا تھا۔ امین ہکا بکا رہ گئی تھی اسے کسی تحفے کی توقع نہیں تھی۔

"یہ تمھارے پارٹی والے دن کی کارکردگی کے اعتراف میں چھوٹا سا تحفہ ہے"۔

"آپ اسے چھوٹا سا تحفہ کہہ رہی ہیں سرکار؟" امین نے اٹھ کر بندگی کرتے ہوئے کہا "مجھے تو اسے قبول کرتے ہوئے شرم آرہی ہے ـــ میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا ـــ پھر بھی اس کو لینے سے انکار کرنا گستاخی ہوگی"۔

امین ابھی وہ لاکٹ پہن ہی رہی تھی کہ آزر نواب داخل ہوئے۔ اور ان کی نظریں جھومتے ہوئے لاکٹ پر مرکوز ہوگئیں۔

"یہ ہم نے امین بی بی کے لیے بنوایا ہے آزر نواب ـــ تم بھی تو کہتے تھے کہ 'خانساماں' انعام کا حق دار ہے۔ کیسا لگا تمھیں یہ؟"

"ایک ہی دن میں تیار کروالیا سرکار آپ نے؟" ـــ آزر نواب نے حیرت ظاہر کی۔

"نہیں دو دن میں" ـــ بڑی سرکار مسکرا کر بولیں۔

"سرکار، ایک بری خبر ہے کہ بشارت نواب پھر فیل ہوگئے"۔ آزر نواب نے بات کا رخ بدلا۔

بڑی سرکار انھیں چپ چاپ دیکھتی رہیں، جیسے انھیں پہلے ہی اس بات کی توقع تھی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی تعلیم کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے اور انھیں یہاں ٹمانڈیلی کی فیکٹری کی ذمہ داری سونپ دی جائے"۔ آزر نواب نے ہاتھ میں ایک خط لہراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تسنیم پاشا کیا اس کے لیے تیار ہوں گی؟" بڑی سرکار نے شبہہ ظاہر کیا۔ امین چپکے سے اٹھ گئی۔ جب خاندان کی نجی باتیں زیر بحث آرہی تھیں تو اس کا وہاں سے ٹل جانا ہی بہتر تھا۔

"خالہ امی کچھ نہیں کہیں گی۔ یہاں ان کے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں ہے"، آزر نواب نے قطعیت سے کہا ـــ بڑی سرکار سوچ میں پڑ گئیں۔

"بشارت نواب کوئی بچہ نہیں ہیں سرکار۔ مجھ سے صرف چھ سال چھوٹے ضرور ہیں اور پھر ساری زندگی تو وہ بی اے پاس کرنے کی کوشش میں نہیں گزار سکتے۔ انھیں اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہیے کیا خیال ہے آپ کا؟"

بڑی سرکار نے انھیں دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وہ آزر نواب کے فیصلوں کو قطعی سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں — جبکہ آزر نواب اپنا ہر فیصلہ کچھ اس طرح سناتے تھے جیسے وہ بڑی سرکار ہی کا فیصلہ ہو — ویسے جب سے آزر نواب نے جایداد اور خاندان کی ذمہ داریاں قبول کی تھیں۔ بڑی سرکار ان معاملوں میں کم ہی دخل دیتی تھیں۔

"ہم تم سے اس سلسلے میں اور بھی بات کرنا چاہتے تھے"۔ بڑی سرکار نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔

"بسر و چشم سرکار"— آزر نواب مسکرا کر بولے "لیکن شاید میں جانتا ہوں کہ کون سی باتیں آپ کو پریشان کر رہی ہیں۔ گو میں اس دوران زیادہ تر باہر رہا، لیکن حویلی سے غافل نہیں رہا۔"

بڑی سرکار نے کچھ سوچتے ہوئے تکیے کا سہارا لیا۔

"خالہ امی اپنی روش کی آپ ذمہ دار ہیں البتہ بشارت نواب اور شاہانہ صاحبزادی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑے گا"۔ آزر نواب بولے۔

"تسنیم پاشا —" بڑی سرکار کچھ کہتے کہتے رک گئیں "تسنیم پاشا کا خیال ہے کہ شاہانہ صاحبزادی کی شادی تم سے ہو جاتے"۔

آزر نواب نے سر کو پیچھے کی طرف جھٹک کر قہقہہ لگایا اور بولے "اور سرکار آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اور اگر ہم پوچھیں کہ تمھارا کیا خیال ہے؟" بڑی سرکار نے جواب دینے کی بجائے کہا۔

"تو پھر میں پوچھوں گا کہ خود شاہانہ صاحبزادی کا کیا خیال ہے"۔ آزر نواب نے بات کو اُلجھا دیا۔

بڑی سرکار بیٹے پر اپنی پسند یا پسند لادنا نہیں چاہتی تھیں۔ ویسے اس رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ دونوں نے ایک ہی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ حسن میں شاہانہ صاحبزادی یکتا تھیں۔ شاید یہ خیال عرصے سے تسنیم پاشا کے دل میں پنپ رہا تھا کہ ایک دن آزر نواب ضرور شاہانہ صاحبزادی سے شادی کر لیں گے — وہ موزوں وقت کی تلاش میں تھیں۔ آزر نواب کبھی فرصت کے موڈ میں ہوتے

ہی نہ تھے ۔ انھوں نے اتنا زیادہ خود کو اپنی اسٹیٹ کے معاملوں میں اُلجھایا تھا وہ شادی کے بندھنوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے ۔ دو تین بار بڑی سرکار نے اس طرف اشارہ بھی کیا تھا، لیکن ہر بار وہ ہنس کر ٹال جاتے تھے، ورنہ حیدرآباد کا کون سا ایسا گھرانا تھا جہاں لڑکی موجود ہو اور آزر نواب پر اُن کی نظر نہ ہو ۔۔۔ کچھ لوگ جو اپنی کوششوں میں ناکام رہے تھے، آزر نواب سے خفا بھی ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں مشہور کر رکھی تھیں مثلاً آزر نواب نے جرمنی میں کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اسی لیے وہ بار بار وہاں جاتے ہیں ۔صرف یہی نہیں ان کے معاشقوں کے بھی قصے مشہور تھے جن میں بعض شادی شدہ خواتین کا نام بھی اچھالا جاتا تھا ۔ آزر نواب یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیٹھ پیچھے ان کے بارے میں کیا کہا جاتا تھا ۔ لیکن وہ ایسے لوگوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔

ایمن برآمدے کے دوسرے کنارے کنگرے سے لگی کھڑی تھی جہاں پوتھاس کے بڑے بڑے پتوں والی بیل، پول اور چھجے پر چڑھ آئی تھی ۔۔۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ آزر نواب جائیں تو بڑی سرکار کے حضور پہنچے ۔اب آزر نواب کو اپنی ہی طرف آتے دیکھ کر اس کے پاؤں پتھر بن گئے ۔

سپنے تلے قدم اٹھاتے ہوتے وہ اسی کی طرف آرہے تھے ۔صحت اور تازگی کا ایک ہالا ان کے گرد تھا۔ گھنے خمیدہ بال کنگھی کرنے کے باوجود فراخ ماتھے پر ایک جانب جھک آتے تھے ۔ وہ فلالن کی سفید پتلون اور کھلے گلے کی ٹینس شرٹ پہنے ہوئے تھے ۔ ان کے ہاتھ میں ہنٹر ("RIDIC WHIR") تھا جسے بل دے کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

شاید وہ اپنی صبح کی گھوڑ سواری سے لوٹے تھے اور لباس تبدیل کیے بغیر سیدھے بڑی سرکار کے پاس چلے آئے تھے۔

وہ آکر بالکل ایمن کے سامنے رک گئے ۔

"اچھا ہے"۔۔۔ انھوں نے لاکٹ ہاتھ میں لے کر اس کے نگوں پر انگوٹھا مسلتے ہوئے کہا" A سے میرا نام بھی آتا ہے ۔ آزر ۔۔۔ وہ زیرِ لب بول رہے تھے ۔" اس پر میرا بھی حق ہو سکتا ہے ۔ . . یہ میرا بھی ہو سکتا ہے ۔" لیکن اس وقت ان کی نظر لاکٹ پر نہیں بلکہ ایمن کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

ایمن نے لاکٹ چھین کر دوپٹے کے اندر ڈال لیا ۔شاید انھیں اسے بدحواس کرنے کے بھی گُر آتے تھے ۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور محض کسی سہارے کی تلاش میں نہ ہیں کنگر پر بیٹھ گئی ۔ جیسے اسے آزر نواب سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ۔ دراصل اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ مزید احمقانہ حرکتیں کر کے آزر نواب کی تفریحِ طبع کا سامان نہ بن جائے ۔ وہ اتنی زودحس تو کبھی نہ تھی ۔ یہ آخر اسے کیا ہوتا جارہا

تھا؟۔ آزر نواب اور ان سے متعلق ہر بات اسے برانگیختہ کیوں کردیتی تھی؟ اب جبکہ اپنے دل کی واردات سے وہ یقیناً واقف ہوچکی تھی تو اس کے لیے صرف دو ہی راستے کھلے تھے: یا تو وہ حویلی اور حویلی کے حکمرانوں کو چھوڑ کر خود کو دوبارہ اس پُرآشوب دنیا میں گم کردے جہاں سے وہ آئی تھی، یا پھر رومانوی دنیا میں بسنے والی خام چھوکریوں کی طرح برتاؤ کرنا چھوڑ دے، جو سستے رومانس کی تلاش میں اپنی خودداری کو بھی داؤ پر لگادیتی ہیں۔

اس نے طے کرلیا کہ وہ اب ہر اس بات سے گریز کرے گی جو آزر نواب کے ہونٹوں پر تمسخرانہ اور فاتحانہ مسکراہٹ لے آتے۔ لیکن اس نے کبھی دانستہ ایسا کیا بھی تو نہیں تھا ـــــ وہ تو اپنی مرضی کے خلاف کشاں کشاں اس بھنور کی طرف کھنچ آئی تھی جو اسے گہرائی میں ـــــ اور زیادہ گہرائی میں کھینچ لے گیا تھا۔ اب وہ اس بات کے لیے تو تیار تھی کہ خود اپنے بے رحم ہاتھوں میں ایک کھلونا بن جائے، لیکن اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر آزر نواب کے ہاتھوں میں کھلونا بننا اسے منظور نہ تھا۔

وہ اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چلی لیکن اس کا دوپٹا کانٹوں میں الجھ گیا اور وہ پلٹی۔

"دنیا میں ہر کانٹے کے لیے ایک دامن اور ہر دامن کے لیے ایک کانٹا موجود ہے"ـــــ آزر نواب نے اس کا دوپٹا کانٹے سے چھڑانے کی کوشش نہ کرتے ہوئے کہا۔ امین نے دیکھا، ان ہونٹوں پر وہی پاگل کردینے والی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر دوپٹے کو جھٹکا اور وہ چر سے پھٹ گیا۔
اس نے ایک خونخوار نظر آزر نواب پر ڈالی اور بغیر کچھ بولے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب آزر نواب اس کی جھلاہٹ سے واضح طور پر لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنس رہے تھے اور ان کی بے عیب بتیسی نظر آرہی تھی۔ وہ اٹھی تو بڑی سنجیدگی اور تمکنت سے تھی لیکن اس کمبخت کانٹے نے کام بگاڑ دیا۔ کانٹے کا کام ہی چبھنا ہے وہ دامن ہو کہ دل۔

اس نے جلدی جلدی اپنے کمرے میں پہنچ کر زنجیر سے وہ لاکٹ نکالا اور اسی مخملی ڈبیا میں رکھ کر الماری کی دراز میں رکھ دیا۔ لیکن اس زنجیر کو کیا کرے جسے آزر نواب نے چھوا تھا ـــــ وہ کبھی کلائیوں پر محسوس ہوتی تو کبھی اس کے پاؤں باندھ دیتی کبھی اس کی گرہ دل پر بڑی مضبوط ہوجاتی۔ پھر بھی اس کا لمس بہت سبک تھا۔ جیسے کسی بچے کی پاک ہتھیلی ہو۔

وہ مستحکم ارادے اور نئی ہمت کے ساتھ آفس پہنچی۔ جیسے ہی اندر قدم رکھا، آزر نواب نے اسے ایک گہری نظر سے دیکھا اور برا سا منہ بنایا۔
مجھے یہ فاختئی رنگ بالکل پسند نہیں ہے انھوں نے سر سے پاؤں تک اس کے فاختئی رنگ کے کپڑوں کو دیکھ کر کہا۔
نہ ہوا کرے اسے کیا ـــــ امین نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ وہ

رنگ اس کی آنکھوں کے سنہرے پن کو دھندلا کر دیتا تھا۔
خود آزر نواب، اس وقت آدھی آستینوں والی آسمانی جرسی اور نیلی پتلون پہنے ہوئے تھے آدھی آستینوں سے باہر نکلے ہوئے آسمانی رنگ ان پر بہت پھبتا تھا مضبوط آہنی بازو، کہنیوں سے نیچے سیاہ بالوں سے بھرے تھے اور خوش وضع لمبی انگلیوں والے ہاتھوں کو پھیلا کر انھوں نے ٹیبل کے کناروں کو پکڑا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں پلاٹینم کی انگوٹھی پر ان کا خاندانی طغرا کھدا ہوا تھا۔
"آیندہ اس رنگ کے کپڑے نہ پہنا کرو"۔۔۔ انھوں نے اس کا کوئی ردِ عمل نہ پاکر خود دسری سے کہا۔
"مجھے اپنی پسند کے کپڑے پہننے کی آزادی ہونی چاہیے"۔۔۔ ایمن نے جہاں تک ہو سکا اپنی طمانیت کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے"۔۔۔ آزر نواب نے شانے چڑھا کر اپنے حکم سے دست بردار ہوتے ہوئے کہا "تمھیں آزادی دی گئی، لیکن ساتھ ہی ہم نے بھی یہ آزادی حاصل کر لی ہے کہ جب آیندہ بھی ہم تمھیں اس لباس میں دیکھیں تو اسے تار تار کر دیں"۔
یہ کھلی زبردستی تھی۔۔۔ ایمن کے کانوں تک گلابی لہر دوڑ گئی لیکن اس نے ہتھیار نہیں ڈالے "یہ میرا پسندیدہ لباس ہے، اور میں اسے ضرور پہنوں گی"۔ اس نے گردن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔
"شاید اسی امید پر کہ ہم اسے تار تار کر دیں؟"
ایمن نے چونک کر انھیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں واقعی غصہ جھلکنے لگا تھا۔
اس رئیس زادے کی شاید کبھی کسی نے حکم عدولی نہیں کی۔ ایمن نے سوچا، لیکن وہ انھیں بھڑکا کر خوش تھی۔ ان کا غصہ ان کی مسکراہٹ سے بہتر تھا جو اسے ہمیشہ چراغ پا کر دیا کرتی تھی۔
آج کے خطوط میں سب سے پہلا خط بشارت نواب کے نام تھا کہ وہ فوراً انڈیا پہنچ جائیں۔ آزر نواب نے انھیں کوئی وجہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔
ایک دو کاروباری خطوط۔۔۔ ایک میں انھوں نے ہالینڈ کی کسی فرم کو ٹمبر فیکٹری کے لیے نئی ونیئر مشین بھجوانے کے لیے کہا تھا۔
فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ ایمن نے ریسیور اٹھایا۔
"مس ریاض!"۔۔۔ ایمن نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔
آزر نواب نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور لے لیا۔

"ہلو ریحانہ" ـــــ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔" میں اتنا مصروف نہیں کہ تم سے بات بھی نہ کروں" ـــــ انھوں نے کہا۔

دوسری طرف سے ریحانہ نے پتا نہیں کیا کہا۔ آزر نواب ہنس پڑے اور بولے "خوب صورت لڑکیوں سے کیے ہوئے وعدے میں نہیں بھولتا ـــــ مجھے ـــــ ہاں ہاں ـــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج تمھارے ساتھ چاندنی رات میں ندی کی سیر ہوگی"

ایمن اس طرح اٹھی جیسے کوئی ضروری کاغذ لانا ہو۔ آزر نواب کی پرائیویٹ باتوں سے اسے کیا سروکار تھا۔

"ہاں . . . ہاں کیوں نہیں ؟ نہیں میں خود ہی تمھیں آکر لے جاؤں گا۔
ہاں ہاں کھانا بھی بوٹ پر ہی ہوگا ـــــ کیا کہا ؟ . . . اچھا اچھا۔

"No I think she would be too glad to do.it" او

اور انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ "مس ایمن شہاب" ـــــ آزر نواب نے رکھی سطح پر اتر کر کہا۔ "مس ریاض کی فرمائش ہے کہ آج چیز سوفلے ضرور بنے ـــــ پارٹی والے دن جو تم نے تیار کیا تھا ـــــ وہ ریحانہ کو پسند آیا تھا۔ آج شام ہم بوٹنگ کے لیے جانے والے ہیں۔ کھانا بوٹ پر ہی ہوگا"

"مس ریاض کو میں ترکیب لکھوا دوں گی ـــــ وہ اپنے خانساماں سے بنوالیں گی" ایمن نے بڑی مشکل سے اپنا سکون برقرار رکھتے ہوئے کہا وہ کوئی دو ٹکے کی باورچن نہیں تھی کہ مس ریاض کی فرمائش پوری کرتی۔

آزر نواب اس کے پیچ و تاب کو دیکھتے رہے پھر بولے "یہ میری بھی درخواست ہے"

ایمن نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور خطوط سمیٹ کر انھیں ٹائپ کرنے چلی گئی ـــــ اسے آزر نواب پر واقعی غصہ آرہا تھا۔ وہ کیسے اتنے سنگدل ہو سکتے تھے۔ شمشاد سے اسے سن گن ملی تھی کہ شاہانہ صاحبزادی سے ان کے رشتے کی بات چل نکلی تھی۔ اور ادھر وہ مس ریاض کو سراب کی طرف لے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ ریحانہ کی خاطر انھوں نے خود اپنی طرف سے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ریحانہ کی پسندیدہ ڈش تیار کردے۔ پتا نہیں اور کتنے معصوم دلوں کو انھوں نے اپنی مٹھی میں مسلا اور پھینکا ہوگا۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد ایمن سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلی گئی۔ خانساماں کی بیوی ہسپتال سے آچکی تھی۔ سویرے بڑی سرکار خود اسے دیکھ آئی تھیں۔ خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے

اسے نقاہت بہت ہو گئی تھی۔ ایمن نے خانساماں کو آزر نواب کا حکم سنایا۔ اس کی بیوی کو آرام کرنے کی ہدایت کر کے اس کے چار سالہ بچے کلیم کو ساتھ لے آئی۔ وہ بالکل چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

"ارے ایمن بی بی ـــ ماٹی ملا کیچڑ میں لت پت ہے۔ لاؤ میں نہلا کو چھوڑ دیتی ہوں"۔ ایمن کی انگلی تھامے بچے کو سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ کر شمشاد نے کہا۔

"نہیں شمشاد میں خود اسے نہلا دوں گی۔ مجھے فرصت ہے" ایمن نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ کلیم شمشاد سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی سیڑھیوں پر ٹھٹک گیا تھا اور اس کی گرفت ایمن کی انگلی پر اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ ایمن اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور نہلا کر اسے تیار کر دیا ـــ وہ سارا وقت اسے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ سیاہ لیکن بھرے بھرے گالوں پر اس کی چمکیلی آنکھیں سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ سرونٹ کوارٹر کے کھلے چوبچے والے نل پر جہاں اس کی ماں روزانہ اسے نہلاتی تھی اور گلابی ٹائلز کے باتھ روم میں زمین آسمان کا فرق تھا خوشبودار صابن نے اس کی رہی سہی گویائی بھی ختم کر دی تھی۔ ایمن نے ساتھ لاتے ہوئے کپڑے اسے پہنا کر اس کا جائزہ لیا۔ گول مٹول سیاہ فام کلیم، ٹخنے سے اونچا پاجامہ اور کندھے پر پیوند لگا کرتہ پہنے، بالکل دم سادھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں اوپر اٹھا ہی نہیں رہا تھا ـــ ایمن اس کی جھجک دور کرنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے چاکلیٹ لینے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ وہ سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ ایمن کو اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی۔ وہ ہاتھ میں چاکلیٹ لیے اس کے پیچھے دوڑی۔ اس کا ذہن دھل سا گیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک عرصے بعد کھل کر ہنس رہی تھی۔ ایسی ہنسی کسی کے لبوں کو ایک بچہ اور اس کی چہلیں ہی عطا کر سکتی ہیں۔

ایمن نے اسے جھولے کے پاس جا لیا۔ وہ گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل جھولے کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ ایمن جھولے پر بیٹھی جھکی اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ننگے پیروں سے لان کی تازہ کٹی ہوئی گھاس چپک گئی تھی۔ جس کے تنکے اس کی جھولتی ہوئی لمبی چوٹی سے بھی لپٹ گئے تھے۔ آخر کلیم چاکلیٹ کے لالچ میں باہر نکل آیا اور ایمن نے اسے جھپٹ کر پکڑ لیا ـــ وہ چلایا، جو ابا" ایمن بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی ـــ لیکن اس کی ہنسی بیچ میں ہی رہ گئی۔

پاموں کے جھنڈ کے پاس، روش پر، پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے آزر نواب کھڑے تھے۔ پتا نہیں کب سے وہ ایمن کی اس خود فراموشی کے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایمن جھینپ کر اپنے بالوں سے تنکے جھٹکتی ہوئی وہیں جھولے کے پاس کھڑی ہو گئی اور کلیم چاکلیٹ

اٹھاکر جو بھاگا ہے تو ایک بار بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ آزر نواب کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا تھا امین کا چہرہ اس بھاگ دوڑ سے تمتماگیا تھا۔ آزر نواب کی نظریں کچھ دیر اس کے سیاہ بالوں کی لٹوں سے جھانکتے پرو فائل پر جمی رہیں۔ امین دم سادھے کھڑی رہی۔ اسے توقع تھی کہ آزر نواب ضرور اس کے بچکانہ برتاو پر کوئی فقرہ چست کریں گے۔ لیکن سوائے ایک موہوم سی مسکراہٹ کے، انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے، اور امین اطمینان کا سانس لے کر اندر چلی گئی۔ مسز آئزاک کو اس نے کافی عرصے سے خط نہیں لکھا تھا۔ وہ جب بھی انھیں خط لکھتی تو ایسا لگتا تھا جیسے حویلی کے باہر کی دنیا سے اس کا رشتہ پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ حویلی کے شب و روز کے بارے میں لکھتی اسے یقین تھا کہ مسز آئزاک یہ ساری باتیں بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں گی۔ وہ جس معمولی لیکن وسیع تر سماج کی ایک رکن تھیں، وہاں حویلی دکانوں کے آگے بنے ہوتے شیشے کے شوکیس کی طرح تھی جو ہر راہ رو کے تجسس کو مقید کر لیتے ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر آزر نواب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ البتہ بشارت نواب کا کافی تفصیلی تعارف کروا دیا تھا۔ لہٰذا جب بھی مسز آئزاک اسے خط لکھتیں تو اس میں بشارت نواب کو ضرور پوچھتیں۔ امین ان کے خط دیکھ کر اپنے آپ مسکرا پڑتی۔ مسز آئزاک کا مادرانہ شعور بشارت نواب اور امین کے مابین مستقبل کے زیادہ قریب تر رشتے کو دیکھنے لگا تھا، اور چونکہ وہ امین کے اندیشوں سے واقف تھیں، اس لیے اسے نصیحت بھی کی تھی کہ سب رئیس لڑکے برے نہیں ہوتے۔ اسے زیادہ گہرائی سے بشارت نواب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

"او ڈارلنگ مسز آئزاک!" امین نے ان کے خلوص اور محبت سے متاثر ہوکر سوچا۔

اس نے خط بند کیا اور بڑی سرکار کی خدمت میں پہنچی۔

بڑی سرکار نے اس سے ذکر کیا تھا کہ وہ سلطنت حیدرآباد کی تہذیب اور ثقافتی اہمیت پر کتاب لکھنا چاہتی تھیں۔ ان سے زیادہ موزوں اس کام کے لیے اور کون ہوسکتا تھا؟ انھوں نے اس خالص دکنی ماحول میں پرورش پائی تھی جو تہذیبی قدروں میں یکتا اور منفرد تھا۔ اور انھوں نے وہاں کے سماج کا وہ دور بھی دیکھا اور دیکھ رہی تھیں جب حیدرآباد مختلف تہذیبوں کا گہوارہ بنتا جا رہا تھا آزر نواب کے آنے کے بعد ان کی مصروفیت بہت کم ہوگئی تھی۔ یہ دراصل آزر نواب کا ہی سجھاو تھا جسے بڑی سرکار نے بھی پسند کیا کہ اپنے فرصت کے اوقات میں وہ کتاب لکھنا شروع کردیں۔ انھوں نے اپنا ولولہ امین کو بھی سونپ دیا تھا۔ اس کو ہی بڑی سرکار سے اردو میں ڈکٹیشن لینا تھا

اور وہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

امین کو یاد آیا کہ اس نے 'چیز سوفلے' آدن میں رکھا ہی نہیں۔ وہ بڑی سرکار سے معذرت کر کے اٹھی اور کچن میں سوفلے کی تیاری میں لگ گئی۔ اب وہ آزر نواب کی اخلاقیات کی مزید ناقد بننا نہیں چاہتی تھی ـــــ یہ مناسب بھی نہیں تھا کیونکہ درحقیقت وہ حویلی کی ایک ملازم ہی تو تھی، خواہ اسے کتنی ہی وقعت سے کیوں نہ دیکھا جاتا ہو۔ لیکن پھر بھی شام کو اس وقت وہ اپنے دل سے اٹھتی درد کی اس لہر کو دبا نہ سکی جب وہ پچھلے برآمدے میں نکل آئی جہاں سے ندی کا چوڑا پاٹ بالکل صاف نظر آتا تھا اور جہاں سے ندی موڑ لیتی تھی ـــــ ندی کو گھیرنے والی سرسبز پہاڑیوں کے پیچھے سے چاند بھی کا نکل آیا تھا۔ خاموش لہروں پر بہتے ہوئے ڈولتی بوٹ اور اس میں بیٹھے دو ہیولوں کا سلہوٹ عیاں تھا۔ ایک ہیولا نازک، قدرے جھکے شانے اور ہوا میں اڑتے کھلے ہوئے بال، اور اس کے مقابل ایک چست صحت مند اور استوار شخصیت جس کے مضبوط بازوں میں تھامے ہوئے چپو دھیرے دھیرے ایسے چل رہے تھے جیسے کسے ہوئے ساز کے تاروں پر فنکار کی انگلیاں چلتی ہوں۔

بہت دور پہنچ کر بھی وہ ناو امین کی نگاہوں کی زد میں تھی۔

صبح کو ناشتے کے بعد لاؤنج میں بشارت نواب کی موجودگی امین کے لیے زیادہ تعجب خیز نہیں تھی۔ ایک دن پہلے امین نے پورٹیکو میں جیپ کے رکنے کی آواز سنی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ ہیڈ کوارٹر کے حکم پر بشارت نواب افتاں وخیزاں ڈانڈیلی چلے ہی آتے ہیں۔ نیند کی غنودگی میں بھی اسے بشارت نواب کی حالت زار پر ہنسی آ گئی۔ حیدرآباد اور اپنی گوناگوں مصروفیات سے منہ موڑنا بشارت نواب کو بہت شاق گزرا ہوگا۔ اس نے سوچا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔ لیکن وہ ان کے وہاں آنے سے خوش تھی۔

"آخر چلے آتے نا ڈانڈیلی!" ـــــ بڑی سرکار اٹھ کر گئیں تو امین نے انھیں انگوٹھا دکھایا۔

"تمھاری یاد نے کھینچ بلایا ہے۔" بشارت نواب پینترا بدل کر بولے۔

"نہیں جی ـــــ آپ آزر نواب سے ڈرتے ہیں۔" امین نے مزید چھیڑا۔

"بلائے ناگہانی سے کون نہیں ڈرتا؟" ـــــ بشارت نواب نے آواز دبا کر کہا "لیکن کہے دے رہا ہوں یہ فیکٹری ویکٹری مجھ سے چلنے والی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا کیجیے گا یہاں رہ کر؟" ایمن نے حیرت سے پوچھا۔
"سینکچویری میں شکار کریں گے، کالی ندی میں تیریں گے اور تم سے عشق کریں گے۔"
"مائی ڈیر بشارت علی خاں، یہاں تینوں کام ممنوع ہیں۔ سینکچویری میں شکار کرنا جرم ہے۔ کالی ندی میں آدم خور بلیں ہیں اور یہاں عشق کرنے والے کی کھال کھنچوا دی جاتی ہے۔" ایمن نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کہا۔
"کوئی بات نہیں۔۔۔ اس کھال سے تمہاری نازک نازک جوتیاں بنوا دیں گے۔" بشارت نواب سر جھکا کر بولے۔

"خیال بُرا نہیں بشارت نواب۔" آزر نواب پردہ اٹھا کر داخل ہوتے ہوئے بولے "لیکن آپ کی کھال کے بہتر استعمال ہو سکتے ہیں۔"

بشارت نواب کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آداب عرض کر کے آزر نواب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ٹھیک نو بجے آفس میں ملیے گا۔" آزر نواب گھڑی دیکھ کر بولے "میں نے ملازم سے کہہ دیا ہے کہ آپ کا سامان میرے برابر والے حصے میں پہنچا دیا جائے۔" اور وہ بڑی سرکار کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

بشارت نواب نے رونی صورت بنا کر ایمن کو دیکھا اور وہ ہنس پڑی۔ آزر نواب نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ ان کی جبین شکن آلود ہو گئی۔ لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں۔۔۔ اور اجازت لے کر بڑی سرکار کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔" بشارت نواب نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور بادل ناخواستہ کھڑے ہو گئے۔

جب ایمن بڑی سرکار کے پاس پہنچی تو آزر نواب جا چکے تھے۔

ایمن کا خیال تھا کہ بڑی سرکار کا تجربہ ان کے سنہری ماحول تک محدود ہوگا۔ لیکن جیسے جیسے ان کی کتب پر وان چڑھ رہی تھی، بڑی سرکار کے گہرے مشاہدے اور سلجھی ہوئی نظر کی گواہی دینے لگی تھی۔

ان کا نظریہ تھا کہ انسانی فطرت، وہ خواہ محلوں میں ہو یا جھونپڑوں میں، ایک سی رہتی ہے۔ دوسرے، وہ کسی شخصیت کی تکمیل کے لیے کچھ فطری کمزوریوں کو بھی ضروری سمجھتی تھیں جن کا مقابلہ کیا

جائے اور دسترس حاصل کی جائے ۔ وہ اس نظریے کی تائید کرتی تھیں کہ کوئی انسان مکمل طور پر اچھا یا سراسر برا نہیں ہوتا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے دادا جان کا ذکر کیا تھا جن کا غصہ ضرب المثل تھا۔

نواب تدبیر الملک کو نہ صرف فنِ موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا، بلکہ وہ فنکاروں کی سرپرستی کے سبب بھی مشہور تھے ۔ استاد بدیع الدین اور ان کی موسیقی انہی کی حویلی میں پنپی تھی ___ وہ کئی حویلیوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی زندگی بھر 'کوٹلہ عالیجاہ' والی حویلی ہی میں رہے ۔ ہر شام استاد بدیع الدین پیش دالان میں بیٹھے اپنے من کا جادو جگاتے اور اوپر رہائشی حصّے کے ایک جھروکے میں بیٹھے تدبیر الملک اور ان کے مصاحب، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ۔ گنگا جمنی حقّے کا لمبا سنہری پیچوان زمین سے پہلی منزل کے جھروکے تک پہنچا دیا جاتا ۔ حقے میں جلتے گوڑاکو سے حویلی کی ساری فضا معطر ہو جاتی ۔ نواب تدبیر الملک استاد بدیع الدین کی بہت قدر کرتے تھے ۔ انھیں مجروں کا شوق نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ استاد کی سرپرستی میں برسوں بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ اور وہ بھی نواب صاحب کی تفریحِ طبع کے لیے ایک ایک راگ پر اپنی جان لڑا دیتے ۔ شومیِ قسمت سے کچھ دن سے ان کے گلے میں خرابی آ رہی تھی ۔ بوند بوند ان کے گلے کا رس سوکھتا جا رہا تھا ۔ نواب صاحب کے حسّاس کان اس سے بے بہرہ نہیں تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ بڑھاپے کی آندھی کو کون روک سکا ہے ۔ رفتہ رفتہ استاد بدیع الدین کو گاتے سننا ان کے لیے ایک ناقابلِ برداشت امر ہوتا گیا ۔ لیکن نواب صاحب نے استاد پر یہ حقیقت کبھی ظاہر نہ ہونے دی ___ حسبِ معمول یہ سلسلہ چلتا رہا اور نواب صاحب اسی ذوق و شوق سے ہر روز استاد کا گانا سنتے رہے اور داد دیتے رہے ۔ استاد گانے میں اپنی جان لڑا دیتے تھے ۔ برسوں نمک خواری کی تھی ۔ نواب صاحب کی خوشنودی ان کا مشرب تھا ۔ لیکن اپنی سعیِ رائیگاں ان سے بھی چھپی نہیں تھی ۔ وہ نواب صاحب کی داد پا کر اب کبھی آنکھ ملا کر سلام نہیں کر پاتے تھے ___ شاید وضع داری دونوں ہی نبھا رہے تھے ۔ ایک روز استاد سے برداشت نہیں ہوا، جیسے ہی ان کا گانا سن کر نواب صاحب نے داد دی، وہ دوڑ کر اوپر چلے گئے اور اپنا سر نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر "استاد دے استاد دے" کہا ان کی ہچکی بندھ گئی ۔ اس کے بعد پتا نہیں وہ اس بے سری دنیا میں کہاں کھو گئے ۔

بڑی سرکار کا حافظہ قابلِ تحسین تھا ۔ انھیں دنیا کے مختلف مورخوں کے تاثرات ازبر تھے وہ ان کا استعمال برمحل کرتی تھیں ۔ لیکن ان کے جس ہنر سے ایمن بہت زیادہ متاثر ہوئی وہ ان

کی علیت اور ہر متنازعہ معاملے میں ان کی صائب رائے تھی۔ کبھی وہ پر جوش الفاظ میں تیزی سے کچھ کہہ جاتیں۔ لیکن فوراً ہی آنے والے جملوں میں ان کا علم اور نسوانیت جھلکنے لگتی۔

"جانتی ہو امین بی بی — ہمیں زندگی میں ایک بات کا بڑا افسوس ہے" انھوں نے ایک دن امین سے کہا "ہمیں افسوس ہے کہ ہماری کوئی صاحبزادی نہیں ہیں"۔

"اب، اتنے دنوں بعد سرکار؟" امین بولی۔ "لوگ تو لڑکیاں چاہتے بھی نہیں اور — آپ کے پاس تو آذر نواب ہیں"۔ امین نے بڑی احتیاط سے جملہ پورا کیا۔

"لیکن آذر نواب لڑکی نہیں ہیں" انھوں نے کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ امین کا دل چاہا ان کے پیروں سے لپٹ کر ان کی گود میں اپنا سر رکھ دے۔ وہ بھی تو احساس کی اس گرمی سے محروم ہو گئی تھی — اس نے بڑی سرکار کو پہلے بھی کبھی کبھی اپنے خیالات میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کی وجہ آج اسے معلوم ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اور ان کے کچھ کہنے کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب انھوں نے آگے کچھ نہیں کہا تو وہ بھی خاموشی سے اٹھ کر چلی آئی — وہ ان کے سکوت میں مخل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اور شاید بڑی سرکار بھی یہی چاہتی تھیں۔

ٹمبر فیکٹری کی دنیا اس رنگا رنگ دنیا سے یکسر مختلف تھی جس کے بشارت نواب عادی تھے۔ ابھی تک ان کے ماتھے پر پسینا ٹینس کے گیم کھیل کر، پولو کھیل کر یا بال روم میں دیر تک ناچ کر ہی آیا کرتا تھا۔ وہ کان جو بال روم کی مسحور کن موسیقی کے عادی تھے۔ اب ٹمبر فیکٹری کی کرخت اور پُر آشوب آوازوں سے پھٹے جا رہے تھے۔ آذر نواب انھیں اپنے ساتھ فیکٹری کے ہر شعبے میں لے جا رہے تھے۔

سب سے پہلے وہ اس وسیع میدان میں گئے جہاں ٹمبر کے بڑے بڑے شیڈ بنے ہوتے تھے۔ ان میں لکڑی چھٹائی کے لیے رکھی جاتی تھی۔ انھوں نے اس ٹمبر کا معائنہ کیا۔ جو مختلف ڈھیروں میں ناقص اور بہتر ہونے کے مطابق رکھی تھی — ناقص ساگوان میں گرہیں اور کشادہ سوتے تھے۔ اعلا درجے کا ٹمبر ان عیبوں سے پاک تھا — کئی کارندے اپنے کام میں مصروف تھے — وہ اپنی تیز درانتیوں سے استوانہ نما لمبی لمبی لکڑیوں پر سے غیر ضروری کانٹیاں صاف کر رہے تھے۔ وہیں فیکٹری منیجر جسونور سٹھ چھانٹی ہوئی لکڑیوں پر پیلے چاک سے نشان لگواتے جا رہے تھے۔ اعلا درجے کے فرنیچر کے کام آنے والی لکڑی بھی تھی — عمارتی چوبینہ، جہاز رانی میں استعمال ہونے والا ٹمبر بھی۔ کچھ خاص طرح کی لکڑی پلائی وڈ وینیئر بنانے کے لیے رکھوائی جا رہی تھی، جس سے بننے والے فلش ڈورز کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی ایکسپورٹ سے ملک کو

بیرونی زرِ مبادلہ کا فائدہ تھا۔

"بمبئی کی فرم نے جو ٹینڈر مانگا تھا، وہ آپ نے بھر دیا؟" آزر نواب نے بھنور سیٹھ سے پوچھا۔

"یس سر"۔ بھنور سیٹھ نے اطمینان دلایا۔

"اگر ہمارا ٹینڈر پاس ہوتا ہے تو اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ٹمبر میں رطوبت ۸ فی صد سے زیادہ نہ ہو ——" آزر نواب نے کہا۔ ان کی اپنی لیبارٹری تھی جہاں لکڑی کے مختلف نمونوں کو جانچا جاتا تھا۔

فیکٹری کافی بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن آزر نواب نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ وہاں کام کرنے والوں کو حتی الامکان ساری سہولتیں مہیا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے اور فیکٹری میں کام کرنے والوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ جہاں جہاں وہ رک کر بات چیت کرتے ایک دوستانہ فضا قائم ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فیکٹری کے چپے چپے سے، وہاں چلنے والی مشینوں کی ہر کیل سے اور ہر مزدور سے شخصی طور پر واقف تھے۔ بشارت نواب زیادہ تر بیزاری اور کبھی استعجاب سے آزر نواب کی ہر دل عزیزی کو دیکھتے جا رہے تھے۔

جہاں تختوں کی کٹائی ہو رہی تھی۔ وہاں لکڑی کا برادہ فضا کو دھندلا رہا تھا۔ آزر نواب نے خود بھی بشارت نواب کے ساتھ کپڑے کا ماسک ناک اور منہ پر چڑھا لیا تھا۔

"ستو ایکر، تم پھر بغیر ماسک کے کام کر رہے ہو؟" انھوں نے ایک مزدور کا شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔

وہ کچھ گھبرایا سا، کچھ کھسیایا سا ان کی طرف دیکھنے لگا اور پھر دوڑ کر ماسک لینے چلا گیا۔

"اس برادے سے سانس کی بیماریاں ہو سکتی ہیں،" — آزر نواب بشارت نواب سے بولے، "ہمیں ان سب مزدوروں کی صحت کا بھی خیال رکھنا ہوگا — ہفتے میں دو بار ڈاکٹر آتے ہیں۔ لیکن صرف ڈاکٹروں کو بلا لینے سے ہماری ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔"

چھوٹی ٹرالیوں میں بھر بھر کر مزدور برادہ گودام میں لے جا رہے تھے جسے ہارڈ بورڈ بنانے اور انڈسٹریز میں مختلف ضروریات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر کام ایک موزوں اور مقررہ پروگرام کے تحت ہو رہا تھا۔ جسے سمجھنے میں بشارت نواب کو زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی لیکن کیا کرتے۔ ان کا دل تھا کہ منہ زور گھوڑے کی طرح کسی اور طرف دوڑ جا رہا تھا۔ وہ بندشوں کے عادی نہیں تھے۔

"اور یہ آپ کا آفس ہوگا"۔ ایک سفید وردی میں ملبوس چپراسی نے انھیں آتے دیکھ کر سلام

کرکے دروازہ کھولا۔ یہ ایک روشن اور مناسب فرنیچر سے سجا کمرہ تھا، عقبی بڑے دریچے سے کالی ندی اور اس کا دوسرا کنارہ بالکل سامنے نظر آتے تھے، جہاں گیسٹ ہاؤس اور اس کا ملحقہ چٹانی حصہ اپنے سبزہ زار ماحول میں کسی خوش نما پینٹنگ کی طرح لگ رہا تھا۔ ناؤ شاید اس مقصد کے لیے بھی رکھی گئی تھی کہ ندی پار کرکے ٹمبر فیکٹری کم وقت میں پہنچا جائے کنارے پر پہنچ کر درازپیڑوں کی چھاؤں میں کچھ ہی بلندی چڑھنے پر فیکٹری کا سارا کامپلیکس تھا۔ دریچے سے باہر نظارہ بہت دلکش تھا۔

ان کتابوں سے آپ کو ٹمبر اور اس کے استعمال کی مختلف ٹیکنکوں کے بارے میں مدد ملے گی" آذر نواب نے الماری میں سجی کتابوں کی طرف اشارہ کرکے کہا اور بشارت نواب کے حلق میں کوئی چیز اٹکی یہاں بھی کتابیں لیکن انھوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"آپ کی مدد کے لیے سارا اسٹاف موجود ہے ——— میری خواہش ہے کہ آپ آج ہی سے کام شروع کردیں" آذر نواب بولے اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بشارت نواب انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئے اور آذر نواب کے جانے کے بعد ٹیبل کے پیچھے رکھی گھومنے والی کرسی پر جسے ابھی ابھی آذر نواب نے چھوڑا تھا ——— بیٹھ کر تیزی سے گھوم گئے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ آدھے کٹے ہوئے دروازے کے نیچے سے انھیں اب بھی آذر نواب کے بڑھتے قدم نظر آرہے تھے۔ چمکدار جوتے، اور پتلون کی کریز کی تیز دھار جسے وہ جہاں تک نظر جاتی تھی، دیکھا کیے۔

آذر نواب نے کئی بار پڑھائی کے لیے بشارت نواب کی خبر لی تھی۔ کبھی کبھی جیب خرچ بند کرنے کی دھمکی دی تھی، لیکن اپنی ناراضگی کا اس حد تک عملی ثبوت کبھی نہیں دیا تھا ——— تسنیم پاشا کو بھی آذر نواب کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ بشارت نواب کی طرح ہینڈسم اور سوسائٹی میں مقبول ان کا بیٹا ایک ٹمبر فیکٹری میں گم ہوکر رہ جائے ——— یہ خیال ہی انھیں اداس کرنے کو کافی تھا۔ لیکن آذر نواب سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں تھی۔

تسنیم پاشا کی کھلی کھلی حرکتوں اور سوتیلی خالہ ہونے کے باوجود آذر نواب ان کا کافی لحاظ کرتے تھے، انھوں نے تسنیم پاشا سے کبھی کھلی سرد مہری نہیں ظاہر کی ——— پھر بھی تسنیم پاشا ان سے خائف رہتی تھیں اور کبھی ان سے بحث میں نہیں الجھتی تھیں ——— وہ بڑی سرکار ہی سے بہت کچھ منوالیا کرتی تھیں۔ اب آذر نواب کو زیر کرنے کی ترکیب انھوں نے یہ سوچی کہ شاہانہ صاحبزادی سے ان کی شادی ہوجائے۔ اس طرح ان کے کئی مقاصد ایک ساتھ پورے ہوجاتے ان کی حیثیت حویلی میں مضبوط ہوجاتی ——— شاہانہ صاحبزادی جو خود ان ہی کی غلطی سے ہاتھ سے نکلی جارہی تھیں، زیر لگام آجائیں۔ انھیں شروع ہی سے اس بات کا یقین تھا کہ آذر نواب شاہانہ صاحبزادی سے ہی شادی کریں گے۔ کیونکہ ان کی بیٹی حسن میں یکتا

اور سوسائٹی کی جان تھی۔ اب یہ طویل انتظار انھیں بے چین کرنے لگا تھا۔

جہاں تک بشارت نواب کا سوال تھا ان کے دماغ نے اتنی گہرائی میں جاکر کبھی سوچا ہی نہیں تھا ـــــ ان کے لیے تو بس زندگی وہی تھی جو گزر رہی تھی ـــــ اور اب تک جو گزری سو بھی بُری نہیں تھی ـــــ لیکن تیسری بار بی۔ اے میں فیل ہوجانے کے بعد اچانک آزر نواب نے جو ان کا راستہ کاٹا تھا، اس سے وہ ہکا بکا رہ گئے تھے آزر نواب نصیحت اور فضیحت میں یقین تو رکھتے نہیں تھے جو کوئی انھیں فیصلے کی اونچ نیچ سمجھاتے وہ تو عمل کے دھنی تھے ـــــ ویسے بشارت نواب کو آزر نواب پر ایک انجانا سا اعتماد تھا کہ وہ جو بھی کریں گے ان کی بہتری کے لیے ہی کریں گے تاہم کوئی بات آزر نواب میں ضرور ایسی تھی جو انھیں ان سے کبھی بے تکلف نہیں ہونے دیتی تھی ـــــ وہ آزر نواب کی بالا دستی کے شاکی تھے، لیکن ساتھ ہی وہ انھیں اس کا پورا حقدار بھی سمجھتے تھے۔ انھیں یاد آیا کہ بڑے نواب صاحب کے اچانک انتقال کے بعد خاندان کی کئی خود غرض ہستیوں نے بری طرح آزر نواب کے قدم اکھاڑنے چاہے تھے۔ لیکن ان کی ثابت قدمی کے آگے کسی کی ایک نہ چلی تھی۔ عام خیال تو یہ تھا کہ برسوں سے وہ مغرب اور مغربی ماحول کے پروردہ تھے، اس لیے وہ ہندستان واپس نہیں آئیں گے ــــ بلکہ اپنی جایداد بیچ باچ کر وہیں کے ہو رہیں گے اس خام خیالی میں شناالدولہ کے کئی نام لیوا اٹھ کھڑے ہوتے اور جوتیوں میں دال بٹنے ہی کو تھی کہ ایک روز آزر نواب وارد ہوگئے۔ ایک مستقل ارادے اور عزم کے ساتھ۔ انھوں نے سبھی کی چالوں پر پانی پھیر دیا اور وقت کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

بشارت نواب اپنی زندگی کے نئے نظام کے بارے میں سوچتے ہوتے دریچے میں جا کھڑے ہوتے۔ پیڑوں کی سبز چوٹیوں کے دامن میں دھیمے دھیمے بہتی کالی ندی میں مسلسل درختوں کے لمبے لمبے تنے بہے جا رہے تھے۔ ندی کے پار دوسرے کنارے پر، دور پیڑوں کی چھاؤں میں کینوس ایزل پر چڑھائے امین برش سے رنگ لگاتی جا رہی تھی۔ . وہ سوچتے سوچتے مسکرا پڑے۔ ڈانڈیلی کی اجنبی فضا میں امین کی موجودگی بڑی غنیمت تھی۔ جب سے اس نے حویلی چھوڑی تھی، انھیں کئی بار اس کی کمی محسوس ہوتی تھی ـــ انھوں نے لڑکیوں کی کمپنی کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ ان کی دلچسپی اسپورٹس میں تھی۔ کلب میں بھی وہ زیادہ تر ٹینس اور بلیرڈ کے شوق میں جاتے تھے۔ لڑکیاں ٹمبل ٹینس کھیلتے ہوتے جو ہو ہا مچاتی تھیں، انھیں بہت غصہ آتا تھا۔ ان کے تصنع اور نزاکت کے ڈھونگ دیکھ کر بشارت نواب کا دل چاہتا تھا کہ اپنے ٹینس ریکٹ اس زور سے ان کے سروں پر ماریں کہ ان کے کھوکھلے سر جھنجھنا جائیں۔ لیکن امین کے ساتھ ہوتے ہوتے انھیں ایسے پرتشدد خیالات نہیں آتے تھے۔ اس کا سیدھا، سادہ، فطری بر تاؤ ہنسنے کا بے ساختہ

ڈھنگ اور اپنے ماحول کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں قدرتی اور کبھی ختم نہ ہونے والی دلچسپی، اسے ان ساری لڑکیوں سے مختلف بناتی تھی جو ان کے بورژوا ماحول سے تعلق رکھتی تھی۔

انھوں نے دیکھا کہ امین نے گھڑی دیکھ کر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا اور ایزل کندھے پر جمائے گیسٹ ہاؤس کی طرف واپس ہونے لگی۔ بشارت نواب نے سوچا، دہ مارا!۔۔۔ اور خود بھی گیسٹ ہاؤس جانے کے لیے پلٹے۔

"اہم، اہم"۔۔۔ بھسنور مٹھ اپنی بغل میں کچھ فائلیں اور ہاتھ میں لکڑی کے کچھ سیمپل لیے کھڑے تھے۔ بشارت نواب اپنی بیتابی میں بھول ہی گئے تھے کہ ان کی لاشعوری کا زمانہ بیت گیا تھا۔

"آ گیا محنت کا فرشتہ"۔۔۔ بشارت نواب نے دھم سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

بھسنور مٹھ مقامی آدمی تھے۔ آزر نواب کو پورا ان پر بھروسا تھا۔ بھسنور مٹھ کے نیک اور دوستانہ چہرے پر چمکتے دانتوں کی بتیسی بھی گویا کہہ رہی تھی کہ "بشارت نواب، اب تو آپ برے پھنسے!" وہ بشارت نواب کے کھلنڈرے پن کو اچھی طرح جانتے تھے اور اب جبکہ آزر نواب نے انھیں بشارت نواب کی لگام سونپی تھی تو وہ سوچ رہے تھے کہ ملینا کہاں سے شروع ہو۔

"کل صبح دس بجے ہمیں سینگیز فیلڈ چلنا ہے"۔۔۔ آزر نواب نے فائل پر دستخط کر کے اسے بند کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی ضروری کاغذات یا مراسلے۔۔۔" امین نے پوچھا۔

"نہیں یہ ہماری سوشل وزٹ ہوگی۔ ریاض صاحب کل بمبئی جا رہے ہیں انھیں ضروری اطلاع اور ایک چھٹی دینی ہے۔ امریکہ کے ایک مشہور آرتھوپیڈسٹ وہاں آ رہے ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مس ریاض کے لیے مفید ثابت ہوں۔"

جب ملاقات کی نوعیت نجی تھی تو امین کا ان کے ساتھ جانا کیوں ضروری تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن وہ چپ رہی۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر وہ تیار ہو کر آفس پہنچ گئی۔

اس نے آج خاص توجہ سے بال بنائے تھے اور شیفان کی ہلکی سبز ساری میں اس کے جسم کے متناسب خطوط اور بھی زیادہ اجاگر ہو گئے تھے۔ اس نے تیار ہو کر شیشے میں اپنے عکس کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں ساری کا سبز رنگ جھلکنے لگا تھا۔ جس میں ملا جلا خود اعتمادی کا رنگ بھی تھا۔ جو اسے تقویت بخش رہا تھا۔ اس نے آج خاص تیاری مس ریاض کے لیے کی تھی ۔۔۔ کیوں کی تھی، وہ

خود نہیں جانتی تھی۔ ویسے یہ اس کا تجربہ تھا کہ جب وہ نک سک سے درست، موزوں لباس پہنتی ہوتی تو خود کو زیادہ معتبر اور با ہمت محسوس کرتی تھی۔

جب وہ پہنچی تو آزر نواب سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے ــــ ان کی مقناطیسی نظروں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا ــــ پھر وہ دھیرے دھیرے چل کر اس تک پہنچے ــــ وہ اسے اس طرح چندھیائی ہوئی آنکھوں سے کیوں دیکھ رہے تھے؟ وہ تیار تی، آنکھوں کی وہ نشیلی دھار، وہ لباس کی جاذبیت ان کے لیے تو نہیں تھی! پھر کیوں ان کے اس طرح دیکھنے سے ایمن چور سی محسوس کرنے لگی تھی۔

آزر نواب نے سونگھنے کے انداز میں زور سے سانس کھینچی۔

"JOLIE MADAME ــــ" انھوں نے ابرو چڑھا کر کہا، "خوشی کی بات ہے کہ پرفیومز میں آپ کی پسند گھٹیا نہیں ہے۔"

اس نے جو پرفیوم لگایا تھا، وہ بشارت نواب اس کے لیے تحفے کے طور پر لائے تھے ــــ نام تو اس نے اس خوب صورت شیشی پر پڑھ لیا تھا لیکن اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنا قیمتی ہوگا۔ اس نے چونک کر انھیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں استعجاب کی لہر سی دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ آزر نواب کیا سوچ رہے تھے۔ انھیں ضرور حیرت ہو رہی ہوگی کہ بڑی سرکار کی 'جنرل اسسٹنٹ' کی حیثیت ایسی کس طرح ہوگئی کہ اتنا قیمتی پرفیوم استعمال کرسکے۔

"یہ . . . یہ کسی کا تحفہ ہے نا۔" اس نے اسی احساس کے بوجھ تلے دب کر کہا۔ ورنہ اس صراحت کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہیں وہ پھسل پڑی۔

"کسی کا؟" آزر نواب کا ایک ابرو کمان بن گیا۔

"کون ہے وہ خوش قسمت جس کے تحفوں کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا ہے؟" ان کے الفاظ میں طنز کی تلخی رچی ہوئی تھی۔ "بہرحال سرکار کی جنرل اسسٹنٹ اتنی معصوم نہیں ہیں جتنی ہم سمجھ بیٹھے تھے" یہ الفاظ گویا انھوں نے اپنے آپ سے کہے تھے لیکن وہ، ایمن کے دل پر تیر بن کر لگے ــــ "موننہ جولی مادام!" گویا انھوں نے اپنا غصہ کسی پر نکالا! "اب چلیے مادام انتظار کس بات کا ہے؟" ــــ اور وہ جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔

گیٹ سے نکل کر جیپ سیدھی سڑک پر ہولی۔ جدھر راستے پر چڑیا گھر بنایا جا رہا تھا۔ ابھی وہاں زیادہ جانور نہیں تھے ــــ ہرنوں کا ایک جوڑا جالی میں اپنی تھوتھنیاں نکالے مونگ پھلی کے دانے

کھار ہا تھا جو باہر کھڑے کچھ بچے چیل چیل کر دیتے جا رہے تھے۔

امین بالکل چپ چاپ بیٹھی رہی ۔۔ آزر نواب کی بے سبب درشتگی نے اس کی انا کو دھکا پہنچایا تھا۔ لیکن اسے سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔ پھر وہ آزردہ ہو کر اپنی پسپائیت کا مظاہرہ بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"دنیا کے عظیم فلسفیوں میں ایک نام کا اور اضافہ ہوا چاہتا ہے"۔ آزر نواب سڑک پر نظریں جمائے ہوتے بولے "امین شہاب"

امین اپنے خیالات سے چونکی "یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہوگی کہ مرد فلسفیوں کی لمبی چوڑی فہرست میں ایک عورت کا نام بھی شامل ہوگا"۔ وہ بولی ۔

"لیکن یہ بات طے ہے کہ عورت کبھی ایک اچھی فلسفی یا اونچے درجے کی شاعر نہیں بن سکتی ۔" آزر نواب بولے ۔ وہ شاید خاموشی سے اکتا گئے تھے ۔

"میرے خیال میں تو مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ سلجھی ہوئی فلسفی ہوتی ہیں اب یہ اور بات ہے کہ ان کے نام درج فہرست نہیں ہوتے"۔

"یہ دعوا تو ہر عورت کرتی ہے ۔۔ لیکن تم کیوں اس بات پر یقین رکھتی ہو؟"

امین نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ بات جب بحث و مباحثے کے حدود میں داخل ہو جائے تو انسان کو ذہنی طور پر تیار ہونا پڑتا ہے۔ وہ شاید اپنے خیالات میں ردو بدل کر بھی سکتی تھی لیکن آزر نواب کے دعوے کی قطعیت نے اسے ضد سی دلا دی تھی ۔

"میرے یقین رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو جانی مانی بات ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ حساس، زیادہ قوت برداشت کی مالک اور زیادہ دور رس ہوتی ہے ۔۔ اس کے علاوہ چونکہ نرم دل ہوتی ہے، اس لیے اندھی اور بے جان منطق کی غلام نہیں ہوتی ۔ اور ایک اچھا فلسفی اور شاعر ہونے کے لیے یہ خصوصیات بہت ضروری ہیں ۔ کشمیر کی للہ عارفہ، کو دیکھیے یا خود یہاں، کرناٹک کی اکا مہادیوی جن کے وچنوں کی کتاب خود آپ کی لائبریری میں موجود ہے"

"اُفوہ، خاصی بھلی تقریر ہو گئی !" آزر نواب نے مسکرا کر کہا۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنے کستے ہوئے جملوں سے اس کا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے کہا۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ ساری تاریخ میں ہمیں کہیں کسی عورت کا نام، ارسطو، کارل مارکس، روسو یا پھر شاعروں میں ٹینی سن، شیلے یا غالب یا اقبال کی ٹکر کا نہیں ملتا؟"

"اس کی وجہ آپ خود ہیں"۔ امین بولی۔

"میں؟" آزر نواب حیرت سے بولے۔

"میرا مطلب ہے مرد — مرد کبھی عورت کو فراست میں خود سے برتر دیکھنا پسند نہیں کرتا"
امین نے جوش سے کہا۔

"کیا میں آپ سے ایک سوال کرنے کی جرات کر سکتا ہوں؟" آزر نواب نے بڑے سلیقے سے اجازت مانگی۔

"جی — فرمایئے" امین نے نئے حملے کے مقابلے میں پینترا بدلا۔

"کیا آپ پسند کریں گی کہ جو خوش قسمت آپ سے شادی کرے وہ آپ Intellectually کمتر ہو؟"

"ہرگز نہیں" امین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ دراصل وہ اس ذاتی سوال کے لیے تیار نہیں تھی۔

"مس شہاب" There the matter ends — آزر نواب بولے "میرے خیال میں عورت کی سب سے بڑی قوت تو اس کی کمزوری میں چھپی ہے"

"تو کیا آپ کے خیال میں عورت کو انٹیلیکچول نہیں ہونا چاہیے؟" امین نے شکایتاً پوچھا۔

"میں نے تو یہ نہیں کہا" آزر نواب نے فوراً اس کی بات کاٹی "ایک ذہین اور سلجھی ہوئی عورت تو مرد کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہوتی ہے۔ وہ مرد سے ہر میدان میں ٹکر لے سکتی ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی صفت پھر بھی اس کا عورت پن ہی ہے"

"ہاں اس کی کمزوری، جس سے مرد فائدہ اٹھا رہے ہیں" امین نے طنز سے کہا۔ ~~کمزوری ہی کو~~
آزر نواب نے گیئر بدلتے ہوئے اسے دیکھا "اب یہ تو عورت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی کمزوری ہی کو قوت کی طرح کیسے استعمال کرتی ہے"

"بڑی سرکار بھی یہی کہتی ہیں" — امین نے دو ایک موقعوں پر بڑی سرکار کے اظہار خیال کو یاد کر کے کہا۔

"ایسا لگتا ہے سرکار اپنی جنرل اسسٹنٹ سے خوش ہیں" آزر نواب بات کا رخ موڑتے ہوئے بولے۔

امین چپ ہو گئی۔ ان دونوں کے مابین اس وقت کافی دوستانہ فضا بن گئی تھی۔ امین کے لیے یہ بہت غنیمت تھا۔ ورنہ آزر نواب جان بوجھ کر کوئی داؤ چلتے اور امین جو خود ہی اپنی اندرونی کشمکش

میں مبتلا ہوئی ان کا شکار ہوجاتی ۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ ان کے دام سے اپنا دامن بچاتی رہے ۔

ہوا میں بانس کے پتوں کی سرسراہٹ تھی ۔ کچی لیکن صاف سیدھی سڑک پر جیپ ہمواری سے چلی جارہی تھی ۔ ایمن کی نظر آزر نواب کے چہرے پر سے گزرتی ہوئی ان کے اسٹیرنگ سنبھالے ہوئے ہاتھوں پر پڑی ۔ وہ اور ان سے متعلق ہر چیز ان کے خسروانہ پس منظر کی شہادت دیتی تھی ۔ کشادہ پیشانی پر گھنے بالوں کا اگاؤ ۔ جس کے ایک ایک خم سے ایمن اچھی طرح واقف ہوگئی تھی ، مقناطیسی سیاہ آنکھیں ۔ سیدھی ناک کے نیچے قدرے بڑا دہانہ جس کی ہر جنبش ایمن کو لڑکھڑا دیتی تھی ۔ ٹھوڑی کا متکبر خم اور مضبوط گردن کا تناؤ جو ان کے مستحکم ارادے اور خود مختاری کا غماز تھا ۔ ان کے چوڑے شانوں پر ہر لباس جچتا تھا ۔ اس وقت بھی وہ نیلگوں قمیص پر سفید کشمیری جیکٹ پہنے ہوئے تھے ، سفید ہی خلالین کی پتلون تھی ، جسے بیٹھے ہوئے انھوں نے کچھ اوپر کھسکا لیا تھا ـــــ جہاں پتلون کی کریز ختم ہوتی تھی وہاں ان کے پاؤں براؤن سینڈلوں میں نہایت صاف ستھرے نظر آرہے تھے قمیص کے کفوں میں مدر آف پرل کے کف لنک ان کے ہاتھوں کی حرکت پر اپنی مدھم چمک دے جاتے تھے ۔ ان کے ہاتھ حیرت انگیز طور پر خوش وضع تھے ۔ وہ ان محنت کش ہاتھوں سے بہت مختلف تھے جنھیں پیٹ کی آگ بجھانے کو دھرتی کا کلیجا نوچنا پڑتا ہے ـــــ وہ کپکپاہٹ نہیں تھی جو زندگی کے بوجھ کو ناقابل برداشت بنا دیتی ہے ۔ اور ان لمبی انگلیوں والے ہاتھوں کی گرفت ، ایسا لگتا تھا کہ زندگی کے چکر پر بھی اتنی ہی قادر ہوگی ، جتنی اس وقت جیپ کے اسٹیرنگ وھیل پر تھی ۔ وہ اسٹیرنگ کی ہر جنبش سے واقف تھے ۔ " کیا یہ ہاتھ کبھی کدال بھی اٹھا سکیں گے ، کبھی پتھر توڑ سکیں گے ! ایمن نے سوچا ـــــ لیکن ہر ہاتھ کدال تھامنے اور پتھر توڑنے کے لیے ہی تو نہیں ہوتا ۔ دنیا میں اور بھی تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ چابکدستی اور اہلیت کے ساتھ ہو رہا ہے یا نہیں ۔

جیپ میں ان کے برابر بیٹھے ہوئے ، ان کے بارے میں مسلسل سوچتے ہوئے بھی ایمن اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ آزر نواب کے شیش محل سے اس کی بستی بہت دور تھی ـــــ پھر بھی ان کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی تھی ؟ اس حویلی کے بھلے برے کو اپنا بھلا برا کیوں سمجھنے لگی تھی ۔ ؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ حویلی میں پہنچ کر ہی اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا ۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ ایسا ہی سمجھتی رہے لیکن کبھی کبھی دھوکے کی یہ دیوار دھڑ دھڑا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ڈھیر ہوجاتی ـــــ اسے حویلی اور حویلی والوں سے انس ضرور تھا ، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے آزر نواب اور ان سے تعلق رکھنے والی ہر شے ، بہت قیمتی بہت ہی عزیز ہوگئی تھی ۔ وہ دل میں درد کی ایک لہر لیے اقرار کرتی کہ اسے آزر نواب سے واقعی محبت

ہوگئی تھی۔ ان کے وحشت اور سفاک برتاؤ کے باوجود ان کے لاتعداد معاشقوں کے باوجود جنھیں جھٹلانے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے تصور میں خود اس کے ذہن کی تخلیق ان سب لڑکیوں کی شبیہیں ابھریں جو سیمیں بدن تھی، مغربی تمدن کی پروردہ اور نازوں کی پالی، جو آزر نواب کے آگے بچھ بچھ جاتی ہوں گی۔ آزر نواب جسے چاہتے اپنی دلھن بنانے کو چھانٹ سکتے تھے لیکن ان کا دل شاید ابھی تک ہلکے پھلکے معاشقوں سے بھرا نہیں تھا، جو وہ شادی کے بندھن میں خود کو جکڑ دینے کے لیے راضی ہو جاتے لیکن یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس نے خود کو اس دلدل میں کیوں جھونک دیا؟ — اس نے بڑی بے دردی سے خود کا تجزیہ کیا — جسے وہ محبت سمجھ رہی تھی محض کھوکھلی دیوانہ وار فریفتگی تو نہیں تھی! — زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں خاص طور سے جوانی میں ہر انسان کبھی کسی سے محبت کرنے کا دعوا کرتا ہے۔ لیکن کیا محبت واقعی ایسا کوئی لافانی جذبہ، کوئی قابل اعتبار احساس ہے جس پر انسان اندھا دھند اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اس نے ایک نظر پھر آزر نواب کے سراپا پر ڈالی اور اسے اچانک لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال۔ ایسے نام نہاد جوڑے مضحکہ خیز معلوم ہوتے۔ دراصل یہ آزر نواب کی پُرکشش شخصیت اور ان کے انداز کا جادو ہی تھا جس نے اس کے قدم اکھیڑ دیے تھے۔ وہ بھی آخر گوشت پوست کی انسان تھی۔ وہ بھی ان سے متاثر ہوئی۔ اس نے اپنی حد تک فیصلہ کر لیا کہ لوگوں نے محض جنسی کشش ہی کو محبت کا نام دے دیا ہے۔ اور اگر محبت جنسی کشش ہی کا نام ہے تو یہ صد فی صد ایک حیوانی جذبہ ہے۔ وہ خود کو حیوانی سطح سے بالاتر رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ذمہ دار اور خود مختار انفرادیت قائم رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی ضرور تھی، لیکن کیا ایسا ہو سکتا تھا؟ ہر کوشش کے باوجود وہ کبھی کبھی خود کو فراموش کر بیٹھتی تھی اور ہر بار وہ اپنی مجبوری کا علاج سوچتی، فی الحال اس نے طے کیا کہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھے تاکہ اس کا دماغ کہیں بھٹکنے ہی نہ پائے۔

ریاض صاحب کا بنگلہ کافی بلندی پر تھا۔ چکر دار چڑھائی میں نشیب و فراز تھے۔

"سنبھل کر بیٹھو۔" آزر نواب بولے "ورنہ کہیں کھائی وائی میں گر گئیں تو جنرل اسسٹنٹ کے بغیر سرکار کا کام نہیں چلے گا — اور شاید میرا بھی..." کچھ رک کر انھوں نے جملہ پورا کیا۔ یہ شاید ان کے اپنے انداز میں اس کی خدمات کا اعتراف تھا۔

اوپر چڑھ کر مسطح میدان میں آزر نواب نے جیپ روکی۔ یہ بڑی خوشگوار جگہ تھی — بلندی پر ہوا زیادہ تازہ اور فرحت بخش تھی۔ دور سے بینگیز فیلڈز کی مصروفیات نظر آ رہی تھیں۔ کچ دھات سے لدی ٹرالیاں اس بلندی اور فاصلے سے چھوٹی چھوٹی کھلونوں جیسی لگ رہی تھیں۔ قوی ہیکل کرین

فضا کا سینہ چیرتے دور تک چلے جارہے تھے۔

ریاض صاحب کا بنگلہ بھی بہت خوب صورت تھا۔ بڑے بڑے سایہ دار پیڑوں سے گھرا گل مہر میں آگ سی لگ رہی تھی ـــ آزر نواب نے جیپ کچھ ادھر ہی روک لی تھی، کیونکہ لان پر بڑی چھتری کے نیچے ریحانہ ہاتھ میں بند کتاب لیے پُرشوق نظروں سے ان کی آمد دیکھ رہی تھیں۔ سامنے تپائی پر چائے رکھی تھی۔ وہ شاید آزر نواب کی ہی منتظر تھیں۔

مس ریاض کو متاثر کرنے کی امین کی کوشش رایگاں نہیں گئی۔ کئی بار ان کی نظر نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور پھر وہ آزر نواب سے گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔

چائے پینے کے بعد آزر نواب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مس ریاض آج آپ کے لیے ایک بڑی اچھی چیز آئی ہے" انھوں نے کہا اور آگے بڑھ کر جیپ میں رکھے بریف کیس میں سے ایک بڑا لفافہ نکال لیا۔ مس ریاض تصویر شوق بنی، بے تابی سے انھیں دیکھنے لگیں، جیسے کوئی جادوگر اپنی ٹوپی سے کبوتر نکالنے کو ہو ـــ آزر نواب نے لفافے سے چند کارڈ نکال کر تپائی پر پھیلا دیے اور امین چونک پڑی ـــ یہ بہت ہی خوب صورت ٹیک پلائی وینیر پر پینٹ کیے ہوئے Greeting cards تھے، جن میں کاغذ کی طرح پتلی کٹی لکڑی کے قدرتی نقشوں کو برقرار رکھتے ہوئے، بڑی چابکدستی سے مختلف ڈزائن میں پینٹنگ کی گئی تھی۔ مس ریاض انھیں دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھیں۔

"ہائے کتنے حسین ہیں یہ کارڈ! یہ سب میرے لیے لائے ہیں آپ؟ ہاؤ موسٹ"

لیکن امین کے چونکنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ وہی کارڈ تھے جو دو دن پہلے اس نے بنا کر بڑی سرکار کو تحفتاً دیے تھے۔ آزر نواب کے آفس سے جانے کے بعد جب وہ کاغذات ٹھکانے سے رکھ رہی تھی تو ردّی کی ٹوکری میں پڑے ہوئے یہ وینیر نکل آئے تھے، جو شاید آزر نواب کے ملاحظے کے لیے آئے تھے اور جنھیں دیکھ کر انھوں نے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا ـــ وہ انھیں چن کر اپنے ساتھ لے آئی تھی اور فرصت کے اوقات میں پینٹ کر کے مبارکبادی کے کارڈ بنا لیے تھے جب وہ بن کر تیار ہوگئے تو اس نے صرف دو خود کے لیے رکھ چھوڑے اور باقی سمیٹ کر بڑی سرکار کو دینے چلی۔ کتنے کم لوگ تھے دنیا میں جنھیں اس کی نیک تمناؤں کی ضرورت تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک کارڈ وہ مسز آئزاک کو بھیجوا دے گی اور دوسرا وقار جنگ کو۔

اب ان کارڈز کو اپنے سامنے تپائی پر بکھرے دیکھ کر امین کو دکھ سا ہوا۔ اس لیے کہ جب لے

وہ کارڈ بڑی سرکار کو دیے تھے تو وہ بہت خوش ہوئی تھیں اور بڑی گرم جوشی سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر کہا تھا کہ وہ انھیں صرف اپنے خاص خاص دوستوں ہی کو نیک تمناؤں کے ساتھ بھجوائیں گی۔ وہ شاید امین کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں ــــ اب وہ سارے ہی کارڈ مس ریحانہ ریاض کے حضور پہنچ گئے تھے کیونکہ بظاہر بڑی سرکار کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ یا پھر انھوں نے انھیں اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ استعمال کریں۔

آزر نواب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کارڈز پر رکھ دیے اور مسکرا کر بولے "نہیں ــ نہیں، اتنی جلدی نہ کیجیے۔ اگر میں نے یہ کارڈ آپ کو دے دیے تو سرکار مجھے سولی پر چڑھا دیں گی۔"

امین کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا ــــ اس کی سنہری آنکھیں چمک اٹھیں، اور اس نے آزر نواب کو دیکھا ــ کتنی نرمی تھی ان کی مسکراہٹ میں ــــ وہ نرمی شاید صرف مس ریاض کے لیے تھی۔ ورنہ انھوں نے کبھی امین کو اس کا حقدار نہیں سمجھا تھا۔

"میں اس سے زیادہ بیش قیمت چیز آپ کے لیے لایا ہوں" ــ آزر نواب نے کہا اور امین کی طرف دیکھنے لگے "ان کارڈوں کے بنانے والے ہی کو میں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ مس شہاب خود ہی آپ کو یہ کارڈ بنانا سکھائیں گی۔" ان کی نظروں میں ایسا بھرپور اور اپیل تھی کہ امین کے احتجاج کرتے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اور اس نے صرف سر ہلا کر 'ہاں' کر دی۔

آزر نواب کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک سی پیدا ہوئی اور امین کو پچھتاوا ہوا کہ کیوں اس نے 'ہاں' کی۔ آزر نواب کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی خدمات دوسروں کو بانٹتے پھریں۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"آپ نے شکایت کی تھی نا کہ کتابوں میں آپ کا جی نہیں لگتا، آپ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتی ہیں۔ یہ کارڈ بنانے والا مشغلہ ضرور آپ کو دلچسپ لگے گا" ــــ آزر نواب ریحانہ سے مخاطب ہو چکے تھے۔

"اس کے لیے تو پینٹ وغیرہ کی ضرورت ہوگی" ــ ریحانہ نے کوئی خاص جوش نہیں دکھایا۔

"وہ سب کچھ ہم لے آئے ہیں" ــ آزر نواب بولے اور جیب کی طرف لوٹے "دراصل یہ تحفہ آپ ہی کے لیے ہے" ــ انھوں نے ایک نہایت خوب صورت پارسل کھولتے ہوئے کہا جس میں بڑھیا قسم کے رنگ اور برش تھے۔ اور یہ رہے ہاتھ کے بنے کاغذ اور پینٹ" ــ انھوں نے دوسرے بنڈل

کی طرف اشارہ کیا۔ ”مس شہاب اپنی فرصت کے چند لمحے ضرور آپ کو دے سکیں گی“۔ آزر نواب نے ایسے کہا جیسے ایمن نے اپنی طرف سے پورا حق انھیں دے دیا ہو۔

”اچھا اب چلتے ہیں — فیلڈز پر ریاض صاحب سے کچھ ضروری بات کرنی ہے“۔ آزر نواب نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”آدھے گھنٹے میں لوٹ آؤں گا“۔ انھوں نے ایمن سے کہا اور دونوں لڑکیاں انھیں پلٹ کر جاتے ہوئے — جیپ میں بیٹھتے ہوئے اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک ڈھلان پر جیپ غائب نہ ہو گئی۔

ایمن کو یکایک زبردست تنہائی کا احساس ہوا۔ ریحانہ کے تیور کچھ دوستانہ بھی نہیں تھے۔ کچھ دیر دونوں یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔ آزر نواب کی جیپ پیچدار ڈھلوان راستے کو طے کر کے اب پھر فیلڈز کی طرف جاتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اڑتے ہوئے دھول کے بگولے اس کے پیچھے دوڑے جارہے تھے۔ راستے کے ایسے غبار بھی کسی کو نہیں چھو پاتے۔ تھک کر راستے ہی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مسافر اپنی منزل جالیتا ہے — ایمن، آزر نواب کے پیچھے دوڑتا ایسا غبار نہیں بننا چاہتی تھی — لیکن وہ کیا کرے۔

ایمن نے محسوس کیا تھا کہ مس ریاض کی بے رخی محض اسی وجہ سے نہیں تھی کہ اس کی حیثیت آزر نواب کی تنخواہ پانے والی ملازم کی تھی — بلکہ شاید وہ اس کی شخصیت میں کسی اور طرح کا خطرہ بھی دیکھ رہی تھیں۔ ایمن اپنی جاذبیت سے اتنی ناآشنا بھی نہیں تھی کہ اسے صرف اپنا وہم سمجھے — لیکن وہ مس ریاض کے دل سے یہ ڈر دور کر دینا چاہتی تھی — تاہم یہ ایسا نازک مسئلہ تھا کہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی صفائی پیش بھی نہیں کر سکتی تھی اس کے باوجود وہ ڈر بھی رہی تھی کہ ریحانہ خود کو آزر نواب کے دام میں نہ پھنسا بیٹھے۔ اسے ریحانہ سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اسی لیے اس کی بے رخی اور قدرے مغرورانہ برتاؤ کے باوجود ایمن نے طے کیا تھا کہ حتی الامکان اس کی مدد کرے گی — عام طور پر اس کے لیے کسی کو جیتنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ اس میں خودداری ضرور تھی لیکن ہٹ دھرمی نہیں تھی — نہ کوئی ایسی ہار تھی جو اس کی کشمکش کرنے کی امنگ کو دبا سکتی ہو — وہ ہر ناگوار یاد کو بھول جانا چاہتی تھی اور اکثر اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی تھی۔ اس کے گالوں کے ننھے سے گڑھوں میں، جو ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی رونما ہو جاتے تھے، پتا نہیں بچپن کی کتنی محرومیاں اور لڑکپن کی ناکام کاوشیں ڈوبی پڑی تھیں اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے خندہ پیشانی سے زندگی کی جدوجہد کا لطف پالیا تھا جو عام طور پر ایک محفوظ ماحول کی لڑکی کو حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اس نے کبھی اپنے قدم متزلزل نہیں ہونے

دیے تھے۔

اس نے اپنے خیالات سے چونک کر ریحانہ کو دیکھا ـــــ جو بیزار سی وھیل چیئر میں بیٹھی اپنے لمبے لمبے ناخنوں کا معائنہ کر رہی تھیں ـ کٹے ہوئے چمکدار سیاہ بال ـ سرخ و سفید رنگ جس پر فیروزی شیفان کی ساری بہت بج رہی تھی ـ سیاہ مصنوعی پلکیں ان کے رنگے ہوئے گالوں پر پھڑ پھڑا رہی تھیں ـ انگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی اور کلائی میں نہایت ہی نازک بہت سی سونے کی چوڑیاں ـ کیا یہ سب آزر نواب کے لیے تھا؟ ـ ایمن کو ریحانہ پر رحم آیا ـ یا پھر اس طرح بنے ٹھنے رہنا ان کی جسمانی خامی کا ردِّعمل تھا ـ عین جوانی میں یہ دھکا بہت جان لیوا ہوتا ہے ـــ اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتی آزر نواب واپس آگئے ـ ریحانہ نے رکنے کو کہا تو انھوں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے معذرت کی اور ایمن کو لے کر چل پڑے ـ

”کہاں تک بات بڑھی؟“ ـــ آزر نواب نے سیدھی سڑک پر آتے ہوئے ایمن سے پوچھا ـ

”کچھ خاص نہیں“ ـــ ایمن نے احتیاط سے گول مول جواب دیا ـ

”ریاض صاحب بہت مالدار ہیں“ ـــ

ایمن چپ رہی ـ وہ جانتی تھی کہ شہر فیکٹری میں ریاض صاحب نے بھی اپنا پیسا لگا رکھا تھا ـ اسے شبہہ ہوا تھا کہ کہیں ان کی دولت کی کشش ہی تو آزر نواب کو ریحانہ کی طرف ملتفت نہیں کر رہی تھی! ـــ آزر نواب خود رئیس تھے تو کیا ہوا ـ پیسے کی چاہ تو پیسے والوں ہی کو ہوتی ہے ـ غریب تو صرف زندگی کاٹنے کی فکر کرتا ہے ـ

”ریاض صاحب بہت دولت مند ہیں“ ـ ایمن کا جواب نہ پا کر انھوں نے پھر کہا ”لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشیاں نہیں خرید سکتے“ ـ

”کیا ہیں سمجھی نہیں؟“ ـ ایمن نے اب تجسس سے پوچھا ـ

”ریحانہ شادی شدہ ہے“ ـــ آزر نواب بولے اور ایمن کو دھچکا لگا ـ

”پھر، پھر وہ خود کو مس ریاض کہلوانا کیوں پسند کرتی ہیں؟ کیا ان کے شوہر نے انھیں چھوڑ دیا ہے“ ـ ایمن پوری طرح جاگ گئی تھی ـ

”نہیں ـــــ انھوں نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ہے“ ـ

”انھوں نے خود چھوڑ دیا ہے؟ ضرور کوئی وجہ ہوگی، ورنہ کوئی عورت اپنی زندگی کے ساتھی کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی“ ـ

"یہ آپ پھر اپنی قسم کی لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں گی"۔ آزر نواب اپنی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ جو ایمن کو ہمیشہ غصہ دلا دیا کرتی تھی۔

"ہاں" ایمن نے کچھ زیادہ ہی تاکید کے ساتھ کہا "اگر میں نے کبھی کسی کو زندگی کا ساتھی چنا تو پھر یہ ہمیشہ کے لیے ہوگا"

"اپنی اس 'اگر' کو قائم رکھیے گا"۔ آزر نواب نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "کم از کم میں تو ایسی عورت نہیں چاہتا جسے انگلی لگاؤ تو گلے کا ہار ہی بن بیٹھے۔

ایمن نے منہ پلٹا کر غصے سے اپنا ہونٹ چبا ڈالا۔ تو کیا وہ واقعی عورت کو وقت گزاری کا مشغلہ سمجھتے تھے؟۔

"شاید مس ریاض میں آپ کی دلچسپی اسی 'اگر' کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے یا ان کی دولت . . . ؟"

جیپ ایک دھچکے سے رک گئی۔ ہر طرف بلند و بالا سبز گھنیرے پیڑوں کے درمیان سرسراتی ہوئی پتلی سڑک پر وہ جیپ تنہا تھی۔ ایمن آنے والے طوفان سے ڈر کر سہم گئی تھی لیکن اس نے چہرے کو پُرسکون رکھا۔ بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتی رہی۔

لمبی انگلیوں والا ایک مضبوط ہاتھ، پیچھے بالوں کے نیچے اس کی گردن تک پہنچا۔ ہولے ہولے وہ انگلیاں اس کی گردن کو چومتی ہوئی بالوں میں سرسراتی رہیں۔ پھر ان کی گرفت گردن پر سخت ہوگئی۔ آزر نواب نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"اس بلوری گردن کو کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ مروڑ کر پھینک دوں"۔ آزر نواب نے دانت پیس کر زیر لب کہا۔ گردن پر ان کے ہاتھ کی گرفت ایمن کو ان کے چہرے کے بہت قریب کھینچ لائی تھی۔ ایمن نے بڑی ہمت سے آنکھیں گھما کر ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے سے مسکراہٹ تو غائب ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی جگہ کوئی اور ہی تاثر ان کی سیاہ اور گہری آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ جسے ایمن کوشش کے باوجود پڑھ نہ سکی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا اس کا افسوس نہیں تھا اسے۔

"کھولتا ہوا سونا ہے اس وقت ان آنکھوں میں"۔ آزر نواب اس کے ادھ کھلے لبوں کے بہت قریب آتے ہوئے بولے۔ "کوئی بدنصیب ان میں گر جائے تو جنم جنم بھی واپس ہونا نہیں چاہے گا۔ لیکن میں بقول تمہارے بہت تجربہ کار ہوں۔ میں اس سنہری سمندر میں نہیں ڈوبوں گا کبھی۔ میں پی جاؤں گا اس سمندر کو" اور ان کے لبوں نے جھک کر اس کی دونوں آنکھوں کو چھو لیا۔

ایمن نے ایک جھٹکے سے اپنا سر چھڑالیا اور کھسک کر بالکل کونے میں دھنس گئی۔
"آپ کو اپنے بارے میں بڑا بھرم ہے" اس نے سینے میں ٹکریں مارتے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا "وہ کون بدنصیب لڑکی ہوگی دنیا میں جو آپ سے شادی کرنے کا خطرہ مول لے گی" کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کے ارتعاش کو دبا نہ سکی تھی۔
آذر نواب نے جواب میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر جیپ اسٹارٹ کردی۔ اور کچھ دور تک فضا میں صرف ان کی سیٹی کی آواز گونجتی رہی۔

QUE SERA SERA
WHAT EVER WILL BE WILL BE
THE FUTURE'S NOT OURS TO SEE.

مستقبل ـــــ اوہ مستقبل!
محویت کے عالم میں بڑی سرکار جب لکھواتی جاتی تھیں تو ان کی کیفیت کچھ عجیب ہو جاتی تھی ـــ وہ لمحے بڑے انجذاب کے ہوتے ـــ کروٹیں لیتی ہوئی تاریخ ایک اژدہے کی طرح نہ صرف افراد کو ہضم کر جاتی ہے بلکہ کئی مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں شہر کے شہر اس نے چوپٹ کر دیے ہوں)۔ ویسے انسانی تاریخ یوں بھی خونیں داستانوں سے بھری پڑی ہے۔
"شاہان قطب شاہ کا سلسلہ ترکستان سے ملتا ہے۔ محمود شاہ بہمنی کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۱۰ء میں گولکنڈہ کو اپنا مسکن بنایا تو اس کا نام محمد نگر رکھا۔ ننانوے سال کا سن ایک برگد کو بھی تقدیس بخش دیتا ہے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ شاہوں نے کبھی اگر رشتوں کا لحاظ کیا تو پدمنی اور ہمایوں کی مثالیں قائم کردیں۔ وہیں، بے شمار ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ بیٹوں نے تخت وجاہ کے لیے اپنے برگزیدہ باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ چنانچہ سلطان قطب شاہ جب ننانوے سال کی عمر میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا تو اس کے بیٹے یار قلی نے محمود ہمدانی نامی شخص سے اس کو قتل کروا دیا ـــ اور محمود ہمدانی جب اپنا انعام حاصل کرنے کو پہنچا تو اس کے لیے بھی وہاں جلاد منتظر تھے جنھوں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا ـــ اس کا دور حکومت حیدرآباد کی تاریخ کا بدترین دور کہا جا سکتا ہے . . ."
لکھتے لکھتے ایمن کے ہاتھ شل ہو جاتے، لیکن اس کی دلچسپی یکساں برقرار رہی۔ حتّٰی کہ بڑی سرکار خود اپنی رطب اللسانی سے چونکتیں اور ایمن کو کام بند کرنے کی اجازت دیتیں۔
ایمن جب اپنے کاغذات سنبھالے باہر نکلی تو برآمدے میں منڈلاتے ہوئے ہلکی ہوا کے جھونکوں

میں نارنگیوں کے شگوفوں کی مدھم مہک تھی۔ اس کے پاؤں وہیں رک گئے۔ خوشبو کی بھی چشمی ہوتی ہے جو دامن تھام لیتی ہے۔ سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ بشارت نواب رافٹ پر ندی پار کر رہے تھے۔ شاید وہ ٹمبر فیکٹری جا رہے تھے۔ دور سے ایمن کو دیکھ کر انھوں نے ہاتھ ہلا دیا۔ ایمن نے اپنا رومال ہلا کر انھیں جواب دیا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کو پلٹ ہی رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ کیونکہ رافٹ بیچ ندی سے واپس لوٹ رہا تھا۔ لمبے بانس کا چپو ندی کے سینے میں پیوست کر کے بشارت نواب اسے ہاتھ سے اشارے کر رہے تھے۔ وہ رک گئی۔ ایمن نے انھیں چند دن سے نہیں دیکھا تھا۔ آزر نواب کے اور ان کے اوقات ہی ایسے تھے کہ کھانے کے ٹیبل پر بھی روز ان کی ملاقات نہیں ہوپاتی تھی۔ صبح کو وہ دونوں رائڈنگ کے لیے چلے جاتے۔ بڑی سرکار، ناشتہ، لنچ اور ڈنر کے اوقات کی بہت پابند تھیں۔ آزر نواب صرف اسی وقت ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے جب وہ وقت کی پابندی سہولت سے کر پاتے اور بشارت نواب کو آزر نواب کا ساتھ دینا پڑتا۔ ان کے لیے موزوں بھی یہی تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ آزر نواب کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ آزر نواب نے گویا تہیہ کر لیا تھا کہ انھیں کھلنڈرے پن کے دور سے نکال کر مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر ہی رہیں گے۔ انھوں نے بھنور مٹھ کو یہ ذمہ داری سونپ دی تھی جو نہایت خشوع و خضوع سے بشارت نواب کو ٹمبر اور بزنس کے داؤ پیچ سکھانے پر تل گئے تھے۔ آزر نواب نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس شعبے میں ان کی کارگزاری دیکھ کر ہی ان کا جیب خرچ مقرر کیا جاتے گا۔ تب تک انھوں نے اُیڈ ہاک الاؤنس مل جاتا۔۔۔۔ لیکن بشارت نواب پر اپنی گرفت سخت کرتے ہوتے بھی آزر نواب نے ان کے شوق اور بہتری کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ انھیں ویسٹ کوسٹ پہیہ بلدنگ کے کلب کا ممبر بنا دیا تھا، جہاں وہ روز اپنا ٹینس کا شوق پورا کر سکتے تھے۔ اب اصطبل میں آزر نواب کے چہیتے گھوڑے "قلزم" کے برابر ایک اور بانکا، اونچا پورا گھوڑا نظر آنے لگا تھا جو خاص طور پر بشارت نواب کے لیے خریدا گیا تھا۔

ایمن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بشارت نواب آزر نواب سے ڈرتے تھے۔ اب جبکہ وہ بالکل ان کی گرفت میں آ گئے تھے تو اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنے چوکس رہتے ہوں گے۔ وہ ان کے رافٹ کو کنارے لگتے دیکھتی رہی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔۔۔۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا اور کمرے میں کاغذات رکھ کر جلدی جلدی سیڑھیاں طے کر کے چٹانوں کی طرف ہولی، جہاں جبشی سے رافٹ لگائے بشارت نواب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وادی کی تازہ ہوا اور مناسب

مدزش نے ان کی چربی کو چھانٹ کر صحت کو جلا دینا شروع کر دیا تھا۔ انھیں دیکھ کر امین کے دل میں آرزو جاگی کہ کاش اس کا اپنا کوئی بھائی ہوتا، بشارت نواب ہی کی طرح، خوش رو، ہنس مکھ — وہ انھیں دیکھتی ہوئی کنارے پہنچ گئی۔

"ہلو ٹسی کیٹ!" بشارت نواب نے کہا۔

"اپنا دیا ہوا نام فوراً واپس لیجیے، ورنہ میں واپس چلی" — امین نے منہ بنا کر کہا۔

"تمھارے تو میں نے ستر ہزار نام رکھے ہیں، اب کون کونسا نام واپس لوں؟" بشارت نواب اس کا ہاتھ پکڑ کر رافٹ پر چڑھاتے ہوئے بولے۔

"میرے پاس بس آدھا گھنٹہ ہے۔ جلدی جلدی بات کر لیجیے۔" امین نے ان کو جلانے کے لیے کاروباری انداز میں کہا۔

"آدھے گھنٹے سے تو کام نہیں بنے گا۔ مجھے تو تم سے جنم جنم کی باتیں کرنی ہیں۔" بشارت نواب نے آنکھیں بند کر کے ٹھنڈی سی سانس بھری۔

"کل کون سی فلم دیکھ آئے تھے؟" امین نے انھیں شانے سے پکڑ کر ہلا دیا۔ "جاگو صاحبزادے یہ فلمی دنیا نہیں ہے — نہ تم ہیرو ہو نہ میں ہیروئن۔"

"فی الحال تو تم سوہنی ہو اور میں مہینوال، اور ہم دونوں بیچ بھنور میں ڈوبنے والے ہیں۔" اور واقعی بشارت نواب نے زوردار چکر دے کر رافٹ کو گھما دیا۔ امین فق ہوگئی — اس کے قدم اکھڑے اور وہ سیدھی پانی میں جا رہی — بشارت نواب ہکا بکا چبوترا فٹ پر بیٹھک کر پکے — وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا یہ عمل امین کے لیے اتنا غیر متوقع ہوگا۔ ان کے چہرے کی رنگت اڑگئی — انھوں نے چھلانگ لگائی اور خود بھی پانی میں کود پڑے۔ شکر ہے ندی کا بہاؤ بالکل ہلکا تھا اور گرتے گرتے امین نے رافٹ کو پکڑ لیا تھا — وہ تیرنا نہیں جانتی تھی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس کا دوپٹا بری طرح اس کے چہرے سے لپٹ گیا، جو اور بھی اس کی پریشانی کا باعث ہوا۔ وہ یوں بھی پانی سے بہت گھبراتی تھی۔ اپنے والد کی ازحد کوشش کے باوجود اس نے تیرنا سیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ سے رافٹ چھوٹتا، بشارت نواب نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔ اسے سنبھالے وہ کچھ دیر رافٹ کے ساتھ بہتے رہے جو اب پانی کے بہاؤ کے سمت میں ہی بہنے لگا تھا۔ وہ ایک اچھے تیراک تھے۔ بہت جلد خود پر اور امین پر قابو پا گئے۔ انھوں نے اس کے دہشت زدہ

چہرے سے دوپٹا الگ کیا، اسے دلاسا دیا اور سہارا دے کر رافٹ پر چڑھا دیا۔

امین کے کپڑے پانی سے شرابور اس کے بدن سے چپک کر رہ گئے تھے یہی حال بشارت نواب کا بھی تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے حادثے کا ان پر وہ اثر نہیں ہوا تھا جو امین پر ہوا اس کے حواس اس کا چہرہ اور لب ابھی تک سفید تھے وہ خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کے حواس ابھی جگہ پر نہیں آئے تھے۔ بشارت نواب نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اس کا سرا پنے شانے سے ٹکا لیا۔

حواس قابو میں آتے ہی امین چونک کر ان سے الگ ہو گئی وہ کانپ رہی تھی۔ بشارت نواب نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"تمہارے ہاتھ تو برف ہو رہے ہیں" وہ پچھتاوے سے بولے۔

"نہیں بس ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ لیکن اب ہم ایسی حالت میں ٹمبر فیکٹری کیسے جائیں گے؟"
اس نے خود اپنی اور بشارت نواب کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم ٹمبر فیکٹری کہاں جا رہے ہیں؟" بشارت نواب اس کی ہتھیلیوں کو گرماتے ہوتے بولے۔

"کیا مطلب؟" امین نے بانہہ کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب صاف ہے" بشارت نواب اپنے گیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "میں تمہیں اغوا کر کے کہیں اور لے جا رہا ہوں۔"

امین ہنس پڑی۔ انھیں اس حالت میں بھی مذاق سوجھ رہا تھا، جبکہ وہ اندر ہی اندر ڈوبی جا رہی تھی۔

"مائی ڈیر امین، اگر آزر نواب کو پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں پانی میں غوطہ دے دیا ہے اور پھر اس درگت میں ہم دونوں فیکٹری پہنچے تو وہ مجھے تو بھوکے شیروں کے آگے پھنکوا دیں گے۔"

"انھیں خبر کیسے ہو گی؟ کیا وہ روز ٹمبر فیکٹری آتے ہیں؟" امین نے پوچھا۔ ان کا ڈر بے بنیاد تھا۔ آزر نواب کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس نے قطعی فیصلہ دے دیا۔

"آفس کے دریچے سے سب کچھ نظر آتا ہے۔ دوسرے، دو جبریل علیہ السلام انھیں میرے متعلق باقاعدہ نیوز بلیٹن دیتے رہتے ہیں" بشارت نواب نے دونوں کانوں کو انگوٹھے لگا کر انگلیاں پھڑ پھڑاتے ہوئے کہا۔ جیسے ہاتھی کے کان بتا رہے ہوں۔ بھنور سنگھ کے کان بہت بڑے بڑے تھے۔

امین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اب تو مان لیجیے کہ آپ آزر نواب سے ڈرتے ہیں!"

"میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ بلائے ناگہانی سے کون نہیں ڈرتا۔"
"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ بھی کسی کو بلائے ناگہانی سمجھتے ہیں۔"
"یعنی آپ کے خیال میں عرت میں ہی بلائے ناگہانی ہو سکتا ہوں؟" بشارت نواب نے منہ بنا کر کہا۔
"اور نہیں تو کیا۔" امین نے ہاتھ آگے پھیلا کر اپنی درگت کی طرف اشارہ کیا۔
"جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، وہ تو مجھے پسند آرہا ہے۔" بشارت نواب آنکھیں جھپکا کر بولے۔
"میں ابھی بھلی برآمدے میں کھڑی ہوا کھا رہی تھی۔" امین نے ان سنی کر کے کہا "مجھے بلایا اور یہ درگت بنا دی۔"
"یہ تمھاری سزا تھی۔" بشارت نواب بولے۔
"سزا کس بات کی؟" امین نے تعجب سے پوچھا۔
"سارے ہفتے تم مجھ سے نہیں ملی ہو۔"
"آپ کو فرصت کہاں ہوتی ہے؟ ادھر مجھے بھی کچھ کام زیادہ رہا اور سچ پوچھیے تو میں اپنی ہی غرض سے آپ کے ساتھ آنے کو تیار ہو گئی۔"
"پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ پھر میں تمھیں ڈوبنے سے بچاتا ہی کیوں۔ خیر اب خود غرضی کی وجہ بتاؤ۔"
"مجھے فیکٹری دیکھنے کا شوق بھی تھا۔ اور وہاں سے کچھ وینیئر بھی لینے تھے۔"
"وینیئر کس لیے؟" بشارت نواب نے پوچھا۔
"آپ شاید جانتے نہیں کہ آزر نواب نے مجھے مس ریاض کو آرٹ سکھانے کا کام سونپا ہے۔"
"Slave driver" —— بشارت نواب لمبا بانس ندی کے سینے میں پیوست کرتے ہوئے بولے۔ "ان کے ہاتھ میں بھالا تھا دو تو بالکل Roman Gladiator —— لگیں گے۔"
امین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اسے بشارت نواب کی تمثیل بہت جامع لگی۔ اس نے کئی بار آزر نواب کو اپنے تصور میں ایسا ہی پایا تھا۔ مردانہ حسن کا نمونہ، عقل و فراست کا پیکر، لیکن جہاں تک اس کا تعلق تھا سخت گیر اور سنگدل بھی۔

بشارت نواب نے رافٹ کو کھینچتے ہوئے کنارے سے لگا دیا تھا۔ لیکن ندی کا وہ کنارہ ٹمبر فیکٹری سے کافی دور تھا۔ اس طرف کی پہاڑیوں کے جنگل اور بھی گھنے اور گنجان تھے، لیکن ڈھلان پر دوب بہت نرم اور تازہ تھی، کیونکہ وہاں اسے روندنے والے قدم بہت کم پہنچ پاتے تھے۔ رافٹ چونکہ ندی کے بہاؤ پر کافی آگے نکل آیا تھا۔ اسی لیے ان کا قریب ترین کنارہ یہی تھا۔ املتاس کے پیڑ زرد پھولوں کے جھنڈوں سے لدے ہوئے تھے۔ اسی کے نیچے کچھ پتھریلی خشک زمین تھی۔

" ہم یہاں اس چٹان پر بیٹھ جاتے ہیں "۔ بشارت نواب بولے، " کچھ دیر میں کپڑے سوکھ جائیں گے۔ پھر ہم ٹمبر فیکٹری چلیں گے۔ یہاں سے بہت دور بھی نہیں ہے "۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر رافٹ سے اترنے کے لیے ایمن کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں پاس پاس چٹان پر بیٹھ گئے۔ ایمن کے ہاتھوں میں اب گرمی آگئی تھی — اس نے اپنے بال کھول کر پھیلا دیئے تاکہ جلد سوکھ جائیں تو انھیں گوندھ لے — وہاں بالکل خاموشی تھی اور اس خاموشی کو چیرتی ہوئی گاہے گاہے ٹکارے کی آواز ماحول کو مادی بنائے ہوئے تھی۔

" تمھاری آنکھوں کا رنگ کیا ہے؟ "۔ بشارت نواب نے انوکھا سوال کیا — شاید وہ بڑی دیر سے یہی سوچ رہے تھے۔

ایمن چونک پڑی۔ بشارت نواب کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنے خیالات کا دھارا کہیں اور موڑ دینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" جو بھی رنگ آپ سمجھنا چاہیں "۔ وہ بولی۔

" مجھے اس وقت تو یہ سبز گوں نظر آرہی ہیں "۔ اس کی آنکھوں کے بالکل قریب ڈوبتے ہوئے بولے۔ " اور کہیں کہیں املتاس کے پیڑوں کا سونا بھی ان میں جھلک رہا تھا "۔

" اور آپ کو ان میں چٹانوں کا فاختئی، ندی کا نیلگوں، بنفشہ کا کاسنی رنگ نظر نہیں آتا؟ " ایمن نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

" وہ سب رنگ بھی ہوں گے "۔ بشارت نواب بولے " لیکن ان میں وہ رنگ نہیں ہے جو میں دیکھنا چاہتا ہوں "۔

کون سا رنگ ؟ " ایمن نے ہوا سے چہرے پر آئی ہوئی بالوں کی چلمن کو ہٹا کر پوچھا۔

" اس رنگ کا کوئی نام نہیں — نام ہوتا تو وہ بھی عامیانہ ہو جاتا "۔

" صاحبزادہ نواب میر بشارت علی خاں "۔ ایمن نے تمسخر سے کہا " آپ کو معلوم ہونا چاہیے

کہ چار فیصدی مرد Daltonism کا شکار ہوتے ہیں یعنی وہ رنگوندھے یا Colour Blind ہوتے ہیں۔ آپ خود نہیں جانتے کہ آپ کون سا رنگ چاہتے ہیں۔"

"نہیں امین۔" بشارت نواب سنجیدہ ہوتے ہوتے بولے "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمھاری آنکھوں میں کون سا رنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔

امین زور سے ہنس پڑی۔ بشارت نواب جب سنجیدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتے تو اسے اسی طرح ہنسی آجاتی اس کے خیال میں بشارت نواب کا سنجیدگی سے دور دور کا رشتہ بھی نہیں تھا۔

"ہم تو بس مذاق اڑانے کے لیے ہی رہ گئے ہیں" بشارت نواب بُرا مان کر اٹھ بیٹھے۔

"اچھا اچھا چلیے اب میں نہیں ہنسوں گی۔" امین نے ہنسی روک کر انھیں بتاتے ہوئے کہا۔

بشارت نواب پاس ہی اُگے ہوئے من جبتھ کے پودے کو اکھاڑ کر اس کی پتیاں نوچنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" امین پودے سے نکلتے ہوئے سرخ عرق کو دیکھتے ہوئے بولی "بعض پودے زہریلے ہوتے ہیں۔"

"یہ من جبتھ کا پودا ہے۔" بشارت نواب بولے "اس عرق سے تاجر اپنے بہی کھاتے لکھتے ہیں ــــ میں بھی تمھارے بہی کھاتے میں اپنا نام لکھنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے امین کا ہاتھ تھام کر اس کی ہتھیلی کھولتے ہوئے کہا۔

بشارت نواب من جبتھ کے عرق سے امین کی ہتھیلی پر اپنا نام لکھتے رہے ــــ امین نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ وہ مسکرا کر انھیں لکھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ ادھوری ہی ہونٹوں پر جم گئی، کیونکہ ان کے پیچھے ہی، کچھ ہی دور چڑھائی پر آزر نواب پتا نہیں کب سے 'تلذم' کی رکابوں میں پیر جماتے انھیں دیکھ رہے تھے۔ اس ہری دوب پر ان کا گھوڑا کب پہنچا، ان دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ تلذم نے بے چین ہو کر جب زمین پر ٹھوکریں ماریں، تب انھیں وہاں ان کی موجودگی کا علم ہوا۔ تلذم شاید ساکن کھڑے کھڑے اکتا گیا تھا۔

امین کی نظر آزر نواب کے چمک دار رائڈنگ جوتوں سے اوپر ان کے جودھپور سے ہوتے ہوئے جیتان تماشاؤں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے ہی کو تھی کہ اس کی خود اعتمادی بحال ہوگئی وہ ان کی

غیر متوقع موجودگی سے چونک ضرور پڑی تھی، لیکن اس نے سوچا کہ اسے گھبرانے یا خجل ہونے کی ضرورت نہیں۔

آزر نواب اسی طرح "قلزم" کی لگام تھامے انھیں دیکھتے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی بے پناہ گہرائی جس میں استعجاب کا شائبہ بھی تھا، بشارت نواب اور ایمن کی حالت زار کا جواز مانگ رہی تھی۔

"یقیناً یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم دونوں جان بوجھ کر یہاں بھاگ آئے ہیں"، ایمن نے کچھ مضطرب ہو کر سوچا ــــ اس کے کھلے بال، گیلے کپڑے اور بے تکلف انداز آزر نواب کے شبہ کو تقویت دے رہے تھے۔ بشارت نواب اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاموشی بعض مرتبہ اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ اٹھائے نہیں اٹھتی۔ انسان خود اس کے بوجھ تلے دبتا ہی جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد آزر نواب "قلزم" پر سے اتر آئے۔

"تمبر سے لدی ہوئی گاڑیاں سویرے سے یارڈ میں رکی پڑی ہیں"۔ انھوں نے ایمن کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بشارت نواب سے کہا۔

"وہ . . . . میں . . . ." بشارت نواب کسی موزوں جواب کی تلاش میں تھے۔

"بشارت نواب!" آزر نواب بات کاٹ کر بولے۔ "آپ ماشاء اللہ اب بچے نہیں ہیں"۔ انھوں نے بشارت نواب کی کچھ کہنے کی کوشش کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "اور جو بچہ نہیں ہے وہ اپنا جوابدہ آپ ہی ہے"۔

صرف بشارت نواب کا ہی نہیں ایمن کا بھی چہرہ سرخ ہو گیا، کیونکہ آزر نواب نے اپنا جملہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کیا تھا۔

"بس تھوڑی ہی تو دیر ہوئی ہے"۔ بشارت نواب نے آزر نواب کے چبھتے ہوئے الفاظ کے زیر اثر کہا۔ "پیسے کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا؟"

"وقت پیسے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے بشارت نواب ــــ جب تک آپ کے دستخط نہیں ہوں گے گاڑیاں یارڈ سے باہر نہیں نکلیں گی اور نتیجے کے طور پر دوسرے سب کام رکے رہیں گے"۔ آزر نواب نے اپنا کوٹ اتارتے ہوئے کہا "میں نہیں چاہتا کہ فیکٹری والوں میں چہ می گوئیاں ہوں ــــ میرا کوٹ پہن لیجیے اور قلزم پر آپ فیکٹری چلے جائیں ــــ انھیں میں واپس پہنچا دوں گا"۔ انھوں نے بغیر دیکھے ہی ایمن کی طرف ابرو سے اشارہ کر کے کہا جیسے وہ بھی تمبر فیکٹری سے نکلا ہوا برادے کا تھیلا ہو۔

بشارت نواب کے چہرے کی سرخی کم نہیں ہوئی تھی ــــ انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی پھر

سعی رائیگاں کی طرح شانے جھٹک کر چپ ہو رہے۔

انھوں نے آزر نواب کے ہاتھ سے ان کا کوٹ لے کر پہن لیا۔ جو ان کے جسم پر قدرے تنگ تھا، کیونکہ وہ آزر نواب سے قد میں کچھ کم تھے، لیکن ان کا جسم کچھ بھاری تھا کوٹ پہن کر انھوں نے اپنے گیلے بالوں میں انگلیوں سے شانہ کیا اور چشم زدن میں چھلانگ لگا کر تلم پر بیٹھ گئے۔ لگام تھامتے ہی تلم نے اشارہ پا لیا اور بڑی تیزی سے بڑھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بشارت نواب بلندی پر چڑھتے ہوئے پیڑوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

بشارت نواب کے جاتے ہی ایمن کو تشویش نے آگھیرا، جیسے وہ کوئی جرم کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو ۔۔۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور اگر کیا بھی تھا تو اس کی پرائیویٹ زندگی ان کی قلمرو سے باہر تھی پھر بھی۔ اس کا دھڑکتا دل کہہ رہا تھا۔ کاش آزر نواب اسے غلط نہ سمجھتے۔ لیکن وہ انھیں کیسے سمجھاتی ۔۔ اور سمجھانے کی ضرورت ہی کیا تھی اسے۔؟ کیونکہ انھوں نے اس سے کچھ پوچھا بھی تو نہیں تھا۔ پھر یہ کوفت یہ بے چینی کیوں تھی اسے؟

"آپ اگر یہاں بیٹھنا چاہیں تو شوق سے بیٹھیں"۔ کچھ دیر تک اس کے اٹھنے کا انتظار کر کے آزر نواب نے کہا،، لیکن میرے لیے میری اپنی مصروفیتیں ہیں۔ مجھے واپس جانا ہے"۔

ان کے لہجے کی درشتگی نے جیسے تازیانے کا کام کیا اور ایمن اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے نم بالوں کی چوٹی گوندھی۔ اپنے بدن کی ننگائی کا احساس جو بشارت نواب کے ساتھ ہوتے ہوئے اسے قطعی نہیں ہوا تھا۔ اب آزر نواب کی موجودگی میں پوری طرح جاگ پڑا۔ اس نے دوپٹے سے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اور ایسے میں اس کی نظر آزر نواب سے ٹکرائی۔ ان کے لبوں پر ایک کسیلی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ جو اس سے نظر ملنے پر اور بھی گہری ہو گئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں بس رہنے دو اپنی پاکبازی ۔۔۔ پھر انھوں نے اس کا معائنہ روک کر نظریں افق پر جمع ہوتے بادلوں کی طرف پھیر لیں۔

آزر نواب کے رانٹ کی رسی کھولنے تک وہ جلدی جلدی چڑھ کر بالکل ایک کنارے بیٹھ گئی۔

وہ حتی الامکان اپنا چہرہ پھیرے ہوئے تھی۔ پھر بھی وہ جانتی تھی کہ آزر نواب کی نظریں اس کے پروفیل پر جمی تھیں، جو اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا کر رہی تھیں۔

آپ نے ایک بار کہا تھا، حادثے بار بار نہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں خوش گوار حادثے بار بار نہیں ہوتے مس شہاب"۔ آزر نواب چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔" میں کوئی بشارت نواب نہیں ہوں کہ آپ

کے پیچھے پانی میں کود پڑوں — اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اتنے کنارے پر نہ بیٹھیں۔"

لاکھ ضبط کرنے پر بھی ایمن کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ تو وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر پانی میں کودی تھی تاکہ بشارت نواب اس کے پیچھے چلے آئیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اسے سستے معاشقے کی تلاش تھی؟ — اس کے دل نے درد سے کروٹ لی — وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھی کہ آزر نواب اس کی آنکھ سے ٹپکتا آنسو دیکھیں اور انھیں مزید اپنی فتح کا احساس ہو — اس نے اپنی آنکھوں کے جلتے کٹوروں میں ہی وہ آنسو بجھا دیے۔ اور ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آزر نواب بالکل بے تعلقی سے پلٹ کر رافٹ کو آگے بڑھانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ گویا نہ انھوں نے کچھ کہا نہ ایمن نے کچھ سنا۔ سلک کا مفلر انھوں نے گردن سے کھول دیا تھا، جو ہوا سے جھول رہا تھا۔ انھوں نے اپنی قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائی تھیں اور ان کے مضبوط ہاتھ مشاقی سے رافٹ کو کھے رہے تھے۔ سفید جودھپور پر گھٹنوں تک پہنچتے بوٹ قیمتی اور چمک دار تھے۔ ان کی مردانہ وجاہت ہر حال میں مسلّمہ تھی — لیکن ایمن اس حقیقت سے بھی واقف ہو گئی تھی کہ ان کی گردن کا مغرور تناؤ، شانوں کی سنگلاخی اور چہرے کی خوب روئی صرف مردانہ وقار کا مکمل نمونہ ہی نہیں تھی، بلکہ اس میں سفاک فطرت اور انا کی حد تک خود اعتمادی کا زبردست ٹکراؤ بھی موجود تھا۔ اس وقت ان کی ناگواری کی وجہ شاید یہی تھی کہ بشارت نواب ——— ایک نواب زادے — کہیں ایک عام محنت کش چھوکری کے اسیر نہ ہو جائیں۔ اور بات سے کہ تسنیم پاشا ان کی توجہ کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے بڑی سرکار کے آگے تجویز رکھی تھی کہ آزر نواب اور شاہانہ صاحبزادی کی شادی ہو جائے — انھیں پورا یقین تھا کہ آزر نواب اپنی والدہ کی بات ہرگز نہیں ٹالیں گے۔ بڑی سرکار نے فی الحال آزر نواب سے اس رشتے کا ذکر کر دیا تھا اور ان کے فیصلے کی منتظر تھیں۔ یہ بات بھی ناممکن تھی کہ آزر نواب شاہانہ صاحبزادی کے حسن اور ان کے نایاب صفت مزاج سے واقف نہ ہوں گے یہ سب سوچتے ہوئے ایمن کے دل کو درد کی ایک لہر نے ٹٹولیا — یہ بات بار بار وہ دل کو سمجھاتی کہ شہد کے جس پیالے پر اس کا حق نہیں، اسے دنیا میں کوئی بھی پی لے، اس کی بلا سے — لیکن وہ دل کا درد ہی کیا جو دبانے سے دب جائے۔

پتا نہیں رافٹ ایک کنارے لگ چکا تھا۔ بڑی دیر بعد اپنے خیالات سے چونک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا — وہاں وہ تنہا تھی۔ آزر نواب جا چکے تھے۔ وہ بھی بوجھل قدموں سے کنارے پر آ گئی۔ اور چپ چاپ بنگلے کی طرف چل دی۔

ایمن جب کمرے میں داخل ہوئی تو ریحانہ کینوس پر ایک پینٹنگ کے تکمیلی شوشے لگانے میں مصرو

تھیں۔ ایمن چپ چاپ ان کے پیچھے جا کھڑی ہوتی، لیکن کچھ بولی نہیں، کیونکہ وہ خود ایک مصورہ تھی اور جانتی تھی کہ یہ لمحے کسی مصور کی مکمل محویت کے لمحے ہوتے ہیں اور جس لمحے پر احساس کی ساری قوتیں مرکوز ہوتی ہیں وہ قابلِ تعظیم ہوتا ہے۔

وہ آج کافی دنوں کے بعد ریحانہ کے پاس آئی تھی۔ اس دوران فلو نے اسے آگھیرا تھا۔ جو زندگی کے حادثے کا ضمنی اثر تھا۔ بخار کی کیفیت کو پہلے تو وہ نظر انداز کرتی رہی، لیکن جب وہ بڑی سرکار سے ڈکٹیشن لے رہی تھی تو انھوں نے اسے غور سے دیکھ کر اس کا ماتھا چھوا۔ وہ جل رہا تھا۔ انھوں نے اس کے احتجاج کے باوجود اسی وقت کام رکوا دیا اور اسے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کو کہا۔ پھر بخار نے تیزی پکڑی تو اپنا پورا خراج لے کر ہی اترا۔ بڑی سرکار دن میں دو تین بار اس کے کمرے میں آتی رہیں۔ اسے دھندلا سا خیال تھا کہ آذر نواب خود اپنے ساتھ ڈاکٹر کو لے آئے تھے اور ان کے پیچھے بشارت نواب کا نادم و فکرمند چہرہ بھی اسے یاد تھا۔

اس کی نقاہت ابھی باقی تھی، جس کا ازالہ شمشاد بہت اچھی طرح کر رہی تھی۔ اس کی خاطر مدارتیں شروع ہو گئی تھیں لیکن بنگلے سے باہر وہ آج ہی نکلی تھی۔

ریحانہ کی سرد مہری کم یا ختم ہو چکی تھی گو اب بھی وہ اپنے اور ایمن کے مابین سماجی فاصلوں کے خط فاصل کو برقرار رکھتی تھیں، لیکن اب یہ فاصلہ کافی کم ہو گیا تھا۔ ایمن نے بھی اس خیال سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ ریحانہ دل کی بری نہیں تھیں۔ وہ ریحانہ کی اس کمزوری کا برا نہیں مانتی تھی جس کا ذمہ دار ان کی تربیت کا کھوکھلا پن تھا۔ مالدار باپ کی بیٹی ہونے کے بھرم میں انھیں احساس برتری میں مبتلا رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار ریحانہ اس کامپلیکس سے نکل آئیں تو اپنی بیماری کے باوجود ایک نارمل اور پرسکون زندگی گزار سکتی ہیں۔ ایمن کے سوچنے کے اس پرسکون ڈھنگ نے ریحانہ پر اپنا اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کی بے تکلفی ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی کہ وہ ایمن کو اپنے شوہر سے علاحدگی کے اسباب بتاتیں۔ نہ ایمن وہ سب کچھ جاننے کو بے چین تھی۔ اس میں عام عورتوں کا تجسس تھا ہی نہیں۔ وہ اسے قطعی طور پر ریحانہ کا نجی معاملہ سمجھتی تھی۔ وہ حتی الامکان ان کی مدد کرنا چاہتی تھی، کیونکہ آذر نواب بھی یہی چاہتے تھے۔ ابتدا تو بہرحال اس نے اسی جذبے سے کی تھی۔ لیکن بعد میں جب اس نے ریحانہ میں ایک فنکار کی تلاش بھی شروع کی تو وہ یہ بھول گئی کہ اس نے آذر نواب کی درخواست پر یہ مہم اپنے سر لی تھی۔

ریحانہ کا مصوری کا شوق مختلف اقسام کے کارڈوں سے گزر کر اب بڑی تصویروں کی پینٹنگ تک پہنچ گیا تھا۔ بڑے خوب صورت بنگلے کا ایک کمرہ اسٹوڈیو میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جہاں ریحانہ اپنے

اشوق کی تکمیل کیا کرتی تھیں

"بس!" ایمن سے نہ رہا گیا اور اس نے دھیرے سے بغیر ریحانہ کو چونکاتے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم یہ اسٹروک غلط لگا نے جا رہی ہو۔" ماں اور بچے کی اس پینٹنگ پر نظر جما تے ایمن نے کہا۔ "ایک ماں کے ابر و پر اپنے بچے کے لیے بیاکبھی نہیں آ سکتا اور واقعی برش کے اس ایک غلط اسٹروک نے ویسے خاصی بھلی تصویر کا ستیاناس کر دیا ہوتا۔

مصوری میں ماں اور بچے کی تھیم کو قدیم ترین ہونے کے با وجود گھسا پٹا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی ایک جذبے پر لاتعداد تصویریں اور مجسّے وجود میں آتے ہیں۔ یہ جذبہ بجائے خود اتنا متبرک اور قابل جیں ساتی ہے کہ اس کی بلندیوں کو چھونا معمولی کس بل کے آرٹسٹ کے بس کی بات نہیں لیکن خدا تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور خدا تک پہنچ جانا دو مختلف باتیں ہیں۔ اسے پانے کے لیے خود کو کھونے کی ضرورت ہے حتیٰ کہ من و یزداں کی تفریق مٹ جائے اور ایک خاکی انسان انا الحق، کا دعوا کر سکے۔ لیکن خدا سے برتر کی شان میں گستاخی کرنے والا ہر مجذوب، منصور، نہیں ہو سکتا اور ہر منصور دار پر چڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور دار ہی عشق حقیقی کی انتہا ہے، جہاں انسان اپنی خواہشات، آرزوئیں، زندگی اور سوت ایزد باری کو سونپ بیٹھتا ہے۔ اچھا ہوا کہ مصوری کا امتحان اتنا کڑا نہیں ہے، ورنہ یہ میدان خالی نظر آتا۔ کتنے فن کار، کتنے مصوّر ایسے ہیں جنھوں نے اس دشت کی وسعت میں خود کو گم کر دیا ہو —— جنھوں نے کسی صلے کے لالچ میں اپنے فن کو آگے نہ بڑھایا ہو —— اور جنھوں نے فن کو فن کی عظمت کی خاطر آگے بڑھایا انھوں نے بلا شبہہ حیات جاوداں پالی —— لیکن دنیا میں ایسے کتنے مائکل اینجلو ہیں؟ کتنے وان گاگ ہیں؟ کتنے ریفائیل ہیں؟۔

آرٹ میں بھی حال ماں اور بچے کی تھیم کا ہے۔ جنھوں نے اس جذبے کی ملمایت اور عظمت کو واقعی محسوس کیا، صرف انھیں کا فن بلندیوں کو چھو سکا اور جہاں ایسا نہیں ہوا وہاں بھی فن پارہ فن کا معمولی نمونہ ہونے کے با وجود محض اپنی ممتا کی عظمت کے بل پر خراج عقیدت لیتا رہا۔

آج ریحانہ نے بھی اپنی پینٹنگ میں اسی تھیم کو اپنایا تھا۔ ایمن کو اس پر تعجب ہوا —— اور یہ تعجب اور بھی اس وقت بڑھا جب ریحانہ نے اسی موضوع پہ بنائی ہوئی دو اور تصویریں ایمن کو دکھائیں۔ ایمن کو تعجب اس لیے ہوا کہ جب بھی مصوری پر ان میں بحث ہوتی تھی —— تو ریحانہ ہمیشہ اس موضوع کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ اور ان کی یہ ہجو اتنی شدت اختیار کر لیتی تھی کہ ایمن بات کا دھارا موڑ دیا کرتی تھی —— اور اب ریحانہ نے خود یہ تصویریں بنائی تھیں۔ اور ایمن سے تنقید کی طلب گار تھیں۔

"چلو کیوں نہ ہم باغ کی کھلی ہوا میں بیٹھ کر ان تصویروں پر بحث کریں!" ایمن نے کہا۔ اور ریحانہ کے "ہاں" کرنے پر اس کی وہیل چیئر ڈھکیل کر لے چلی۔

باہر سائے ڈھل چکے تھے، لیکن فضا میں ابھی چمکیلا پن باقی تھا۔ کھمبا اور املتاس کے پیڑوں سے میٹھی دھوپ چھن رہی تھی۔ ایک سورج کی آنکھیں موندتی کرنوں میں تمازت نہیں تھی ــــ بنگلے کی نسبتاً کم اونچائی کی طرف سیڑھیوں کے برابر ڈھلوان راستہ بنادیا گیا تھا تاکہ ریحانہ کی وہیل چیئر بہ آسانی لائی لے جائی جاسکے۔ ایک مقامی عورت ان کی خدمت کو وقف تھی۔ یہ کافی دنوں سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ جو ٹرینڈ نرسیں اس کام کے لیے بلائی گئی تھیں، وہ یا تو اس گمنام سی جگہ سے اکتا کر چلی گئیں یا ریحانہ کی تنک مزاجی نے انھیں نوکری چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا۔

ایمن نے گلاب کے ایک تختے کے پاس رک کر ایک کلی توڑی اور ریحانہ کے بالوں میں لگا دی۔

"تم بھی لگاؤ۔" ریحانہ نے کہا اور ایمن نے اپنے لیے بھی ایک کلی توڑ لی۔

"تمھارا رنگ ابھی پورا واپس نہیں آیا ہے۔" ریحانہ اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولیں: "مجھے ہمیشہ تمھارا رنگ دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔"

"تم خود کچھ کم ہو؟" ایمن ہنس کر بولی۔ ریحانہ کا برتاؤ آج بالکل دوستانہ ہوگیا تھا ــــ وہ آج بغیر بوجھل میک اپ کے کافی قبول صورت نظر آرہی تھیں۔ ان کی پلکیں خود کافی گھنیری تھیں، پھر پتا نہیں کیوں وہ مصنوعی پلکیں لگانا ضروری سمجھتی تھیں۔ آج انھوں نے اپنے کٹے ہوئے بال سمیٹ کر گردن پر فیتے سے باندھ رکھے تھے۔ اور صرف ہلکا سا لپ اسٹک لگا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر نکھار، آنکھوں میں ایک نرمی سی تھی۔

کچھ دیر روش پر گھومنے کے بعد ریحانہ نے کہا "پاپا نے حوض میں آج نئی مچھلیاں چھڑوائی ہیں، چلو دیکھیں۔"

ایمن نے آگے بڑھ کر بیچ کے پیچھے چیئر موڑلی، جدھر ایک کشادہ حوض تھا۔ حوض کے شفاف پانی میں خوش رنگ سرخ اور سنہری مچھلیاں بجلی کی طرف تڑپ رہی تھیں۔

رنگوں کے بغیر یہ دنیا اندھیر ہو جاتی۔ بلبل فقط آواز، طاؤس فقط رنگ نہیں ہے۔ یہ دو حقیقتیں ہیں۔ رنگ اور آواز کے بغیر انسان کی زندگی کتنی نامکمل ہے!"

"ہاں اب بتاؤ!" ــــ ریحانہ بے چین ہو کر بولی۔

"کیا؟" ایمن بھول ہی گئی تھی۔

"میری تصویروں کے بارے میں" ریحانہ نے یاد دلایا۔
"میرے خیال میں خاصی بھلی تصویریں ہیں" ۔ ایمن نے تکلفاً کہا۔
"ایسے کام نہیں چلے گا، صاف صاف بتاؤ" ریحانہ نے اس کی میانہ روی کو رد کر کے کہا۔
ایمن کچھ جھجکی، لیکن جب ریحانہ کو سچ سننے میں عار نہیں تھی تو اس نے بھی اپنا فرض پورا کرنا ضروری سمجھا۔
"تصویریں واقعی اچھی ہیں، لیکن ان میں ممتائی وارفتگی کی کمی ہے" ۔ اس نے کہہ ہی ڈالا
"تم نے ایک جملے میں میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا" ۔ ریحانہ مایوسی سے ہنس کر بولیں۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تصویریں بری ہیں" ۔ ایمن نے سمجھایا "لیکن ریحانہ کسی جذبے کا صحیح احساس ہی کسی تخلیق کو موثر بنا سکتا ہے" ۔
ریحانہ کچھ کھوسی گئیں " ایمن تم سمجھتی ہو۔ مجھ میں احساس کی کمی ہے ؟" اس نے کچھ دیر بعد کہا " شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو" ۔
"قطعی نہیں،" ایمن نے جلدی سے کہا " ایسی آنکھیں کسی بے حس کی نہیں ہوتیں ۔۔۔ بلکہ میں کہوں گی کہ تم ہر بات کو غیر معمولی شدت سے محسوس کرتی ہو، اور یہی تمھارے ذہنی انتشار کا سبب ہے، تمھاری تصویروں میں جھلکتا ہے" ۔
"ایمن کیا تم کبھی ذہنی انتشار کا شکار نہیں ہوتیں" ؟ انھوں نے ایمن کے دلکش پروفیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔
ایمن وہیں حوض پر بیٹھ گئی تھی ۔ اس نے اپنی لمبی لہراتی چوٹی کو آگے چھوڑ رکھا تھا کہ حوض کے پانی میں ڈوب کر گیلی نہ ہو ۔۔۔ ہلکے پھلکے پیازی شلوار قمیص اور دوپٹے میں سورج کی شہابی کرنیں بجلیوں ہی کی طرح تڑپ رہی تھیں ۔ اس نے اپنے مخروطی انگلیوں والے متناسب ہاتھ گھٹنوں پر دھر رکھے تھے ۔ سفید نازک سی سینڈلوں میں رنگے ہوئے ناخنوں کی وجہ سے اس کے پیروں کی رنگت بھی گوری نظر آ رہی تھی ۔ وہ ریحانہ کے اس ذاتی سوال کے لیے تیار نہیں تھی ۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کیا جواب دے ۔
"تمھاری خاموشی کا مطلب ہے کہ تم بھی کبھی ذہنی انتشار سے دوچار ہوتی ہو ؟" ریحانہ نے کہا ۔

"کون نہیں ہوتا؟" ایمن بولی "لیکن میرے اور تمہارے ذہنی انتشار میں فرق ہے کیونکہ تمہارے اور میرے حالات بالکل مختلف ہیں۔ تم نے کبھی کچھ کھویا نہیں، میں نے کبھی کچھ پایا نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں نے کبھی کچھ کھویا نہیں" — شاید ماحول کی وجہ سے ریحانہ کچھ جذباتی ہو رہی تھیں۔

ایمن کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے ریحانہ کے لہجے کے درد کو محسوس کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ جب ایک ہلکا سا لمس دل کے دروازے کھول دیتا ہے تو الفاظ کی تاک جھانک کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی ایمن ریحانہ کے راز کو کریدنا نہیں چاہتی تھی، ان کا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

"آج میں تم کو وہ بات بتاؤں گی جو میں نے کسی سے نہیں کہی — اب میرا ضبط ٹوٹ رہا ہے ایمن۔"

ایمن نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے اور ریحانہ کے پس منظر میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ایک عورت ہی عورت کا دکھ بانٹ سکتی ہے۔ اس کے کلیجے کی کسک کو سمجھ سکتی ہے۔ مرد سے تو اپنے دکھ کی دوا خریدنی پڑتی ہے۔

"میں بھی ماں بننا چاہتی ہوں ایمن" — ریحانہ نے بے اختیار اپنا سر ایمن کے شانے پر ٹکا دیا۔

ایمن سن سی ہو کر رہ گئی — وہ کچھ دیر اسی طرح ریحانہ کو لیے چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر اس نے دھیرے سے کہا — "تم نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑ دیا ریحانہ۔ اچھا نہیں کیا۔"

"تب میں ماں بننا نہیں چاہتی تھی" — ریحانہ نے اپنا سر ایمن کے کندھے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

ایمن خاموش رہی تاکہ ریحانہ خود آگے بڑھے اور اپنے بیان کے تضاد کو واضح کرے۔

"ڈانس فلور پر میری ٹکر کی بہت کم لڑکیاں تھیں — اقبال سے میری ملاقات کلب میں ہی ہوئی تھی — پھر ہماری شادی ہو گئی — وہ مجھ سے محبت کرتے تھے — شاید اب بھی کرتے ہوں" — ریحانہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے گویا خود کو یقین دلایا۔ "میں جب بھی آذر نواب کو دیکھتی ہوں، ان میں مجھے اقبال ہی کی جھلک نظر آتی ہے۔"

"پھر تو وہ بہت ہینڈسم ہوں گے" — ایمن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اور وہ تمہید

بھی کرتے تھے۔ پھر تم نے علاحدگی کیوں اختیار کر لی؟"

"ہاں، وہ بہت ہینڈسم ہیں۔ لیکن بہت ضدی بھی۔ انھیں چونکہ بچوں سے بہت پیار ہے — وہ چاہتے تھے ہمارے بہت، سے بچے ہوں — اور میں اس کے لیے تیار نہیں تھی"۔

"تم نہیں چاہتی تھیں کہ تمھارے اپنے بچے ہوں؟" ایمن نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"۔

"مجھے ڈر تھا کہ میرے جسم کی خوبصورتی ختم ہو جائے گی۔ اور اسی بات پر میری اور اقبال ان بن ہونے لگی — ایک دن میں نے بہت الٹی سیدھی باتیں سنائیں اور پاپا کے پاس آ گئی"۔

"اور اقبال صاحب نے تم سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی؟"۔

"ان کے خطوط آتے رہے۔ وہ مجھے واپس بلاتے رہے، لیکن شرط وہی تھی" — ریحانہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"تم چلی جاتیں ریحانہ — دنیا میں کون سی ایسی عورت ہوگی جو ماں بننا پسند نہ کرتی ہو — یہ تمھاری کھوکھلی ضد تھی"۔ ایمن نے کہا۔

"کیسے جاتی ایمن؟ خدا کو شاید میری بات بری لگی — مجھے Poliomylitis (پولیو) ہو گیا — میں ماں بننے کے قابل ہی نہ رہی — ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے" اور میں اپنی حالت زار لیے ان کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی"۔

"اقبال صاحب جانتے ہیں؟" ایمن نے پوچھا۔

"نہیں میں نے انھیں نہیں لکھا — پاپا کو بھی منع کر دیا تھا — ان کا ایک آخری خط آیا تھا جس میں انھوں نے نیور ہو کر لکھا تھا کہ اگر میں ان سے طلاق لینا چاہوں تو وہ دے دیں گے۔

"تم نے اقبال صاحب کی خواہش پوری کر دی ہوتی"۔ ایمن نے ریحانہ کا درد دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسلسل محرومی کا احساس مجھے مارے ڈال رہا ہے ایمن" — ریحانہ نے لبریز آنکھوں سے کہا میں نے سوچا تھا کہ پاپا کی دولت سے میں سب کچھ خرید سکتی ہوں — اقبال کو بھی اپنے آگے جھکا سکتی ہوں۔ لیکن یہی خوشی خریدی نہیں جاتی یہ تو ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں کا انعام ہے جو ہم دوسروں کے لیے دیتے ہیں کاش میں نے اقبال کے لیے اپنی ضد کی قربانی دے دی ہوتی"۔

"اقبال صاحب واقعی تم سے پیار کرتے ہوں گے تو انھوں نے تمھیں بھلایا نہیں ہوگا ریحانہ — وہ اب بھی تمھارے پاس آسکتے ہیں"۔

"وہ نہیں آئیں گے ایمن ـــ دو وجہیں ہیں ان کے نہ آنے کی ۔ ایک تو یہ کہ میں حشر تک انھیں نہیں معلوم ہونے دوں گی کہ اب میرے پیر معذور ہو گئے ہیں ۔ دوسرے ـــ اب وہ کیوں آئیں گے ـــ تم سے کسی نے ضرور پیار کیا ہو گا جس کا بدلہ تم . . ."

"میری بات چھوڑو مجھ سے کسی نے پیار نہیں کیا ۔" ایمن اپنی ذات کو اس مسئلے میں الجھانا نہیں چاہتی تھی ۔

ریحانہ کی آنکھوں میں اداس سی شرارت جاگی "تم مجھ سے کہنا چاہتی ہو کہ آج تک تم سے کسی نے نہیں کہا کہ تمھارے بال کالی گھٹاؤں جیسے ہیں ـــ تمھارا رنگ شہابی اور تمھاری آنکھیں سنہری ہیں، اور تم ایک حقیقت سے زیادہ خواب ہو ـــ وغیرہ ؟"

ایمن چونک پڑی ۔ ریحانہ یہ آج کیا کہنے لگی تھی ۔ اسے کیسے پتا چلا! اس کی نظروں میں ایک مضبوط اور استوار شخصیت ابھری ۔ چمک دار اور گہری آنکھیں جو اس کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھیں ۔ غضب کی خود اعتمادی اور استفسار تھا ان آنکھوں میں ـــ سگریٹ کے دھوئیں کے ہلکے مرغولوں کے پیچھے ان خمیدہ ہونٹوں نے کہا تھا: خواب! ـــ وہ اس یاد کو محض ایک خواب بنا دینا چاہتی تھی، لیکن کوئی ہر بار اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتا تھا ۔ کیا چاہتے تھے آخر آزر نواب ؟ ان کی اور اس کی دنیا میں ناقابلِ عبور فاصلہ تھا ـــ اس کے دیے کی مدھم روشنی آزر نواب کے جگمگ کرتے جھاڑ فانوسوں کے آگے جگنو بن جاتی تھی ۔ دنیا کا اصول کون توڑ سکتا ہے ؟ چھوٹے چراغ بڑے چراغوں سے ٹکراتے بھی ہیں تو چھوٹے ہی رہتے ہیں ۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس ٹکراؤ کو سہار بھی نہیں سکتے ۔ بڑے چراغوں کی گرمی انھیں جھلسا کر خاکستر کر دیتی ہے ۔ ایمن کو خاکستر نہیں ہونا تھا ـــ اسے تو خود کو اس حادثے سے بچانا تھا ۔

"نہیں مجھ سے کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا ۔" ـــ اس نے فیصلہ کر لیا ۔

"اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو ضرور تمھارے دل نے کبھی چاہا ہو گا کہ کوئی تمھاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ سب کچھ کہہ جاتے جو ایک لڑکی کسی مرد سے سننے کی خواہش مند ہوتی ہے ۔"

ایمن ہنس پڑی، "آج تم بڑے افسانوی موڈ میں ہو!"

"اور تم جان بوجھ کر میرے سوالوں سے دامن بچا رہی ہو ۔" ریحانہ بولیں ۔

"میں دامن کہاں بچا رہی ہوں ؟" ایمن سنجیدہ ہوتے ہوتے بولی ۔ "دراصل یہ سب باتیں حالات اور افراد پر منحصر ہوتی ہیں ۔"

"میں کبھی نہیں" ــــ ریحانہ نے کہا۔
"میرا مطلب ہے، میرے حالات نے کبھی میرے جذبات کو بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دی"
"اس کا مطلب ہے، ضرور کسی نے تم سے کہا ہے کہ تم حسین ہو" ـ ریحانہ نے کریدا۔
"میں نے کہا نا، میرے حالات نے مجھے کبھی ان باتوں کی طرف سوچنے کا موقع نہیں دیا" ــــ ایمن کچھ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔
"یا ابھی تک یہ تعریف کسی ایسے شخص کی طرف سے نہیں آئی جو تمھارے معیار پر پورا اترتا ہو؟"

یہ آج ریحانہ کو کیا ہو گیا تھا؟ ایمن کو ڈر لگا کہ کہیں اس کے دل کا راز زبان پر نہ آجائے۔ وہ اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا "بس یہی سمجھ لو"۔
ریحانہ کچھ آگے کہنے ہی والی تھی کہ بیرے نے آکر کہا "صاحب چائے لگ گئی ہے۔" ایمن نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب وہ ریحانہ کی چہکتی ہوئی جانے کے لیے تیار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اسے کہیں جانا ہی نہیں تھا۔ چائے کے اور ان کے درمیان بس ایک گنجان سی اونچی اونچی سینڈ کی بیچ تھی۔ ریحانہ کے بتاتے ہوئے کنج سے وہ وسیع لان پر آئی تو دیکھا کہ بید کی آرامدہ کرسیوں پر پہلے ہی سے آزر نواب ان کے منتظر تھے۔ وہ کچھ بوکھلا گئی ــ ریحانہ اور اس کی بات چیت بہت آسانی سے سنائی دی گئی ہوگی ــ وہ ہمیشہ ہی خود کو معرض بحث بنانے سے کتراتی تھی اور ابھی ابھی ریحانہ اس کی شخصیت کے ایک نہایت ہی نازک پہلو کو کرید رہی تھی۔ جس کا ایک ایک لفظ یہاں تک پہنچا ہوگا ــــ لیکن آزر نواب تو ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی پر نظر جمائے بیٹھے تھے ــــ ان کے ابرو کا بل بتاتا تھا کہ وہ کسی گہرے مسئلے پر سوچ رہے تھے۔
وہ ان لڑکیوں کو آتے دیکھ کر سگریٹ بجھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایمن کے ہاتھوں سے ریحانہ کی وہیل چیر لے لی۔ ایمن نے چائے بنانے کا کام سنبھالا۔
"ریحانہ! آج تمھارے چہرے کی سرخی اور سورج کی شہابی سرخی میں کوئی فرق نہیں ہے" آزر نواب نے ہمیشہ کی طرح آج بھی ریحانہ کی تعریف میں فیاضی سے کام لیا ــ ریحانہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اور انھوں نے کن انکھیوں سے ایمن کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہوں: کیا اس شخص کی تعریف بھی تمھارے خون میں گرمی نہیں پیدا کرے گی؟ لیکن ایمن کی نظریں اسی طرح بے تعلق سی چائے دانی پر جمی رہیں جس سے خوش بو دار سیّال وہ نازک بدن چینی پیالوں میں انڈیل رہی تھی۔
ریاض صاحب بھی تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچ کر ان میں شامل ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد جب آزر نواب اور امین جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے تو ریاض صاحب انھیں چھوڑنے کو جیپ تک آئے۔

"تو ہماری آج کی میٹنگ قطعی نہیں تھی نا۔؟" ریاض صاحب بولے۔

"جی نہیں" — آزر نواب نے مختصر جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری رائے پر غور کر رہے ہیں"۔ ریاض صاحب بولے "آزر نواب اتنا سوچیے کہ میرا سب پیسا فیکٹری میں لگا ہوا ہے" وہ کچھ بے بسی سے بولے۔

"آپ بے فکر رہیے" — آزر نواب نے لب بھینچ کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے ناگواری جھلک رہی تھی "آپ کے پیسے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی" — اور انھوں نے جیپ میں بیٹھ کر ہاتھ اٹھا دیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔

آزر نواب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے ابرو کی گرہ بدستور تھی۔ جب وہ ڈھلان سے اتر کر سیدھے راستے پر پہنچے تو انھوں نے کہا: "ہم جلد ہی حیدر آباد لوٹ رہے ہیں"

امین چونک پڑی — یہ خبر اس کے لیے بڑی غیر متوقع تھی۔

"میں نے شاید ٹھیک نہیں سنا" اس نے کہا۔

"آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے — ہم پرسوں حیدر آباد جا رہے ہیں"

"لیکن، لیکن کیوں؟"

آزر نواب نے پلٹ کر اسے لمحہ بھر کے لیے دیکھا "اس میں حیرت زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یا ڈانڈیلی سے آپ کو اتنا اُنس ہو گیا ہے کہ آپ یہاں سے نہیں جانا چاہتیں؟!..." انھوں نے کچھ رک کر جملہ پورا کیا "یا ڈانڈیلی چھوڑنے کا خیال کسی اور وجہ سے تکلیف دہ ہے"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" — امین نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ اسے واقعی ڈانڈیلی سے اُنس ہو گیا تھا۔

"خاصی رومانٹک جگہ ہے یہ" — آزر نواب سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے، لیکن ان کے ابرو کی خشمگینی کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔

امین اپنے ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ اور وہ سمجھ گئی کہ ان کا اشارہ اس کی اور بشارت نواب کی طرف تھا۔

"میری دنیا میں رومانس کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ اس نے غصّہ پیتے ہوئے لاتعلقی سے کہا۔

"واقعی" آزر نواب نے بظاہر بڑی سادگی سے کہا "ماحول سازگار ہو اور بشارت نواب آپ سے کہیں کہ آپ کے بال کالی گھٹاؤں کی طرح ہیں، آپ کا رنگ شہابی اور آپ کی آنکھیں سنہری ہیں۔ تب بھی نہیں"۔ ان کے الفاظ میں میٹھا زہر تھا۔

"بشارت نواب نے ہرگز مجھ سے یہ سب نہیں کہا" امین برہمی سے بولی۔

"کیا تمھیں اسی بات کا انتظار ہے؟" آزر نواب کی آواز خنجر کی دھار تھی "تم آخر چاہتی کیا ہو امین؟" انھوں نے جیپ کا انجن بند کر کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے سخت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"امین بڑی بڑی حیران آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ "میں میں سمجھی نہیں"۔۔۔۔ وہ ہکلائی۔

"تم ہرگز اتنی معصوم نہیں ہو جتنی نظر آتی ہو"۔ آزر نواب کی آواز غصّے کے باوجود مدّھم ہو گئی تھی۔ "میں نے ان شفاف جھیلوں جیسی آنکھوں میں کبھی کبھی وہ گہرائی بھی دیکھی ہے جن میں انسان ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ اور بشارت نواب بھی انسان ہیں" وہ کچھ رک کر آگے بڑھے "مجھے تمھارے پچھلے تجربوں سے کوئی سروکار نہیں، لیکن واللہ تم بشارت نواب کو اپنی اداؤں کا نشانہ نہیں بناؤ گی"۔ انھوں نے چیلنج دیا۔

"آپ کو مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ امین نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کر کے کہا۔ "کیا جانتے ہیں آپ میرے پچھلے تجربوں کے بارے میں؟" اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اور بشارت نواب کوئی بچّہ نہیں ہیں۔"

"اور اسی لیے تم انھیں حوصلے دے رہی ہو؟"

"آپ خود بشارت نواب سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میں نے کون سے حوصلے دیے ہیں؟"

"مجھے ان سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تمھاری طرف کھنچے چلے آرہے ہیں"

"یہ جھوٹ ہے"۔۔۔۔ امین نے جھیر کر کہا "ہم دوست ضرور ہیں۔۔۔"

آزر نواب نے استہزائی قہقہہ لگایا۔ "دوست۔ ایک مرد اور عورت میں یا تو دشمنی ہو سکتی ہے یا

پیار — دوستی کبھی نہیں ہوسکتی۔"

"یہ آپ کے بورژوائی معیار ہیں" ایمن جل کر بولی۔

"اور آپ کے پرولتاری معیار کون سے ہیں؟" آزر نواب نے اپنی آواز میں سیکرین کی مٹھاس گھولتے ہوئے پوچھا۔ "اور کتنے دوست ہیں آپ کی اپنی دنیا میں؟"

"میں مانتی ہوں نواب صاحب کہ جس دنیا سے میں آپ کے شیش محل میں آئی ہوں، وہ دنیا ایک اکیلی لڑکی کے لیے خطرات سے بھرپور ہے، لیکن میرے جن نام نہاد تجربوں کا ابھی آپ نے ذکر کیا انھوں نے مجھے سنبھلنا بھی سکھایا ہے۔"

"لیکن بشارت نواب یہ نہیں جانتے۔" آزر نواب بولے۔

"بشارت نواب نے کبھی کوئی حرکت ایسی نہیں کی جس سے مجھے شکایت ہو۔ ان کے مزاج میں کھلنڈرا پن ضرور ہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کی ذمہ دار ان کی پرورش ہے۔ جیسے جیسے وہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان کا یہ کھلنڈرا پن بھی ختم ہو جائے گا۔"

"گو کہ آپ بشارت نواب کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں — لیکن مجھے تقریر نہیں سننی ہے۔"

آزر نواب کے لہجے میں جھلاہٹ عیاں تھی، لیکن ایمن چپ نہیں ہوئی۔ اس نے حلق میں محسوس ہوتے پھندے کو نگل کر کہا، "آپ سمجھتے ہیں آپ کے محلوں کی چار دیواری کے باہر شرافت اتنی ارزاں ہے، اصول اتنے بے مایہ ہیں، انسانیت اتنی بے معنی ہے؟" — اور اس کا گلا رندھ گیا اور اس نے اپنی آنسوؤں سے بوجھل آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ان آنسوؤں کو پی جانا چاہتی تھی — بات بات پر رونا اس کا شیوہ نہیں تھا۔ وہ دل کی بھڑاس تنہائی میں نکالنے کی قائل تھی — آنکھوں کے مقدس پیالوں کا ظرف وہ قائم رکھنا چاہتی تھی — وہ جانتی تھی کہ دنیا میں آنسوؤں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

بڑی دیر تک جیپ میں خاموشی رہی — درختوں کے سائے لمبے ہوتے رہے — پرندوں کے جھنڈ مغرب کی طرف بڑھتے رہے اور فضا میں ہلکی خنکی گھلتی رہی۔

ایمن کا دل بجھ سا گیا تھا۔ آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ آزر نواب اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے وہ اسے ایک موقع پرست لڑکی سمجھتے تھے جو حویلی میں راستہ بنا کر بڑی سرکار کا دل جیتنے کے بعد اس گھات میں تھی کہ بشارت نواب کو جنگل میں پھنسا لے — بظاہر ان کی رائے ان ساری لڑکیوں کے بارے بہت گری ہوئی تھی جنھیں قسمت نے تنہا کشمکش کرنے پر مجبور کر دیا ہو — وہ شاید یہ سمجھنے سے قاصر تھے

کہ ایک آزاد اور غیر محفوظ ماحول میں ایک تن تنہا لڑکی کا زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہے۔ اس سے زیادہ مشکل اس کا ان شعلوں سے دامن بچانا ہے جو ہر طرف سے اس کی جانب لپکتے رہتے ہیں ۔۔ ایمن کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے زندگی کا یہ دشوار گزار سفر کس طرح ہنستے کھیلتے طے کیا تھا۔ ہر وقت چوکنا رہنے کا احساس انسان کو تھکا دیتا ہے ۔۔ اور اب وہ تھکنے لگی تھی۔ ایسے میں حویلی اور بڑی سرکار کا پرسکون دامن نصیب ہونے پر اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کے اعصاب کی گرہیں کھل گئی ہوں۔ صرف آزر نواب ہی کی ہستی ایسی تھی جو مطمئن لہروں پر ڈولتی اس کی ناؤ کو ڈگمگا دیتی تھی ۔۔ اور اپنی کشتی کو بھنور سے بچانے کی کوشش اسے نڈھال کر دیتی تھی ۔۔ اس کا دل بیٹھ جاتا تھا ۔۔ کیا پھر اسے مجبوراً اس دنیا میں واپس ہونا پڑے گا، جہاں کی ہوائیں جھلسانے والی اور جھکڑ ڈگمگا دینے والے تھے؟ شاید وہ اس محفوظ ماحول میں نہیں آتی تو اسی ثابت قدمی اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرتی رہتی۔ جب اسے اس کی زندگی کا کوئی موزوں ساتھی مل جاتا لیکن ابھی تک تو کوئی اس کا مرکزِ خیال بنا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے معیار شاید بہت اونچے تھے۔ اس کے اپنے معیار کیا تھے، وہ نہیں جانتی تھی، صرف محسوس کر سکتی تھی ۔۔ اور اب آزر نواب سے ملنے کے بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کی مبہم سی تلاش کا راستہ کہیں اندھیرے میں گم ہو گیا تھا، کیونکہ نہ وہ اپنی خودداری کھو کر ان کے تکبر کا شکار ہونا چاہتی تھی، نہ کسی اور کو آزر نواب کے مقابل تصور کر سکتی تھی۔ زندگی کا یہ دور اس کے لیے زبردست خود آگہی کا دور تھا۔ اسے اپنی راہ متعین کرنی تھی۔ زندگی کا یہ دوراہا اس کی گردن پر دودھاری تلوار بنتا جا رہا تھا۔

"PAX!" آزر نواب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ جب اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تو وہ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ وہ ان کی مسکراہٹ کے آگے اور کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید وہ خود بھی اس پر اپنی جادوئی اثر سے واقف تھے ۔۔ جب چاہتے اسے خفا کر دیتے اور جب چاہتے منا لیتے۔ ایک بار اس نے اس بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور کچھ تامل کے بعد اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ آزر نواب ہاتھ تھامے کچھ دیر اسے دیکھتے رہے ۔۔ آج ان کی مسکراہٹ میں تکان کے آثار تھے۔

کون سی فکر تھی جو ان کو کھائے جا رہی تھی۔؟

اگلے دن ایمن بہت مصروف تھی۔ جب وہ ڈانڈیلی آئے تھے تو ایسا لگا تھا جیسے بہت ہی مختصر سامان ان کے ساتھ تھا ۔۔ لیکن واپس جاتے ہوئے دو تین ٹرنک اور بھی بڑھ گئے تھے، جو منشی صاحب کو اپنے ساتھ لے جانے تھے۔

بڑی سرکار کی کتاب کی فائل اب کافی ضخیم ہوگئی تھی۔ ایمن نے نرمل ورک کے خوب صورت فولڈر میں اس کے کاغذات کو ترتیب دیتے ہوئے سوچا، زندگی کس طرح ورق ورق بڑھتی جاتی ہے۔ جب وہ ڈانڈیلی آئے تھے تو یہ قیمتی فولڈر پتلا سا تھا۔ اور اب اس فولڈر کے درمیان بڑی سرکار کی شخصیت جھلکتی تھی۔ دنیا کا ہر انسان ایک فولڈر ہوتا ہے کبھی قیمتی، کبھی معمولی۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ فولڈر خوش نما ہو، لیکن اندر کے مواد پر کسی کی قدرت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ مواد درستا ہے۔ لیکن لوگ تو صرف فولڈر دیکھتے ہیں، کتاب پڑھنے کی فرصت کس کو ہوتی ہے؟ جس نے پڑھ لی پڑھ لی۔

ایمن کو ابھی آزر نواب کے آفس میں جاکر کاغذات سنبھالنے تھے۔ رفتہ رفتہ ساری خط و کتابت اس کے ذمّہ آگئی تھی۔ منشی صاحب اپنی انگریزی اور عمر کی وجہ سے مجبور تھے۔ شمشاد کو بڑی سرکار کے کپڑے تہ کرتے چھوڑ کر وہ آفس چلی آئی۔ اس نے سارے کاغذات اتنی خوش اسلوبی سے رکھ چھوڑے تھے کہ اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک ایک پہلو جو زندگی کے مختلف ادوار میں ترشا گیا تھا مجموعی طور پر اب کام آرہا تھا۔ اس نے بہت کچھ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے سیکھا تھا۔

وہ اسٹیل کی الماری بند کررہی تھی کہ پیچھے کھٹکا ہوا ــــ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بشارت نواب کھڑے تھے۔ شاید وہ ٹینس کھیل کر لوٹے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ریکٹ تھا اور نیلے بلیزر میں ان کا سرخ و سفید چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ڈانڈیلی کی مصروف زندگی نے ان کے گٹھے ہوئے بدن کو اور بھی چست کردیا تھا۔ ایسا لگتا تھا یہاں کے شب و روز کو اب انھوں نے قسمت سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ لیکن طوعاً و کرہاً قبول کی ہوئی ذمہ داریوں نے ان میں بڑی اچھی تبدیلی پیدا کی تھی۔ ان کے چہرے پر بے فکر کھلنڈرے پن کی جگہ ایک طرح کی سنجیدگی نے لے لی تھی اور ان کے فطری مزاج میں ایک نفاست آگئی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ زندگی کے تیئس سال تنہا گزارنے کے بعد اب جب بھی وہ بشارت نواب کو دیکھتی تو اس کے دل میں آرزو جاگتی کہ کاش اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا جو بشارت نواب ہی کی طرح ہوتا۔ خوش رو اور خوش مزاج، جو اسے چھیڑ چھیڑ کر رلا دیتا اور جو وہ سچ مچ رو پڑتی تو اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر منا بھی لیتا۔ تب شاید اس کی کشتی اتنی بے بادبان بھی نہ ہوتی۔ شاید اسی وجہ سے ان کے ہلکے پھلکے فلرٹیشن اور شوخی کو وہ ہنس کر ٹال جاتی ــــ وہ جانتی تھی کہ ان میں گہرائی کہیں نہیں تھی۔

بشارت نواب ٹیبل پر ٹک گئے، سفید فلالین میں ملبوس، ایک پاؤں زمین پر ٹکائے، دوسرا پاؤں ہوا میں جھلاتے ہوئے وہ ایمن کے واپس آنے کا انتظار کرتے رہے۔

انھیں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح امین کے چہرے پر چمکیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں گرم جوشی امنڈ آئی۔

"آج کئی دن بعد شکل دکھائی ہے آپ نے" اس نے شکایت کی۔

"تم نے بھی تو دیکھنے کی کوشش نہیں کی" بشارت نواب نے بھی شکایت کا جواب شکایت سے دیا۔

امین کو چپ ہونا پڑا۔ اس دوران اسے بشارت نواب کا خیال آیا تو تھا لیکن ہر بار کسی مصروفیت نے اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔

"سنا ہے دربار منتقل ہو رہا ہے" بشارت نواب آج اچھے خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"ہاں" امین کو ان کے 'دربار' کہنے پر ہنسی آ گئی۔ "ہم سب جا رہے ہیں"

"اور تم خوش ہو؟" بشارت نواب پوری طرح ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"نہیں" امین نے سچائی سے کہا۔ ڈانڈیلی چھوڑتے ہوئے واقعی اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اس کا بس چلتا تو وہیں رہ پڑتی۔

"کہیں اس کی وجہ خاکسار تو نہیں؟" بشارت نواب اصلیت پر اتر آئے۔

"یہ خوش فہمی کس لیے ہے جناب کو؟" امین نے آنکھیں نچا کر پوچھا۔

"کبھی کبھی سیدھے راستے سے پھسل جانے کو دل چاہتا ہے"

"سنبھلیے صاحبزادے۔ راستہ پتھریلا ہے" امین ہنس کر بولی۔

"سنبھل تو رہا ہوں امین" وہ کچھ کھوتے ہوئے انداز میں بولے "کم از کم، کوشش تو کر ہی رہا ہوں ___ اور پتا چل رہا ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے ___ تم بھی تو یہی چاہتی تھیں نا؟"

"آپ کو کام کرنا اچھا نہیں لگتا؟" امین نے پوچھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ کام کرنا اچھا نہیں لگتا ___ کام میں نے کبھی کیا نہیں تھا مگر اب کر رہا ہوں۔ اس کے ذمہ دار تمھارے علاوہ آزر نواب بھی ہیں۔ ان کا کوڑا پیٹھ پر نہ ہوتا تو شاید زندگی کے اس پہلو کا مجھے کبھی احساس ہی نہ ہوتا"

"زندگی کا کون سا پہلو ___؟" میں کبھی نہیں" بشارت نواب کو اتنا سنجیدہ امین نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

" یہی کہ زندگی ہمیشہ کسی کے سایبان کے نیچے نہیں گزاری جا سکتی شاید اب تک میں نے اپنے مستقبل کو اس ٹینس ریکیٹ سے آگے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔" وہ ریکیٹ کو دوربین کی طرح تولتے ہوئے بولے "ریکیٹ کے اس سرے پر دنیا بہت رنگین نظر آتی تھی۔"

" زندگی میں آرام آسائش کون پسند نہیں کرتا؟" — امین نے جیسے ان کو دلاسا دینے کو کہا "اگر آپ نے پسند کیا تو کون سا گناہ کیا؟" اسے آزر نواب پر غصہ آنے لگا۔ بشارت نواب کے اس سنتے موڈ کے وہی ذمہ دار تھے۔ انھوں نے ہی بشارت نواب کی آزاد اور بے فکر زندگی کو پابند سلاسل کر دیا تھا — اسے تو وہی ہنستے کھیلتے بشارت نواب پسند تھے۔

" نہیں یہ بات نہیں ہے امین — وہی سب چیزیں مجھے آج بھی پسند ہیں لیکن اب میں انھیں اپنے زور بازو سے حاصل کرنا چاہتا ہوں — خیرات میں نہیں۔" — وہ کچھ بے چین ہو کر بولے۔ "مجھے حیرت ہے میں کیسے اتنے دن آزر نواب سے یوں چپتا رہا جیسے چٹان سے کائی۔"

" آزر نواب بظاہر کتنے ہی درشت ہوں، لیکن وہ آپ کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے ہیں۔" حق گوئی اور آزر نواب کی مدافعت کرنا امین کو ضروری معلوم ہوا۔

بشارت نواب کچھ دیر تک اسے چپ چاپ دیکھتے رہے پھر بولے "آزر نواب کو تم کہاں تک جانتی ہو؟"

امین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا — اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا کیونکہ کبھی تو اسے لگتا کہ وہ آزر نواب کی رگ رگ سے واقف ہے اور کبھی وہ اسے بالکل معمّا لگتے۔

" جتنا ایک نوکر مالک کو جانتا ہے۔" اس نے دامن بچا کر جواب دیا۔

" لیکن اس حویلی میں تمھاری پوزیشن کسی نوکر کی تو نہیں ہے؟"

" اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ حقیقت تو بدل نہیں سکتی، اور میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں خود کو فراموش نہ کردوں۔"

" جہاں تک میرا سوال ہے تمھیں اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اب میری بھی حیثیت ایک محنت کش فیکٹری منیجر کی ہے۔" بشارت نواب نے ٹیبل سے اتر کر امین کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

امین حیرت زدہ ہو گئی — بشارت نواب کے ہاتھوں کی وہ مخملی نرمی کہاں گم ہو گئی تھی — اب وہ ہاتھ واقعی سخت، کھردرے اور محنت کش ہاتھ ہو گئے تھے۔ اور ان کی گرفت بھی اب غیر یقینی

پھسلتی ہوئی نہیں تھی۔

"وہ آپ کے ہاتھوں کی نرمی کہاں گئی؟" اس نے سادگی سے ہنس کر کہا۔

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ اچھی چیزوں تک پہنچنے کے لیے محنت کش سخت ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بتاؤ ایمن کیا میرے ہاتھ اس حد تک محنت کش ہو گئے ہیں جیسے تم چاہتی تھیں؟"

ایمن کی ہتھیلیوں میں پسینا آ گیا۔ اس نے سراسیمگی کو چھپاتے ہوئے ہنس کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا منیجر صاحب، میرے ہاتھ تو چھوڑیے ـــ مجھے دیر ہو رہی ہے ـــ ابھی اور کام پڑا ہے۔"

"سب کچھ ہی تو سمیٹ لیا ہے۔ اب اور کیا بچا ہے۔" بشارت نواب نے بہت مدھم سروں میں کہا اور اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

ایمن کو ان کے اس نئے انداز نے بے چین کر دیا ـــ وہ چاہتی تھی کہ بشارت نواب ہمیشہ اسی طرح چنچل اور شریر بنے رہیں اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بے دھڑک ہنستی رہے کھلکھلاتی رہے۔

بشارت نواب نے ٹیبل پر سے ایک پیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جو وہ ساتھ لاتے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" ایمن نے پیکٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرا وداعی تحفہ، تمھارے لیے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" ایمن نے غیر متوقع تحفہ پا کر خوشی سے کہا "لیکن آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے اب نہ میں کبھی ڈانڈیلی آؤں گی، نہ آپ کبھی حیدرآباد آئیں گے ـــ اب میں آپ کو کیا تحفہ دوں؟"

"تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمھیں کوئی بدلہ چکانا ہے۔ میں ایسے تحفے نہیں لیا کرتا۔" وہ برا مان کر پلٹے۔ ایمن کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن بشارت نواب کو منانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس نے ان کے راستے میں ایک فائل حائل کر دی۔

"معاف کر دیجیے منیجر صاحب، غلطی ہو گئی" اس نے ہنس کر کہا "لیکن میں سچ مچ آپ کو کوئی تحفہ دینا چاہتی ہوں۔" بشارت نواب چند لمحے اس کے روشن چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اس کے گال تھپتھپا کر بولے "پھر کبھی سہی۔" انھوں نے ٹیبل پر سے اپنا ریکٹ اٹھایا اور چلے گئے۔

ایمن پیکٹ ہاتھ میں لیے چپ چاپ کھڑی رہی ـــ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ بشارت نواب کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی، انداز کا ٹھہراؤ اور سوچنے کا بالغانہ انداز جہاں ایمن کو ان کی خاطر خوش

کر رہے تھے، وہیں وہ اپنے آپ کے لیے فکرمند ہو رہی تھی۔

" خدایا مجھے مزید الجھاوے میں نہ ڈال "۔ اس نے دل میں دعا کی اور بشارت نواب کے دیے ہوئے پیکٹ کو کھولا۔

کارڈ بورڈ کے چوکور ڈبے میں پیک وہ لکڑی کا ایک بندر تھا۔ جو آنکھیں چمکا چمکا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ گویا امین سے کہہ رہی تھی ارے جاؤ، ہم سب جانتے ہیں بندر بہت ہی نفیس دستکاری کا نمونہ تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہلتے تھے۔ چمک دار آنکھیں تھیں، بے لوث مسکراہٹ تھی۔

امین نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنس پڑی۔ یہ کیا واہیات باتیں سوچنے لگی تھی وہ بشارت نواب کے بارے میں! بشارت نواب کی طرف سے اندیشے بے بنیاد تھے ۔۔۔ وہ ہمیشہ وہی رہیں گے۔ پُر خلوص ہنس مکھ، دوست۔

یہ بندر کھلونا جانوروں کے ان مختلف نمونوں میں سے ایک تھا جو اب بشارت نواب ٹمبر فیکٹری میں بنانے لگے تھے۔ یہ بشارت نواب ہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ صندل کی لکڑی کے خوب صورت ڈبے اور وینیر کے استعمال سے وہ بہت خوب صورت فولڈر بھی بنانے لگے تھے۔ ان کا شوق دیکھتے ہوئے آذر نواب نے بمبئی میں ان کے لیے ایک شوروم کھولنے کی رائے دی۔ ایک روز کتابوں کا ایک بڑا پارسل کھولنے پر امین نے دیکھا کہ اس میں فرنیچر بنانے کے طریقوں کے بارے میں بہت ہی خوب صورت پمفلٹ تھے ان پمفلٹوں میں نئی پرانی، دونوں طرز کے ڈزائن اور انھیں بنانے کی مکمل ہدایات تھیں۔ انھیں دیکھ کر پتا چلا کہ بے جان، گنگ فرنیچر بھی اپنی داستان، اپنی تاریخ رکھتا ہے۔ وہ ہنری ہیجم کا ٹیبل ہو کہ چپ اینڈیل کرسی۔ فرنیچر کے ارتقا کی مختلف کڑیاں تھیں۔ ان پمفلٹوں نے ہی امین کو جانکاری دی کہ حویلی کا بہت سا فرنیچر محض فرنیچر نہیں تھا بلکہ بیش قیمت صناعی کے نمونے تھے۔ بشارت نواب ہی کی فرمائش پر یہ پمفلٹ آئے تھے۔ ان کی دلچسپی اور شوق کو دیکھتے ہوئے آذر نواب انھیں ہر ممکن بڑھاوا دینے کو تیار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بشارت نواب ایک خوددار سلجھے ہوئے فرد کی طرح سوسائٹی میں اپنی جگہ بنائیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے امین بھی ان کی اس بے لوث کوشش کو قدر کی نظر سے دیکھتی تھی۔ آذر نواب چاہتے تو تسنیم پاشا اور ان کی اولاد کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا یہ ان کی شخصیت کا ایک مثبت نکتہ تھا۔ امین خوش تھی کہ بشارت نواب بتدریج اپنے ہوائی گھوڑوں کو حقیقت کی اونچی نیچی رہگزر پر لا رہے ہیں ۔۔۔ وہ

بشارت نواب کو ایک زندہ سماج کے کامیاب فرد کی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ پدرم سلطان بود، ـــ کا زمانہ گزر چکا تھا۔ جہد بقا بڑھ رہی تھی جس میں زور بازو اور ترقی پسند ذہن کی ضرورت تھی۔ بشارت نواب نکمّے انسان نہیں تھے ان کی خوابیدہ خوبیوں کو اجاگر ہونے کی ضرورت تھی۔ اور آذر نواب پوری طرح ان کی رہنمائی اور مدد کر رہے تھے۔ اس کے باوجود بشارت نواب کبھی ان سے بے تکلف نہیں ہو پاتے تھے۔ انھیں آذر نواب کی چھا جانے والی شخصیت کا اعتراف تو تھا۔ لیکن یہ اعتراف خوش کن نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو آذر نواب سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے لیکن جوں ہی ان کا سامنا ہوتا سب کچھ بھول جاتے اور آذر نواب سے سمجھوتہ کرتے ہی بن پڑتی، کیونکہ جو کچھ آذر نواب کہتے وہی پریکٹیکل معلوم ہوتا ـــ شاید آذر نواب کا لاتعلق بلکہ کسی حد تک درشت برتاؤ ہی بشارت نواب کو ان کے ساتھ کھلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا ـــ لیکن سب کے ساتھ تو وہ اتنے سخت گیر نہیں تھے ـــ ایمن نے ریحانہ کے ساتھ ان کے نرم برتاؤ کے بارے میں سوچا ـــ وہ مجموعۂ اضداد تھے۔ وہ انھیں جتنا سمجھنے کی کوشش کرتی، اور بھی زیادہ اُلجھتی جاتی ـــ اب اس نے یہ کوشش بند کر دی تھی ـــ شاید اسی میں اس کی خیریت تھی۔

جس روز انھیں حیدر آباد واپس ہونا تھا، ایمن نے بڑی سرکار سے اجازت لی کہ وہ ریحانہ کو ملا حافظ کہنے کو جانا چاہتی ہے، جو انھوں نے خوشی سے دے دی۔ ایمن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آذر نواب سے کہتی کہ وہ اسے جیپ سے لے چلیں۔ وہ مصروف بھی بہت تھے۔ صبح کو وہ اور بشارت نواب گھوڑوں پر نکل گئے تھے۔ جانے سے پہلے آذر نواب بانس اور ساگوان کے جنگلوں کا معائنہ کرکے ضروری ہدایات دینا چاہتے تھے۔

بشارت نواب نے جب سے کام میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، جنگلوں میں چوری کی وارداتوں کی خاصی روک تھام ہو گئی تھی، ورنہ چور راتوں رات ساگوان کے بڑے بڑے پیڑ کاٹ کر چمپت ہو جاتے تھے اور ہزاروں روپے کا نقصان ہو جاتا تھا۔ آذر نواب نے بشارت نواب کی کارگزاری دیکھتے ہوئے باقاعدہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ انھیں فیکٹری کا حصہ دار بنا لینا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے بشارت نواب کو تجربے اور ٹریننگ کی ضرورت تھی

خوش قسمتی سے منشی صاحب جیپ میں ٹریلر لگاتے، سامان دھاروار اسٹیشن لے جانے کو تیار تھے۔ ٹرین شام کو جاتی تھی، کافی وقت تھا ایمن نے انھیں منا لیا کہ جیپ سے ٹریلر جدا کرکے ڈرائیور پہلے اسے ریاض صاحب کے بنگلے پہنچا دے اور اس کے واپس آنے پر منشی صاحب جیپ کو سامان

کے ساتھ دھاروا ڑ اسٹیشن لے جائیں۔

"تمھارے کو کیا معلوم بی بی، کیتی بڑی ذمّہ داری ہے میرے اوپر"۔ منشی صاحب اپنی غیر معمولی اہمیت جتاتے ہوئے بولے۔

"جانتی ہوں منشی صاحب، آپ نہ ہوں تو حویلی کا کام چوپٹ ہو جاتے" ان کی اَنا کو ہوا دے کر ایمن بھی خوش ہوتی تھی۔

اس نے ریحانہ کے لیے وداعی تحفہ خود تیار کیا تھا ـــ یہ تحفہ ایک فوٹو البم تھا، جسے بنانے کے لیے وہ ولیسٹ کوسٹ پیپر ملز سے خود ہی پسند کر کے گتے اور کاغذ لائی تھی۔ پہلے ہی صفحے پر اس نے ریحانہ کی چھوٹی سی تصویر پینٹ کر دی تھی۔ اس نے البم کو خوش وضع کاغذ میں لپیٹا اور ایک بہت ہی پیارا کارڈ اس کے ساتھ لگا دیا۔

"بھوت (بہت) دیر نکو کرو بی بی"۔ منشی صاحب نے کہا اور ایمن سر ہلا کر جیپ میں جا بیٹھی۔

ڈرائیور کرناٹک کا رہنے والا تھا۔ اسے نہ تو انگریزی آتی تھی نہ اردو ـــ منشی صاحب نے ہی اسے کنڑی میں سمجھا دیا کہ کہاں جانا ہوگا۔ اور اس نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

راستہ بھر ایمن کا دل مسوستا رہا کہ اسے وہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہوگا۔ کھلی فضا میں گھلی ہوئی ٹمبر کی مہک اب اسے بے چین نہیں کرتی تھی۔ وہ اونچے اونچے سرسراتے بانس اور ساگوان کے پیڑ جواب اپنے سے لگتے تھے۔ راستے میں پڑتا چھوٹا سا نرم جس کی جالی سے تھوتھنیاں لگائے اب بھی مرگ نینی ہرنوں کا جوڑا آگے بڑھتی ہوئی جیپ کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ پھر کبھی انھیں دیکھ پائے گی کہ نہیں۔

جیسے ہی ڈرائیور نے جیپ روکی، وہ اتر کر بھاگی ـــ وہ جلد سے جلد ریحانہ کو اس کا تحفہ پکڑا کر واپس ہو جانا چاہتی تھی ـــ لان پر سے ہوتی ہوئی وہ پورٹیکو سے گزر کر بڑے ہال میں چلی گئی ـــ وہ ہال ہمیشہ کی طرح شفاف شیشہ سا بنا تھا۔ وہاں ملازم دروازوں کے پیتل کے ہینڈل چمکا رہا تھا۔ بڑے بڑے گلدانوں میں شاید مالی نے ابھی ابھی تازہ گلاب لگائے تھے۔ پل بھر کو رک کر ایمن نے ان میں سے ایک سرخ گلاب نکال لیا۔ سرخ گلاب جو محبت اور خلوص کی نشانی ہے، کامیابی کی نیک تمناؤں سے وابستہ ہے۔ ریحانہ کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ ملازم نے مسکرا کر اسے سلام کیا اور وہ اندر کے برآمدے میں داخل ہو گئی۔

اس نے پردہ اٹھا کر چاہا کہ اندر داخل ہو جائے، لیکن جیسے اس کے قدم دروازے ہی میں جکڑ گئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ چھوڑ دیا۔

اندر آزر نواب کے گلے میں ریحانہ کی باہیں حمائل تھیں اور وہ جھک کر انھیں سمیٹے ہوئے تھے۔ ریحانہ کی آنکھیں فرطِ سپردگی سے بند تھیں اور آزر نواب ان کے ماتھے پر ہونٹ رکھے بے خود کھڑے تھے۔ گو کہ دروازے کی طرف ان کی پشت تھی پھر بھی ایمن اس سرکو اچھی طرح پہچانتی تھی، جو بلند اقبال تھا، گھنے بالوں والا خوش وضع سر جس کے چمکیلے بال گردن پر سے ہوتے ہوئے قمیص کے کالر کو چھوتے تھے ۔ کئی بار ایمن کے دل میں ان بالوں میں شانہ کرنے کی آرزو جاگی تھی، جسے اس نے سخت کوسست کہہ کر سلا دیا تھا۔ وہی سراب ریحانہ کی آنکھوں پر جھکا ہوا تھا ۔۔۔ اور ریحانہ کی انگلیاں ان بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔

یہ نظارہ فیصلہ کن تھا۔

پتا نہیں آزر نواب سے لاتعلقی کے عزم کے باوجود ایمن کو کیوں دکھ ہوا۔ آزر نواب پہلے بھی اس کے کب تھے؟ لیکن پہلے وہ کسی اور کے بھی تو نہیں تھے۔

وہ بوجھل قدموں سے ہال میں واپس آگئی ۔۔ درمیانی سنگ مرمر کے گول ٹیبل پر اس نے اپنا تحفہ اور سرخ گلاب رکھ دیا۔ اور بجھی بجھی سی جیپ میں جا بیٹھی۔

کیا آزر نواب واقعی ریحانہ سے پیار کرتے تھے؟۔ وہ جو منظر ابھی دیکھ آئی تھی اس سے تو اسی بات کی تصدیق ہوتی تھی۔

کتنا اچھا ہوا کہ اس نے اپنے جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔ وہ اب زندگی بھر اپنے راز کو دل میں دبائے رکھ سکتی تھی۔ اس کی محرومیوں میں ایک محرومی یہ بھی سہی ۔ لیکن یہ کیسی محرومی تھی جس نے گذشتہ ساری چھوٹی بڑی ناکامیوں اور محرومیوں کو دھندلا دیا تھا۔!

راستے بھر کی خاموشی اتنی پُر شور کبھی نہیں تھی ۔۔ وہ جیب جیپ سے اتری تو منشی صاحب نے اسے غور سے دیکھ کر کہا" بھوت جلدی آگئے بی بی آپ ۔۔ میں اتی جلدی میں تو نہیں تھا" وہ کچھ دیر اپنی شیروانی کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے دلاسے کے الفاظ ڈھونڈتے رہے" سہیلی کو چھوڑ کے جانا بھوت برا دکھ رائے آپ کو؟"

لیکن ایمن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اتر کر اندر چلی آئی۔

منشی صاحب نے سامان سے لدا ٹریلر جیپ سے جڑوایا اور اسے لے کر اسٹیشن چلے گئے۔

جب ٹرین کاچی گوڑہ اسٹیشن پر پہنچتی ہوئی رکی تو اسٹیشن کی بلڈنگ کی برجیاں اندھیرے میں مدغم

ہو چکی تھیں اسٹیشن اور اس کے پیچھے بلدہ حیدرآباد روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ دوڑتی ٹرین میں بڑی سرکار کی آنکھیں تکان سے بوجھل ہوتی دیکھ کر امین نے ان کی کن پٹیوں پر اوڈی کولون لگایا اور صاف ستھرے رومال کو کولون میں ڈبو کر آنکھوں پر رکھنے کو دیا۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ بڑی سرکار جلد سے جلد حویلی پہنچ کر آرام کریں۔

ٹرین رکی ۔۔۔ آزر نواب نے پہلے بڑی سرکار کو اور پھر امین کو سہارا دے کر اتارا ۔۔۔ اٹینڈینٹ کمپارٹمنٹ سے شمشاد اور ملازم اتر آتے۔ پتا نہیں کیوں آزر نواب نے منشی صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دینے سے منع کیا تھا۔ وہ شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں حویلی اور حویلی کے کاروبار کس طرح چل رہے تھے۔

وہ کچھ دیر کو ویٹنگ روم میں رک گئے۔ ملازم نے فوراً کار بھجوانے کے لیے فون کیا۔ دس منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ویٹنگ روم کے دروازے پر باوردی شوفر نے خبر دی کہ کار پہنچ گئی ہے۔ بڑی سرکار نے بظاہر اطمینان کا سانس لیا۔ آزر نواب کی بے چینی بھی ختم ہوئی۔ وہ انتظار کے عادی نہیں تھے، لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

اسٹیشن کے باہر لمبی چوڑی چمک دار بیوک ان کی منتظر تھی اور اس کے پیچھے ہی وین بھی۔ ملازم اور منشی صاحب کو سامان کے ساتھ آتا چھوڑ کر بڑی سرکار، امین اور شمشاد، آزر نواب کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

حویلی کے بڑے گیٹ سے داخل ہونے پر امین کو وہ دن یاد آیا جب وہ تنہا، پیدل، اس شاندار پھاٹک میں داخل ہوئی تھی ۔۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق ہو گیا تھا۔ اب وہ اس خار دار جھاڑی سے بچنا سیکھ گئی تھی جس نے اس کی ہتھیلیاں لہولہان کر دی تھیں۔ اب وہ تقریباً اس حویلی کا ایک حصّہ بن گئی تھی ۔۔ اب وہ اجڑا ہوا باغ اتنا اجڑا ہوا نہیں محسوس ہوا، نہ حویلی تک پہنچنے والا راستہ اتنا پرپیچ اور پُرخار۔

پورٹیکو میں کار رکی، سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے اوپر وسیع برآمدے اور پھر عظیم ہال کو روشنیوں سے جگمگاتا دیکھ کر آزر نواب کے ابروؤں پر بل اور بڑی سرکار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

"تسنیم پاشا کو شاید ہمارے آنے کی خبر مل گئی تھی۔" بڑی سرکار نے خوش ہو کر کہا۔

"کس نے خبر دی؟" آزر نواب مشکوک ہو کر بولے۔ "ہم نے تو منع کیا تھا ۔۔ منشی صاحب۔"

ابھی ان کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ موسیقی کی لہر اور اونچے قہقہوں نے انھیں ٹھٹکا دیا۔

ڈرائیور دروازہ کھولے مودبانہ کھڑا تھا۔ آزر نواب کار سے اترے اور بڑی سرکار کو سہارا دیا ـــ دوسری طرف سے ایمن اتری ـــ سنگیت کی لہریں اونچی ہوتی جارہی تھیں۔

سیڑھیاں طے کرکے بڑی سرکار، آزر نواب اور ایمن برآمدے سے ہوتے ہوتے ہال کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔

ہال جگمگا رہا تھا۔ وہاں چھت سے لٹکے عظیم جھاڑ فانوس جو خاص خاص موقعوں پر استعمال کیے جاتے تھے آج پورے کھلے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان سے لاکھوں جگنو لپٹ گئے ہوں۔ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہاں خاصی بڑی پارٹی کا انتظام تھا۔

آزر نواب اور بڑی سرکار کے پیچھے ایمن دم بخود کھڑی تھی۔ آزر نواب نے درشت نظروں سے وہاں بپا ہوتے ہوئے طوفان بدتمیزی کو دیکھا۔ کئی چہروں سے گزر کر ان کی نظر تسنیم پاشا پر رک گئی۔ جب آزر نواب کی سرد آنکھوں سے ان کی نظریں ملیں تو ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ وہاں موجود سب لوگ یکایک خاموش ہو گئے اور ان کی آنکھیں اس وسیع دروازے پر مرکوز ہو گئیں جہاں آزر نواب، بڑی سرکار اور ایمن کھڑے تھے ـــ تسنیم پاشا کا ہاتھ بڑے سے کیک کو کاٹتے ہوئے وہیں رک گیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کے فرنچ شیفان کی ساڑی میں ان کا سرخ و سفید رنگ اور بھی نکھر آیا تھا۔ کٹے ہوئے، کندھوں تک پہنچے ہوئے بال، ہمیشہ کی طرح نہایت نفاست سے جمے ہوئے تھے۔ پل بھر کی بوکھلاہٹ نے ان کے چہرے پر سرخی بکھیر دی تھی۔ انھوں نے خود کو سنبھالا اور ہاتھ سے چھری رکھ کر تیزی سے بڑی سرکار کی طرف بڑھیں اور ان کے ساتھ ہی ان کے قریبی دوست مختار نواب بھی، جنھوں نے حسب معمول کچھ زیادہ ہی بھڑک دار فیشن ایبل سوٹ پہن رکھا تھا۔

"بندگی آپا بیگم" ـــ تسنیم پاشا نے بڑی سرکار کو تسلیم کرکے ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ آج واپس آرہی ہیں"۔ ان کی سراسیمگی زیادہ تر آزر نواب کو دیکھ کر تھی۔

"ظاہر ہے" ـــ آزر نواب نے معنی خیز انداز میں کہا اور ایک چبھتی ہوئی نظر ماحول اور دعوتیوں پر ڈالی۔ وہاں موجود سارا ہی گروپ ایسا تھا جس سے راہ و رسم بڑھانے کی آزر نواب نے کبھی پروا نہیں کی تھی

"یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے" ـــ مختار نواب نے باگ ڈور سنبھالی۔ "آپ ان کی

سالگرہ کے موقع پر اچانک آگئیں "۔
بڑی سرکار نے کچھ نہیں کہا ۔ ان کے چہرے پر ایک تھکی ہوئی سی مسکراہٹ تھی ۔ مختار نواب نے آزر نواب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔۔۔ لیکن ان کی نظر امین پر جمی ہوئی تھی ۔۔ وہ حویلی میں امین کے موجودگی کے بارے میں تو جانتے تھے ۔ لیکن انھیں پتا نہیں تھا کہ امین جس شئے کا نام ہے وہ اتنی دل آویز ہے ۔
" مختار نواب نے آج ہماری سالگرہ منائی ہے "۔ تسنیم پاشا نے کچھ کھسیا کر کہا۔
" یہ تو اس حویلی کی عزت افزائی ہے "۔ آزر نواب نے مختار نواب کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو رسما چھوا اور بر قاب لہجے میں بولے ۔ چلیے سرکار آپ بہت تھک گئی ہیں "
بڑی سرکار کے شانے پر ہاتھ رکھے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے ۔ اور ان کے پیچھے امین بھی۔
آزر نواب کا ڈانڈیلی کو اچانک چھوڑنے کا فیصلہ اب امین کی سمجھ میں آیا ۔ کچھ دن سے حویلی کے اخراجات کے لیے چوڑے بل ڈانڈیلی پہنچ رہے تھے ۔ آزر نواب نے کوئی تشویش ظاہر نہیں کی تھی ۔۔ لیکن یہ ان کا انداز ہی تھا ۔۔۔ ان کے فیصلے اچانک اور قطعی ہی ہوا کرتے تھے ۔
اوپر گھوم کر جاتی ہوئی سیڑھیوں پر پل بھر کو رک کر آزر نواب نے پلٹ کر ایک نظر وہاں موجود مہمانوں کو دیکھا ۔ ان میں امارت کی گرتی ہوئی عمارتوں کے سب ہی شہتیر موجود تھے ، جو اپنے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت لٹا چکے تھے یا نوابی اور جاگیرداری کے ٹوٹتے ہوئے خول سے باہر نکل کر حیران تھے۔ ابھی ان کی کوئی راہ متعین نہیں تھی ۔ نظر دھندلائی ہوئی تھی ۔ ان میں نام نہاد انٹلیکچویل بھی تھے جو زندگی کو اوچھی قدروں پر تولتے تھے ۔ اس وقت ان سب کی نظریں ان تینوں پر تھیں ۔
شمشاد نے پہلے ہی باتھ روم میں گیزر چلا دیا تھا ۔ کمرہ جوں کا توں تھا خدمت گاروں نے ایسا لگتا تھا سرکار کی غیر موجودگی میں ٹھیک طرح اس کی صفائی اور دیکھ بھال کی تھی ۔ فرنیچر پر کہیں گرد کا شائبہ بھی نہیں تھا۔
آزر نواب بڑی سرکار کو کمرے میں چھوڑ کر غسل کرنے چل دیے ۔ اور امین نے اتنی دیر میں ان کا ضروری سامان کھولا ۔ اور پھر اپنے کمرے میں چلی آئی ۔
کمرے میں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ بھی بہت تھک چکی تھی ۔ تکان سے زیادہ اس نے اعصابی تناؤ محسوس کیا ۔ وہ رونق جو وہ ابھی ابھی نیچے ہال میں دیکھ آئی تھی ، کچھ غیر فطری سی تھی ۔

نیچے ہال میں شور مدھم ہوگیا تھا۔شاید پارٹی اختتام پر تھی ۔ لوگ رخصت ہونے لگے تھے ۔ تسنیم پاشا پر اسے رحم سا آیا۔ وہ گذرے ہوتے لمحے پھر گزارنا چاہتی تھیں ۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وقت کی جیب پھٹی ہوتی ہے اور ہر لمحہ اس میں سے پھسل کر فنا ہو جاتا ہے ۔ ایسے لوگ جو وقت سے سمجھوتہ نہیں کرتے ، کاغذ کا گھروندا بن جاتے ہیں کسی روز زمانے کی جھلسا دینے والی ہوا انھیں بھک سے اڑا دیتی ہے۔

ان ہی خیالات میں گم وہ نہانے کی تیاری کر رہی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور شاہانہ صاحبزادی اندر آگئیں ۔کافی دنوں بعد امین نے انھیں دیکھا تھا ۔۔۔ دعا سلام کے بغیر وہ آرام دہ کرسی میں دراز ہوگئیں ۔ ان کے تیور بڑے ناگوار سے تھے جیسے وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی ہوں ۔ امین کو حیرت ہوئی کہ وہ نیچے بپا ہنگامے کا ایک حصہ کیوں نہیں بنیں ۔۔۔ یہاں کیا کر رہی تھیں؟ لیکن اس نے کہا کچھ نہیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شاہانہ صاحبزادی زیادہ دیر تک چپ نہیں بیٹھ سکیں گی ۔۔۔ وہی ہوا ۔

"My foot" ۔۔۔۔ انھوں نے پیر پٹک کر کہا " مجھے کیا پڑی ہے کہ جاکر ان بوڑھوں میں گھسوں ؟ میں تو مختار نواب کی وجہ سے جانا چاہتی تھی ۔۔۔ انھوں نے بلایا تھا مجھے ؟"

" مختار نواب تو حویلی میں ہیں میں نے ابھی انھیں دیکھا ہے " امین بولی

" وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں ۔ ممی نے ہی انھیں Hint دیا ہوگا کہ وہ ان کی برتھ ڈے منائیں ۔اور ممی نے مجھے پارٹی میں موجود رہنے سے منع کر دیا "

" کیوں ؟ " ۔۔ امین پوچھ بیٹھی ۔

" ان کا خیال ہے ، آزر نواب مختار نواب کو پسند نہیں کرتے ۔ اس لیے میرا پارٹی میں شریک ہونا ٹھیک نہیں ہے "

" بات تو ٹھیک ہے " امین نے بات کا پس منظر سمجھتے ہوئے کہا ۔ حالانکہ ڈانڈیلی چھوڑنے سے پہلے وہ آزر نواب کی کھلی دلچسپی ریحانہ میں دیکھ چکی تھی ۔لیکن آزر نواب موئیت تراشیں تو یہ کیا ضروری تھا کہ انھیں پوجیں بھی ۔خاندانی وقار کو منظور تھا کہ وہ شادی کسی نوابی خاندان کی چشم و چراغ ہی سے کریں ۔

" کیا خاک ٹھیک ہے ؟ بھلا آزر نواب کو کیوں اعتراض ہونے لگا " شاہانہ صاحبزادی الجھ پڑیں۔ " انھوں نے کبھی مجھے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی یہ اور بات ہے کہ وہ مجھے ابھی بچی ہی سمجھتے ہیں ۔۔۔ جو مجھے

ہرگز پسند نہیں۔ اب میں انھیں دکھا دوں گی کہ میں بھی خود مختار ہو سکتی ہوں — اب میں بچی نہیں ہوں۔"

امین نے سوچا کہ آذر نواب ہی نہیں وہ خود بھی شاہانہ صاحبزادی کو بچہ سمجھتی تھی۔ گو کہ وہ ای کی عمر کی تھیں لیکن ان کے مزاج میں ٹھہراؤ کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ اب بھی بچوں کی طرح مچل جایا کرتی تھیں۔ خود اس نے انھیں آذر نواب کا ہاتھ پکڑ کر ٹھنکتے دیکھا تھا۔ لیکن شاید وہ دن اب ختم ہو چکے تھے۔ بشارت نواب کی طرح ہو سکتا ہے آذر نواب کی گرفت اب شاہانہ صاحبزادی پر بھی مضبوط ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

"آپ نے کھانا کھا لیا۔؟" امین نے آخری ساڑی الماری میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میں نہیں کھاؤں گی۔" شاہانہ نے غصّے سے کہا۔

"بچپنا چھوڑ دیجیے شاہانہ۔" امین بولی "تسنیم پاشا جو کچھ کر رہی ہیں آپ کی بھلائی کے لیے کر رہی ہیں۔"

"یہ اچانک کیسے تمھارے سمجھ میں آ گیا کہ وہ میری بھلائی کے لیے ایسا کر رہی ہیں؟" شاہانہ نے اسے گھورا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ کون ماں باپ ہیں جو اپنی اولاد کی بھلائی نہیں چاہتے۔؟ امین نے بوجھل دل سے کہا۔" وہ آذر نواب کو آپ سے بہتر جانتی ہیں۔"

"میں پھر پوچھتی ہوں کہ آذر نواب کا اس سے کیا تعلق ہے؟" — شاہانہ صاحبزادی کا غصّہ بڑھا۔

"کیا وہ — وہ آپ کے منگیتر نہیں ہیں؟" امین نے دل پر پتھر رکھ کر پوچھا۔

"افوہ! تم کیسی بے معنی باتیں کرتی ہو امین۔" شاہانہ صاحبزادی نے سر تھام لیا "کون کر رہا ہے آذر نواب سے شادی؟" وہ تنک کر بولیں۔

"کون نہیں کر رہا ہے آذر نواب سے شادی؟" تسنیم پاشا کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولیں "شاہانہ صاحبزادی تم مسلسل اپنی بے وقوفی کا ثبوت دیے جا رہی ہو۔"

"ممی، آپ سمجھتیں کیوں نہیں۔ میں ہرگز آذر نواب سے شادی نہیں کروں گی۔" شاہانہ زور دے کر بولیں۔

"مجھے سمجھاؤ کہ کیوں کرنا نہیں چاہتیں تم آذر نواب سے شادی؟ کیا کمی ہے ان میں —

ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک، دولت مند حسین ہیں ــــ دنیا کی کون سی ایسی لڑکی ہوگی جو اُن کی دُلھن بننا پسند نہ کرے!"

"صرف دولت۔ اور حسن ہی تو سب کچھ نہیں ہے"ـــ شاہانہ نے جیسے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ "طبیعتیں تو بھی ملنی چاہییں۔ آزر نواب بے شک لاکھوں میں ایک ہیں لیکن ذہنی طور پر میں ان کا ساتھ نہیں دے پاؤں گی"ـــ شاہانہ نے اپنی کمزوری کا کھلا اعتراف کیا۔

"کیا مشکل ہے؟" تسنیم پاشا نے پوچھا۔

"مشکل؟ آزر نواب سارے کے سارے، دنیا کے سب سے زیادہ مشکل مرد ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے اور میں اپنے شوہر سے ڈرنا نہیں چاہتی"۔

ایمن شاہانہ کی صاف گوئی کی معترف ہوگئی۔ ان کے کردار کے آگے اسے اپنا کردار کمزور لگا۔ کیا اس نے واقعی بغیر سوچے سمجھے آزر نواب کے لیے اپنا دل ہار دیا تھا۔ لیکن اسے ان سے ڈر تو نہیں لگتا تھا۔ وہ اسے مشکل بھی نہیں لگتے تھے، بلکہ وہ تو ان کی قوت ارادی اور حالات پر قوی گرفت کی قائل تھی۔

"تو تمہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیوں پڑے گی؟" تسنیم پاشا نے ایمن کے تکیے پر کہنی ٹکاتے ہوئے کہا۔ ان کے لباس کی خوشبو سے ایمن کا سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

"ہزاروں موقع ایسے آسکتے ہیں، مثلاً اگر میں نے کلب میں کسی اور کے ساتھ ڈانس کرلیا تو وہ برداشت نہیں کریں گے"۔

"وہ ڈانس تو کرتے ہی نہیں ـــ سنا بالکل چھوڑ دیا ہے"۔ تسنیم پاشا بولیں۔

"اور مجھے ڈانس کا شوق ہے"۔

"Come on شاہانہ ـــ وہ اپنی کتابوں میں مگن رہیں گے ـــ اور مجھے کتابوں سے چڑ ہے"۔

"تو یوں کہو کہ تمہیں آزر نواب کی ہر بات سے چڑ ہے"۔

"لیکن مجھے آزر نواب سے چڑ نہیں ہے ـــ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں اور وہ اس بات کو مانتے ہیں ـــ اس کے علاوہ ان سے شادی نہ کرنے کی ایک وجہ اور ہے"۔

"اور کون سی وجہ ہے؟" ـــ تسنیم پاشا نے خوابیدہ سی آنکھوں کو کھولتے ہوئے پوچھا ـــ وہ اپنی لڑکی کی ہٹ دھرمی سے زچ ہو رہی تھیں۔

"میں ـــ میں"ـــ شاہانہ ہچکچائی۔

"ہاں، ہاں کہو۔ جب تم نے اتنا کہہ لیا تو اب کیوں زبان بند کرتی ہو؟"—— تسنیم پاشا بولیں۔

"میں . . . میں مختار نواب سے شادی کروں گی"۔ ان کے منہ سے نکلا اور تسنیم پاشا اسپرنگ کی طرح اچھل کر بیٹھ گئیں۔

"کیا بک رہی ہو۔؟" انھوں نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا"۔ شاہانہ صاحبزادی نے قدم جماتے۔

"جانتی ہو وہ تم سے عمر میں کتنے بڑے ہیں۔؟ وہ میرے ہی ہم عمر ہیں"۔

"آذر نواب کون سے بچے ہیں—— ویسے بھی میں عمر کو اہمیت نہیں دیتی"۔

لیکن تسنیم پاشا ان کی بات نہیں سن رہی تھیں۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔ انھوں نے کھوتے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا ممی؟" شاہانہ بولیں۔ "کیا اس وجہ سے کہ مختار نواب کی طرف سے آپ خود خوش فہمی میں مبتلا ہیں"۔

امین کانپ گئی اور تسنیم پاشا مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مختار نواب مجھ سے ہی شادی کریں گے"—— شاہانہ صاحبزادی کے تیور بہت مطمئن تھے۔

ماں اور بیٹی کے مابین اس غیر معمولی گفتگو کو سن کر امین سناٹے میں آگئی۔ اسے وہاں ٹھہرنا ہی بہت غیر مناسب لگا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئی۔ حالانکہ وہ بہت تھک گئی تھی، نہا کر جلد سونا چاہتی تھی، مگر اس مہابھارت میں اسے اپنی ہستی گم ہوتی نظر آئی۔ اس کی نیند چوپٹ ہو چکی تھی۔ وہ حیرت میں تھی کہ حویلی کے عام طور پر ادب و لحاظ سے بھرپور ماحول میں یہ گفتگو کیسی تھی۔ تسنیم پاشا اور اور شاہانہ صاحبزادی تہذیب کا وہ لبادہ جو وہ پبلک میں اوڑھے رہتی تھیں، کہاں چلا گیا تھا۔ تسنیم پاشا نے جو کچھ بویا تھا اسے اب کاٹنے کا وقت آگیا تھا۔

وہ گیلری سے ہوتی ہوئی پچھلے برآمدے میں نکل کر سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی اور سیڑھیوں کا لمس بھی فرحت بخش تھا۔

دور سے وقار جنگ کے کاٹیج کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ جا کر ان سے مل آئے۔ اس وقت تک تسنیم پاشا اور شاہانہ صاحب زادی شاید اپنے الفاظ کے خنجر میان میں رکھ لیں۔

وقار جنگ کو لڑکپن ہی سے لوگوں کو انگشت بدنداں کر دینے میں مزہ آتا تھا۔ ماشاء اللہ شکل وصورت ہی ایسی پائی تھی کہ غنیمت ہوا پریاں نہیں اُڑا لے گئیں انھیں کھلے آسمان تلے اسی ڈر سے نہیں سونے دیا جاتا تھا ورا نھیں چاندنی میں سونے کی ضد تھی۔ جب وہ سوتے، ان کے پلنگ کے چاروں کونوں پر جاگتی ہوئی لونڈیوں کا پہرہ رہتا۔ ان کے تکیے کے نیچے لوہے کی چھری رکھی جاتی، تاکہ آسیب سے بچے رہیں۔ لیکن وہ خود ان نوابی نخروں سے بے نیاز تھے۔

ایک روز تو انھوں نے غضب ہی کر دیا۔ اتالیق اور استاد اُن کا انتظار کرتے رہے، اور وہ محرم کے شیر کا بھیس بدلے جسم کو رنگے حویلی کے آگے ناچتے رہے۔

"آیا شیر! الو شیر! جنگل سے آیا شیر . . ."

کوئی انھیں پہچان ہی نہیں سکا۔ کبھی جا کر اسٹیج ناٹکوں میں چھوکریوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، کبھی لونڈوں لپاڑوں کے ساتھ "ترچین گڈ گڈ" کرتے ہوتے کبڈی کھیل رہے ہیں۔ اس وقت ان کے والد نواب تزئین الملک کا دور دورہ تھا۔ بچے بچے کے منہ پر اپنی اولاد نامدار کا تذکرہ سن کر ان کے منہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے طے کیا کہ انھیں انگلستان بھوا دیا جائے تاکہ نوابوں رئیسوں کے شایان شان گن حاصل کر کے واپس آئیں۔

وقار جنگ انگلستان چلے تو گئے، لیکن پڑھ لکھ کر سوسائٹی کے اونچے اطوار سیکھنے کی بجائے وہاں سے مصوری کی اونچی ڈگری لے کر واپس آتے۔ لیکن ساتھ ہی ان میں ایک بڑی تبدیلی بھی آگئی۔ اب وہ پہلے کی طرح بے دھڑک کھلنڈرے نہیں رہے تھے، بلکہ ایک سلجھے ہوتے ہنس مکھ نوجوان تھے۔ ان کی رفتار اور گفتار میں پختگی اور سنجیدگی آگئی تھی۔ پھر بھی انھوں نے اپنے خاندانی رعب اور دبدبے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ وہ بنیادی طور پر وہی تھے بلکہ اپنے ماحول سے دور رہ کر ان میں اور بھی زیادہ وسیع النظری آگئی تھی۔ پابند سلاسل رہنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ انھیں اس بات کی فکر نہیں تھی کہ سماج انھیں گلے لگاتا ہے یا دھتکارتا ہے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ وہ امرانہ سماج کا حصہ کبھی نہیں بن پاتے۔ لیکن خدا نے انھیں بے پناہ مردانہ حسن سے نوازا تھا۔ جہاں جاتے محفلیں رنگین ہو جاتیں۔ سیکڑوں نواب زادیاں ایسی تھیں جو اپنا ہر آرام تج کر اُن کا راستہ اختیار کرنے کو تیار ہو جاتیں۔ لیکن وقار جنگ کی سیمابی طبیعت کو نہ ان آنکھ مچولیوں سے رغبت تھی، نہ ان کے لیے فرصت۔ لیکن بجلی تو ان پر گرنی ہی تھی — جوانی ٹھوکر کھائے بغیر کیسے آگے بڑھ جاتی۔؟

ایک روز جب وہ اپنی "گوشہ محل" کی حویلی کی چھت پر مصوری کر رہے تھے اچانک ان کی نظر

سلیمان جاہ کی حویلی کے وسیع آنگن میں گم ہو کر رہ گئی۔

شرفاء کا طریقہ تھا کہ جب چھت پر جانا ہوتا تو خدمت گاروں سے آواز لگواتے "بنگلے پر چڑھتے گوشہ گوشہ ہونت" ـــــ اور خواتین اپنے گوشے پردے کا انتظام کرلیتیں۔ لیکن وقار جنگ کو اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ چھت پر چاندنی کی دیواریں اونچی ہی بنی تھیں۔ اور جہاں گوشے پردے کا لحاظ تھا، وہاں ان میں کوئی کھڑکی بھی نہیں رکھی گئی تھی۔ لیکن ایک کھسکی ہوئی اینٹ نے ساری احتیاط کا کام تمام کردیا۔ وہ ہاتھ میں برش تھامے، دیر تک سلیمان جاہ کے پائیں باغ میں تاکا کیے۔

گرمیوں کے دن تھے صحن میں مسہریاں اور تخت لگے تھے۔ چنبیلی کے جھنڈ کے پاس قالین بچھے تخت پر ایک چاندی کا آفتابہ سلفچی رکھی ہوئی تھی اور وہیں ایک بندوڑی (لونڈی) سلیمان جاہ کی صاحبزادی زمرد محل بیگم کے بال آراستہ کررہی تھی۔ ان بیاہی لڑکیوں کے بالوں کو دو حصوں میں بانٹ کر ان پر کپڑا لپیٹا جاتا، پھر اسے رسّی کی طرح بل دے دیا جاتا اس طرح کہ سر کو چھوڑ کر سارے ہی بال کپڑے میں ڈھک جاتے۔ اسے کوڑا کہتے ہیں۔ اس طرح بال جلدی جلدی بڑھتے ہیں۔

زمرد محل بیگم خفا تھیں۔ انھیں کوڑا پسند نہیں تھا، لیکن ان کی والدہ کا حکم تھا کہ باندھو۔

اسی عالم میں ان کے حسن کے رقصاں شعلے نے وقار جنگ کے دامن کو چھو لیا۔ جب تک زمرد محل بیگم کے بال سنورتے، وقار جنگ نے رنگوں میں انھیں مقید کرلیا۔ اور پھر یہ تصویر ان کے دل پر نقش ہوگئی۔

وقار جنگ کوئی مجنوں نہیں تھے کہ گریبان چاک کرکے صحرا کی راہ لیتے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ گوشہ محل کی حویلی میں پہلے وہ کبھی کبھی آیا کرتے تھے، اب ان کا زیادہ وقت وہاں گزرنے لگا تھا ـــــ دیدار یار کشاں کشاں انھیں وہاں لے جاتا۔ وہ چھبیلے اور زندہ دل تو تھے ہی۔ لونڈیوں کو انعام و اکرام دے کر کسی طرح زمرد محل بیگم سے رسم و راہ بڑھانے کی صورت نکال ہی لی۔ زمرد محل بیگم نے بھی وقار جنگ کو چلمن کی آڑ سے کئی محفلوں میں دیکھا تھا۔ بار بار دیکھا تھا، لیکن ہر بار خود پر قابو پالیا تھا۔ وہ اپنی تربیت پر حرف نہیں آنے دینا چاہتی تھیں ـــ آوارگی ان کا شیوہ نہیں تھا لیکن دل سے وہ بھی مجبور تھیں۔ دونوں حویلیوں کے مابین جو چور راستہ تھا، وہاں وہ دونوں ملا کرتے تھے۔ اور اس بات کو یا تو وقار جنگ کی لونڈی جانتی تھی یا پھر بیگم زمرد محل کی لونڈی۔ لونڈیوں کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ زبانیں کٹ جاتی تھیں لیکن مالک کا راز راز ہی رہتا تھا۔

قسمت کے کھیل کچھ اور ہوتے ہیں، جنھیں وقار جنگ سمجھ سکے نہ زمرد محل ـــــ نواب سلیمان جاہ

نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو گورنس مقرر کی تھی۔ انھوں نے عام رواج کے مطابق تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کی۔ وہ بیگم زمرد محل کی شادی کے لیے بھی اس بات کے منتظر تھے کہ ان کی تربیت مکمل ہو جاتے۔ جہاں اتنی روشن خیالی انھوں نے پائی تھی، وہیں چند باتوں میں بڑے نستعلیق بھی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں داماد ہم رتبہ ملیں۔ وہ حیدرآباد کے ان معدودے چند نوابوں میں تھے جن کی پشتوں کو ادھیڑ بھی دیا جائے تو خاندان میں کوئی قابل گرفت نقص نہیں نکل سکتا تھا۔ ان کی اپنی، تین بیگمات تھیں۔ اس کے علاوہ کنیزوں، مغلانیوں اور خواصوں کا طبقہ الگ ان کے زیر سایہ رہتا تھا۔ اسے وہ رئیسانہ لوازم سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے مرتبے کا بہت لحاظ تھا۔ اور جہاں یہ بات آئی، وہاں وقار جنگ کا کوئی مقام نہیں تھا۔ گو ان کی شرافت بے داغ تھی لیکن ان کی شہرت اور باغیانہ خیالات سے سب ہی واقف تھے۔

وقار جنگ کی فرصت کے اوقات عام طور پر فلاکت زدہ آرٹسٹوں، پریشان حال مصنفوں اور شاعروں کے ساتھ گزرتے تھے۔ ان پر ایسے لوگوں کی دوستی کا الزام تھا۔ ویسے درباروں، حویلیوں کے سایۂ عاطفت میں کتنے ہی شاعر اور فنکار پنپتے تھے، لیکن، وقار جنگ تو ان سرپھروں سے رسم و راہ رکھتے تھے جنھیں درباری خیرات منظور نہ تھی، جو اسے اپنی خودداری کا سودا سمجھتے تھے۔

بیگم زمرد محل اور وقار جنگ کی محبت مستحکم اور بے داغ تھی لیکن وہ ان کے سینوں میں ہی گھٹی رہ گئی۔ وقار جنگ تو خیر زمانے کو ٹھوکر پر رکھتے تھے۔ وہ کھلے عام اپنی محبت کا اظہار کر کے بیگم زمرد محل کو اپنانا چاہتے تھے، لیکن بیگم زمرد محل کسی طرح راضی نہیں ہوئیں۔ وہ اپنے والد کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ وقار جنگ سے شادی کا مطلب صاف ان کے والد کی خودکشی تھا۔ انھوں نے اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کا خون تو کر ہی ڈالا، وقار جنگ کا ہاتھ بھی اپنے سر پر رکھ کر قسم کھلائی کہ وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں ان کی محبت کا گلا گھونٹ دیں گے۔

نواب سلیمان جاہ کی توقعات کے مطابق جب بیگم زمرد محل کی شادی طے ہو گئی تو وہ آخری بار وقار جنگ کے سینے سے لگ کر اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ وقار جنگ انھیں سینے سے لگائے بیٹھے رہے۔ بیگم زمرد محل کی کنیز نے سو جتن کیے، تب انھیں ہوش آیا۔

کچھ ہی دن میں بیگم زمرد محل وقار جنگ کے لیے غیر ہو گئیں۔

شیشہ ٹوٹتا ہے تو سو ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔ وقار جنگ بھی ٹوٹ گئے۔ بکھر گئے۔ لیکن وہ ایک میں بھی تنہا تھے۔ سو میں بھی تنہا رہے۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی کہ وقار جنگ

کے سر سے کیا قیامت گزر گئی ۔ انھوں نے زمانے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں اپنی جان کی بازی لگا دی اور کامیاب بھی ہو گئے ۔ لیکن محفلوں سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ تنہائی پسند ہوتے گئے ۔ جایداد جاگیر کے کاموں میں انھوں نے یوں بھی کبھی دلچسپی نہیں لی تھی ۔ وہ اپنے بڑے بھائی نثار الدولہ کے حق میں جایداد جاگیر سے اس شرط پر دست بردار ہو گئے کہ تا حیات ان کے جائز اخراجات پورے ہوتے رہیں ۔

کوئی وجہ نہیں تھی کہ نثار الدولہ ان کی خواہش رد کرتے ۔ ویسے ہی ان کی اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی سے کچھ خاص نبھتی نہیں تھی ۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ طبیعتوں کے اختلاف کے علاوہ اس کی وجہ کچھ نفسیاتی بھی تھی ۔ یہ شاید ان کا احساس کمتری تھا ، جتنے وقار جنگ حسین وجیہہ تھے ، نثار الدولہ مرحوم اتنے ہی بد شکل تھے ۔ وقار جنگ نے اپنے والد نزہتین الملک کی وجاہت پائی تھی ، جبکہ نثار الدولہ ہو بہو اپنی والدہ کے ہم شکل تھے ، جو بڑی بیگم تھیں ۔ ان کی تند مزاجی بھی مشہور تھی ۔ انھیں اپنے چھوٹے بھائی سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں تھا اور یہ لاتعلقی وقت کے ساتھ نفرت میں بدل گئی تھی ۔ اس میں کچھ ہاتھ ان کی والدہ کے حسد کا بھی تھا ۔ وقار جنگ ان کی فطرت سے واقف تھے جایداد پر حق جتانے کا مطلب مسلسل ریشہ دوانی تھی ۔ اور بیگم زمرد محل کو کھونے کے بعد وہ دل کے اور بھی غنی ہو گئے تھے ۔ یوں بھی انسان جب اپنی سب سے عزیز شے کھو دیتا ہے تو اس کے پاس اس بات کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی میں اور کیا پا رہا ہے اور کیا کھو رہا ہے ۔ چنانچہ نواب نثار الدولہ کی بڑی سرکار سے شادی کے بعد وہ اس چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئے ۔ جو ان کا گوشۂ عافیت تھا ۔

جب ایمن ان کے پاس پہنچی تو وہ خاصہ تناول فرما رہے تھے ۔

ایمن نے ملازم سے کہا " میں بعد میں پھر کبھی آ جاؤں گی " ۔ اور جانے لگی لیکن وقار جنگ اس کی آواز سن کر خود کمرے کے دروازے پر چلے آتے اور اسے ساتھ لیے کھانے کی ٹیبل پر جا بیٹھے ۔ اور اسے بھی ساتھ کھانے پر مجبور کر دیا ۔

وقار جنگ کے ساتھ بیٹھ کر وہ ہمیشہ خوش ہوتی تھی ۔ ان کا انداز بے حد شائستہ تھا ۔ لہجے کی نرمی اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ ان کے اندرونی سکون کا پتا دیتی تھی ۔

" ڈانڈیلی جا کر تم اور بھی نکھر گئی ہو " ۔ وقار جنگ کھانے کے بعد سگریٹ سلگا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے ۔ ان کی تعریف سے ایمن کے گالوں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے ۔

وقار جنگ وہاں اس کی مصروفیات کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایمن نے مختصراً اپنے ڈانڈیلی کے قیام کے بارے میں انھیں بتایا۔ آزر نواب کی مصروفیات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا ـــــ لیکن اسے خود محسوس ہوا کہ ان کا ذکر وہ غیر معمولی احتیاط سے کر رہی تھی ـــ جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی ـــ وہ خود اپنے آپ پر جھلّا اٹھی۔

"یہ لڑکا آزر نواب ـــ" وقار جنگ نے سگریٹ کا کش لے کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کتنا بدل گیا ہے وہ جب انگلستان سے لوٹا تھا تو سنا ہے لڑکیاں اسے گھیرے رہتی تھیں۔ کلب میں، ریسوں میں ہر جگہ ـــ اب وہ بدل گیا ہے۔ بہت بدل گیا ہے۔"

ایمن اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ آزر نواب کہاں سے بدل گئے تھے۔ کیونکہ وہ تو ان کا موجودہ روپ ہی دیکھ رہی تھی۔ بشارت نواب نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ کبھی کبھی ان کے رویے کی درشتگی بتاتی تھی کہ اگر کسی نازک ہاتھ نے ان کا دامن تھامنا بھی چاہا ہوگا تو ناکام رہا ہوگا ـــ ایمن کا تجربہ بتاتا تھا کہ وہ محض ہلکے پھلکے فلرٹیشن میں یقین رکھتے تھے۔ یا ہو سکتا ہے ان کے تجربے اس سے بھی گہرے ہوں، لیکن وہ خود کو شادی کے بندھنوں میں جکڑنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ تاہم اب صورت حال کچھ مختلف تھی۔ ادھر ریحانہ سے ان کے برتاؤ کو محض دوستی نہیں کہا جا سکتا تھا اور ادھر تسنیم پاشا اپنی بیٹی شاہانہ صاحبزادی کے لیے ان پر ڈورے ڈال رہی تھیں ـــ "دیکھا چاہیے کون جیتتا ہے" اس نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔

"اس اچانک مسکراہٹ کی وجہ جان سکتا ہوں؟" وقار جنگ نے استعجاب سے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں ـــ میں سوچ رہی تھی۔ آزر نواب کا ہاتھ تھامنے میں پتا نہیں کون کامیاب ہوتا ہے۔" وقار جنگ سے حدّ ادب رکھتے ہوئے بھی وہ کافی بے تکلف تھی۔

"آزر نواب نے کچھ دیر ضرور لگا دی ہے، لیکن پھر بھی جو لڑکی انھیں جیت لے گی، گھاٹے میں نہیں رہے گی۔"

ایمن چپ رہی۔

"کیوں تمھیں میری رائے سے اتفاق نہیں ہے؟" ـــ وقار جنگ نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ـــ میں، انھیں کچھ زیادہ نہیں جانتی" ـــ اس نے احتیاط برتی۔

"تم بہت سمجھدار ہو" ـــ وقار جنگ نے اسے معنی خیز انداز سے گھورتے ہوئے کہا۔

مگر انھیں سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگا تو ورنہ ...“

”ورنہ؟“ ایمن نے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔

”ورنہ ـــــ بہت دیر ہو جائے گی ڈیر گرل!“

”میں ـــ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ۔کیا وہ اتنے خطرناک ہیں؟“ ایمن نے بات کو ہلکا پھلکا بنا کر معصومیت سے پوچھا۔

”خطرناک تو نہیں“ وقار جنگ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پھنسا کر گھٹنوں پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”بدقسمتی سے ان کے پس منظر نے انھیں سنگدل بنا دیا ہے“

”لیکن وہ سنگدل تو نہیں“ ایمن نے کچھ زیادہ ہی بے ساختگی سے کہا۔ اور وقار جنگ اسے چپ چاپ دیکھنے لگے ۔ یکایک ایمن کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

وقار جنگ نے اسی طرح اسے دیکھتے ہوئے کہا ”اوہ!“ ـــ اور وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”اوہ“ ـــ انھوں نے اب بالکل دوسرے لہجے میں کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے گیٹ تک اسے چھوڑنے آئے ۔ وہاں رک کر انھوں نے بڑے معنی خیز انداز میں ایمن کو دیکھ کر پوچھا۔

”اوہ؟“ ـــ اور اب کی بار وہ جھینپ کر ہنس پڑی اور وقار جنگ نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

کچن میں ایمن ایک نئی پڈنگ بنانے میں مصروف تھی جس کی ترکیب اسے بڑی سرکار کے کمرے میں رسالوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ملی تھی ۔

”ایمن بی بی ـــ تمھاری ذمہ داریوں میں کچن کی ذمہ داری تو میں نے شامل نہیں کی تھی۔“ بڑی سرکار نے کہا۔ ”تم بیکار اپنا کام بڑھاتی ہو“

ایمن نے کچھ جھجکپا کر کہا ”سرکار، آپ کا حکم ہو تو نہ جایا کروں ـــ دراصل مجھے نئی نئی ترکیبیں آزمانے کا شوق ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی چلی جاتی ہوں“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے ہر بات میں تمھارا دلچسپی لینا اچھا لگتا ہے ـ تم کو میں حویلی ہی کے ایک فرد کی طرح سمجھتی ہوں“ بڑی سرکار نے مسکرا کر کہا ”میں نے تو صرف اس لیے کہا تھا کہ بیکار ہلکان ہوتی ہو ـــ آذر نواب نے یوں بھی تمھارا کام بہت بڑھا دیا ہے ۔

"جی میں نے کام شروع ہی سے کیا ہے ۔ مجھے اچھا لگتا ہے" ایمن لو بی "میں چھوٹی سی تھی تب ہی سے ابا کے لیے کچھ نہ کچھ بنایا کرتی تھی ۔ اور میں جو بھی بنا دیتی، وہ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔"
"خوش نصیب تھے تمھارے ابا" بڑی سرکار نے اس کے اداس ہوتے چہرے دیکھ کر کہا "اب شاید تمھارے ابا کی جگہ میں نے لی ہے ۔ مجھے بھی تمھاری بنائی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔"
ایمن ان سے کیا کہتی کہ ان کے اسی شفقت آمیز برتاو کی وجہ سے اس کے لیے حویلی چھوڑنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا ۔ وہ خاموشی سے رسالہ لیے کچن میں چلی آئی۔
جب سے اس نے کچن میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، وہاں صفائی ستھرائی بہت ہو گئی تھی ۔ قدیم طرز کا لوہے کا آون اب چمکتا رہتا تھا۔ کچن جھینگروں سے پاک تھا ۔ وہاں رکھی میزیں بھی گرد سے مبرا تھیں۔ کچن کے ایک ریک پر اس نے باقاعدہ پکوان کی کتابوں کی لائبریری سی بنا لی تھی ۔
ملازم نے آکر کہا کہ آزر نواب لائبریری میں اسے بلا رہے ہیں اس نے پڈنگ آون میں رکھی اور ایپرن ہی سے ہاتھ پونچھتی لائبریری میں داخل ہوئی تو ایک دم ٹھٹک گئی۔
اس نے سمجھا تھا کہ لائبریری میں آزر نواب اکیلے ہوں گے کئی بار وہ اسے اسی طرح مدد کے لیے بلا چکے تھے ۔ لیکن اس وقت کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ وہاں موجود تھے ۔ آزر نواب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن دیر ہو چکی تھی ۔ وہاں موجود افراد جن میں دو غیر ملکی تھے اور دو ہم وطن اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ۔ ان کے چہروں پر جو مسکراہٹ تھی، اس کا مطلب کچھ بھی نکالا جا سکتا تھا

"My mother's General Assistant"

آزر نواب نے تعارف کرواتے ہوئے اچھی طرح واضح کر دیا کہ انھیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اس کا جو کچھ تعلق ہے محض بڑی سرکار سے ہے۔

"As Charming As Cinderalla"

ایک غیر ملکی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"Hope she does not lose her glass slipper like Cinderella"

ورنہ اس حویلی کا کاروبار ہی بند ہو جائے گا ۔" آزر نواب نے بظاہر بات کو ہنسی میں ٹالا لیکن ایمن جانتی تھی کہ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے ہوں گے۔
"لیکن فی الحال تو ایسا لگتا ہے کہ مس شہاب کے بغیر آپ کا بھی کام نہیں چلے گا" ۔ ایمن سے

ایک نے کہا اور سب ہنس دیے۔

اس دوران ایمن سنبھل چکی تھی۔ اس نے اپنا ایپرن اتار کر ایک طرف کو رکھ دیا تھا۔ ہلکے کاسنی شلوار قمیص میں اس کی متناسب شخصیت بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ سب آرکیٹکٹ، انجینیر اور کنسٹرکٹر تھے آزر نواب نے اپنے سامنے بڑی ٹیبل پر کچھ نقشے بکھیر رہے تھے۔ کچھ فائلوں کی ضرورت تھی جس کے لیے انھوں نے ایمن کو بلایا تھا۔ وہ فائلیں دیکھ کر چپ چاپ ایک طرف کو بیٹھ گئی۔ کیونکہ ابھی آزر نواب نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"اس شاندار حویلی کو بہت ہی خوبصورت ہوٹل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے"۔ ایک بدیسی نے جو آرکیٹکٹ تھا کہا۔

آپ کا خط ملنے کے بعد ہم نے حویلی کا اچھی طرح معائنہ کیا"۔ مسٹر باسو جو ایک کنسٹرکٹر تھے بولے "حویلی کے مغربی ونگ کو آپ کی رہائش گاہ بنایا جائے تو بہتر ہوگا"۔

"مجھے اور میری والدہ کو کسی بھی طرح کا خلل پسند نہیں ہے، مسٹر نکلسن، کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ کی اسکیم کے تحت یہ ممکن ہوگا؟"

وہی غیر ملکی جس نے ایمن کو سنڈریلا کہا تھا۔ ہاتھ میں پنسل لیے آزر نواب کے برابر جا کھڑا ہوا۔

"کوریڈور کے اس سرے پر، اس دروازے کو چنوا دیا جائے تو یہ حصہ بالکل الگ ہو جائے گا" اس نے پنسل سے نقشے پر بنایا۔" یہ حصہ بجائے خود ایک بڑی کوٹھی بننے کے قابل ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ لوگ انڈیا میں اتنے بڑے بڑے مینشن کس طرح قابو میں رکھتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہندستان ایک غریب ملک ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی۔

'ہندستان کی عزت تو تمھاری دین ہے۔ ورنہ یہاں کیا نہیں تھا' ایمن نے دل میں سوچا۔ تم نے ہم سے چھین چھین کر اپنے خزانے بھر لیے۔

اس کے سامنے ایک عظیم حویلی کا نقشا تھا۔ جو کسی زمانے میں ایک زندہ شہ رگ کی طرح پھڑکتی ہوگی۔ اس کی غلام گردشوں میں چہل پہل ہوگی، سیکڑوں انسان فکر معاش سے آزاد ہوں گے۔ اس میں شک نہیں تب انسان، انسان میں تفریق بہت تھی۔ لیکن وہ کیا اب نہیں ہے۔ کیا سوشلزم کے نام پر ایک مخصوص طبقہ لاکھوں کروڑوں بھوکوں کا استحصال اب نہیں کر رہا تھا؟ یہ سوالات ایسے تھے جن کا جواب کبھی کوئی تاریخ نہیں دے سکتی تھی۔ کیسے کیسے سنہری دور، تاریخ کے ڈھنگ میں پس گئے تھے۔ اس

حویلی کا بھی رعب داب اب پُر ملال ہو رہا تھا۔ یہ آزر نواب کی ہوش مندی ہی تھی کہ اپنی آبائی حویلی کو سسک سسک کر دم توڑتا نہیں دیکھ سکتے تھے انھوں نے اسے ہوٹل میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سب سے پہلے ذہنی دروازوں کو کھولنے کی ضرورت تھی، جن کی چولیں پیڑھیوں سے جمی ہوئی تھیں، انھیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق منظور کرنا تھا۔ مجبوراً نہیں بلکہ سلجھے ہوئے منطقی انداز سے اور یہی آزر نواب کر رہے تھے۔ لیکن زیادہ قابل تعریف تو بڑی سرکار تھیں، جو ہر اس تبدیلی کو، جس کا مشورہ آزر نواب دیتے تھے، خندہ پیشانی سے قبول کرتی جاتی تھیں۔ مثلاً حویلی کو ہوٹل میں تبدیل کرنے کا فیصلہ آزر نواب کے لیے اتنا مشکل نہیں رہا ہوگا جتنا بڑی سرکار کے لیے۔

کچھ دیر بعد آرکیٹکٹ اور انجینئر رخصت ہوتے۔ آزر نواب انھیں چھوڑنے گئے تو ایمن نے ٹیبل پر رکھے ہوئے نقشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی دلچسپی شروع سے ہی اس فن میں تھی۔ اس نے بہت کچھ اپنے والد سے سیکھا تھا۔ وہ اپنے ان گزرے ہوئے دنوں میں پہنچ گئی جب ان کے چھوٹے سے مختصر گھر میں ہر طرف نقشے ہی نقشے بکھرے ہوتے تھے۔ جنھیں وہ قرینے سے رکھتی جاتی تھی۔

وہ نقشوں کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے پتا بھی نہیں چلا کب آزر نواب اس کے پیچھے آکھڑے ہوتے۔

"حویلی کے اس ونگ کے بارے میں آپ کی بھی کوئی قیمتی رائے ہے۔" آزر نواب نے ٹیبل سے نیچے گرے ہوئے نقشے کو اٹھاتے ہوئے پوچھا جو ایمن نے بے خیالی میں نیچے گرا دیا تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آزر نواب بہت ہی قریب ایک ہاتھ پیچھے کرسی پر رکھے اور دوسرے سے ٹیبل پر اس کے آگے نقشا پھیلائے کھڑے تھے ان کی مسکراہٹ پھر اس کی ہنسی اڑا رہی تھی، لیکن اب وہ رفتہ رفتہ اس کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اطمینان سے وہ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر الگ کر دیا۔ اور دوسرے نقشوں میں سے ایک چن کر الگ ٹیبل پر پھیلا دیا۔

"اس نقشے میں تو کچھ نہیں ہے جس کے بارے میں رائے دی جا سکے۔" اس نے پنسل سے ایک جگہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "البتہ یہاں میرا ایک مشورہ ہے۔"

"آپ جانتی ہیں، کن ماہروں نے یہ تبدیلی کی ہے؟" آزر نواب نے طنز سے پوچھا۔

"جانتی ہوں"۔ ایمن بولی "میں فنی اعتبار سے کوئی خامی نہیں نکال رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔

"پھر کس طرف اشارہ ہے جناب کا؟" آزر نواب نے پوچھا۔

"یہاں، اس جگہ ... دریچے کو بند کر دیا گیا ہے"۔ وہ رکی۔

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں ــــ کوریڈور کو کہیں تو بریک دے کر نیچے سیڑھیاں نکالنی ہی تھیں"۔

"اس دریچے سے میں نے کئی بار اس طرف جھیل کے پار سورج کو غروب ہوتے دیکھا ہے"۔

"تو کیا سورج کو غروب نہیں ہونا چاہیے ۔؟" انھوں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

ایمن ان کی طرف دیکھے بغیر ہی سمجھ گئی کہ وہ اس کے مشورے کو سنجیدگی سے نہیں سنیں گے۔ اس نے نقشوں کو اکٹھا کر کے لپیٹنا شروع کر دیا۔ آزر نواب نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے پیچھے ٹیبل پر رکھ دیا اور ایمن دھم سے کرسی پر ٹک گئی ۔ وہ اس لمس سے، اس قربت سے دور ہی رہنا چاہتی تھی جو اس میں ایک انوکھی، انجانی سی کمزوری پیدا کر دیتا تھا۔

آزر نواب نے اسی طرح ہاتھ سے نقشے کو پھیلاتے ہوئے کہا "کچھ کیا کہہ رہی تھی؟"۔

پہلے تو ایمن نے سوچا کہ بے رخی سے کہہ دے، اسے کچھ نہیں کہنا ہے، لیکن جہاں تک نقشے کا سوال تھا، وہ مضبوط زمین پر کھڑی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے والد اس نکتے پر اس سے پورا پورا اتفاق کرتے۔

"یہاں اس دریچے کو بند کرنے کی بجائے اسے مکمل دروازہ بنا دیا جاتے جس کے آگے کشادہ بالکونی ہو، تاکہ سورج کے غروب ہونے کا دلکش منظر ضائع نہ ہو"۔

آزر نواب نے اپنے ہاتھ ہٹالیے اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "تم جانتی ہو، یہ ڈزائن مسٹر نکلسن نے بنایا ہے ۔ انگلینڈ کے مشہور آرکیٹیکٹ!"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"۔ ایمن نے پیپرویٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "کیا غیر ملکی اہل ہنر لڑکھڑا نہیں سکتے ۔؟ ویسے بھی ہمارے ملک کے موسم اور ماحول کی آگاہی انھیں اتنی زیادہ کہاں ہوتی ہے؟"

"تو تمھارا خیال ہے مسٹر نکلسن اس دریچے سے لڑکھڑا کر گر گئے؟" آزر نواب نے اسے

گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا — بلکہ یہاں بالکونی میرے خیال میں تعمیری تبدیلی کی بہتر صورت ہوسکتی ہے۔ ابا جی بھی مجھ سے اتفاق کرتے۔"

"تو یہاں ابا جی ما مسٹر نکلسن ہیں!" آزر نواب مسکرا کر بولے۔

ایمن کھڑی ہوگئی "میرے ابا بیشک انٹرنیشنل شہرت نہ رکھتے ہوں، لیکن ان سب سے اپنے فن میں کسی طرح کم نہیں تھے۔" اور وہ کرسی ڈھکیل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن اسے اچھی طرح احساس تھا کہ اس کے مغرورانہ اظہار خیال کو بچکانہ سمجھ کر آزر نواب مسکرا رہے ہوں گے۔

"سنو!" اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ آزر نواب بولے "تمہارے ابا کی ہتک ہرگز مجھے منظور نہ تھی۔"

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"ایک بات اور" آزر نواب بولے "آئندہ جب بھی کچن میں کام کرو تو Exhaust Fan ضرور چلا لیا کرنا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہاں اس نے اپنا دوپٹا سونگھ کر دیکھا اس میں واقعی مرچ مسالے کی بو بس گئی تھی — جب وہ پڈنگ بنا رہی تھی تو وہاں دوسرا پکوان بھی تو ہو رہا تھا۔

حیدرآباد واپس آکر امین کے رات دن اور بھی مصروف ہوگئے تھے۔ حویلی کے پس منظر میں تسنیم پاشا اور شاہانہ صاحبزادی نے بھی ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ماں بیٹیوں کی بالکل ٹھن چکی تھی۔ اور مختار نواب ایک ماہر جواری کی طرح دونوں مہروں سے کھیلے جا رہے تھے۔ شاہانہ صاحبزادی کسی طرح آزر نواب سے شادی کرنے کو آمادہ نہیں تھیں۔ جس کی کافی ٹھوس وجوہات وہ بیان کر چکی تھیں۔ وہ بار بار تسنیم پاشا کو یقین دلاتیں کہ مختار نواب ہی ان کے لیے ہر طرح موزوں شوہر ثابت ہوسکتے ہیں۔ عمر کے فرق کی انھیں چنداں فکر نہ تھی۔ انھیں یقین تھا کہ مختار نواب کے ساتھ زندگی بہت دلچسپ ہوگی۔ کلب، پارٹیاں، پاٹ لک، پکنک زندگی اگر ان خوش آیند مصروفیات میں گزر جائے تو انسان اور کس چیز کی آرزو کرسکتا ہے۔ جبکہ آزر نواب کے ساتھ ان کے حوصلے بہت آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ کچھ بندشیں تھیں۔ کچھ اصول تھے جو ان کی بیوی ہوتے ہوئے انھیں بھی اختیار کرنے پڑتے۔ آزر نواب ان کی نظر میں بہت ادیٹے تھے جن کے پاس وہ اپنی مشکلیں اور مسائل لے کر تو جا سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ

پبلک میں نظر آتے ہوئے فخر تو محسوس کر سکتی تھیں۔ لیکن ان کی شریکِ حیات بننے کی سکت شاہانہ صاحبزادی میں نہیں تھی۔ اور تسنیم پاشا کسی طور یہ ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ انھیں یہ بھی فکر نہیں تھی کہ آیا آزر نواب کو بھی یہ رشتہ پسند ہو گا یا نہیں انھیں شاہانہ صاحبزادی کے حسن پر مکمل بھروسا تھا۔ دوسرے انھیں یقین تھا کہ اگر بڑی سرکار کہیں تو آزر نواب ہرگز انکار نہیں کریں گے۔ اور انھوں نے بڑی سرکار ہی کے ذریعے یہ بات آزر نواب تک پہنچائی تھی۔ آزر نواب اس پورے تماشے سے بے خبر اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ یا شاید یہ صرف امین کا وہم تھا۔ کیونکہ آزر نواب کی عقابی نظروں سے حویلی کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی، لیکن اگر وہ یہ سب کچھ جانتے بھی تھے تو انھوں نے ظاہر کچھ نہ ہونے دیا ــــ ہاں، ان کی توجہ شاہانہ صاحبزادی کی طرف کچھ زیادہ مبذول ضرور ہو گئی تھی ــــ دوسرے موقعوں کے علاوہ اب وہ پولو کھیلنے کے لیے جاتے تو شاہانہ صاحبزادی بھی ان کے ساتھ ہوتیں ــــ پہلے پہلے تو وہ تسنیم پاشا کے سامنے ٹھنکتی رہیں کہ وہ آزر نواب کے ساتھ نہیں جائیں گی لیکن آزر نواب سے نہ کہنے کی ہمت ان میں نہیں تھی ــــ کچھ دن بعد آزر نواب کے جادو نے ان پر کام کرنا شروع کر دیا۔ فاصلے کم ہونے لگے ــــ اب وہ ان کے ساتھ وقت گزارنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگیں ــــ انھیں باہر گھومنا پھرنا، شاپنگ، ڈانس پارٹیاں پسند تھیں اور آزر نواب سہولتیں مہیا کر رہے تھے اور تسنیم پاشا اسے اپنی فتح تصور کر رہی تھیں ــــ شاہانہ صاحبزادی کے لیے بھی آزر نواب کی یہ توجہ انوکھی تھی ــــ ان کے ڈر اور فاصلے کو خود آزر نواب نے ختم کر دیا تھا۔ اب وہ کبھی کبھی آزر نواب کے ساتھ شوخی پر اتر آتی تھیں ــــ اور وہ انھیں ہنس کر خوشی خوشی جھیل جاتے تھے۔

امین ان کے طریقۂ عمل کو بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی ــــ اگر وہ واقعی شاہانہ صاحبزادی سے شادی کرنے کو تیار تھے تو ریحانہ سے ان کے التفات کا کیا مطلب تھا۔ یہ لیکن جس سوسائٹی سے ان کا تعلق تھا وہاں شاید ان باتوں کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔

آزر نواب نے شاہانہ صاحبزادی کو ان کے محدود حلقۂ احباب سے نکال کر نئے نئے تعارف کرا دیے تھے ــــ زیادہ مہذب اور زیادہ ٹھوس۔

ایک روز وہ بڑی سرکار کو سنا رہی تھیں کہ پولو کھیلتے ہوئے کس طرح ایک نوجوان میجر گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو گیا اور کس طرح آزر نواب اپنی جیتی ہوئی بازی چھوڑ چھاڑ اپنے گھوڑے سے اُچھل پڑے اور اس میجر کو خود اپنی کار میں ملٹری ہسپتال لے گئے۔ اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور چوٹیں بھی آئی تھیں۔

اب ہر روز وہ وقت نکال کر شاہانہ صاحب زادی کے ساتھ اس میجر کی خیریت پوچھنے کے لیے ملٹری ہسپتال جانے لگے تھے اس لیے شاہانہ صاحبزادی اب مختار نواب کے لیے بالکل وقت نہیں نکال پا رہی تھیں۔ ان کی کمی تسنیم پاشا پوری کر دیا کرتیں۔

ایک روز ہال کی سیڑھیوں سے اترتے اترتے ایمن ٹھٹک گئی۔

"شام کو تو میں آزر نواب کے ساتھ جا رہی ہوں" شاہانہ صاحب زادی فون پر معذرت چاہ رہی تھیں۔ اچانک تسنیم پاشا نے ان کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"بھئی آزر نواب انہیں پل بھر کے لیے تو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے" تسنیم پاشا نے غلو سے کام لیا "کوئی بات نہیں مختار نواب ہم تو آ ہی رہے ہیں —— آپ ہمیں لینے چلیے گا"

پتا نہیں دوسری طرف سے مختار نواب نے کیا کہا کہ تسنیم پاشا ہنس پڑیں "ہم جانتے تھے کال ہمارے لیے ہی ہو گی۔ تو پھر شام میں ملیں گے" اور انھوں نے فون بند کر دیا —— اس بار شاہانہ صاحبزادی مچل نہیں گئیں۔ انھوں نے صرف ماں کو گھور کر دیکھا اور ایک جھٹکے سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو شانوں کے پیچھے ڈھکیل کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

ایمن کو حویلی کے نقشوں پر آزر نواب کے ساتھ سر کھپاتے ہوتے شام ہو گئی۔ آزر نواب جلد سے جلد تعمیر کا کام شروع کرنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی کئی اور تفصیلات بحث طلب تھیں۔

شاہانہ صاحبزادی خوشبو کے جھونکے کی طرح لائبریری میں داخل ہوئیں۔

"چلیے گا نہیں؟" انھوں نے آزر نواب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کہاں؟" گویا آزر نواب چونک کر بولے۔

"آپ تو بھول ہی گئے!" شاہانہ صاحبزادی نے کہا "میجر تنویر نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں آج پارٹی دی ہے"

"اوہ، ہاں —— شاہانہ میں بھولا نہیں —— میں نے منشی صاحب کو ان کے لیے پھول بھجوانے کی تاکید کر دی ہے —— پارٹی میں آج تمھیں اکیلے ہی جانا ہو گا میں بہت مصروف ہوں —— میری طرف سے مبارکباد دے دینا"

"بہت مصروف ہیں آپ؟" شاہانہ صاحب زادی نے ایمن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں" —— ایمن نے نقشے سمیٹتے ہوتے کہا "انھیں کل بھی دیکھا جا سکتا ہے"

"کل اتوار ہے اور میجر تنویر نے عثمان ساگر میں پکنک کا انتظام کیا ہے۔" صاحب زادی آذر نواب سے مخاطب تھیں۔

"نہیں شاہانہ، میں کل بھی نہیں جا سکوں گا۔" "ان دنوں مجھے بالکل فرصت نہیں ہوگی۔" آذر نواب بولے۔ "تم جانتی ہو بڑے بڑے گروپ پکنک کا مجھے شوق نہیں ہے۔"

"تو پھر میں چلی جاؤں۔" شاہانہ نے پوچھا۔

"کمال کرتی ہو ــــ تم کوئی بچہ تو ہو نہیں کہ اجازت کی ضرورت ہو ــ شوق سے جاؤ ــــ ویسے میجر تنویر نے مجھے تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ــ؟"

"وہ آپ سے ملنے ہی والے تھے۔" شاہانہ نے کہا۔

"اچھا ہی ہوا کہ نہیں کہا۔" آذر نواب مسکرا کر بولے۔ "ان کی دعوت ٹھکراتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا۔"

شاہانہ صاحبزادی نے جھک کر آذر نواب کی پیشانی چوم لی اور لائبریری سے باہر چلی گئیں۔

"Naughty Girl" آذر نواب نے کہا اور ایمن دوسری طرف دیکھنے لگی ــ۔ شاہانہ صاحب زادی کے برتاؤ سے آذر نواب کے کچھ بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے، جنھیں انھوں نے سنوارنے کی کوشش بھی نہیں کی بلکہ اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرکے دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آپ چلے جاتے ــ یہ کام تو کل بھی ہو سکتا تھا۔" ایمن نے کہا۔

آذر نواب نے اسے گھور کر دیکھا اور بولے "کیا مجھے تمھاری مرضی کے مطابق اپنے پروگرام بنانے ہوں گے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" ایمن جلدی سے بولی۔ "میں نے اس لیے کہا تھا کہ شاہانہ صاحب زادی کو مایوسی ہوئی ہوگی۔"

"تمھیں بہت خیال ہے شاہانہ کا۔" انھوں نے اسی رکھائی سے کہا۔

ایمن نے بجھے دل سے سوچا، کیوں نہ ہو؟ کل کو شاید وہی تو میری نئی مالکن بننے والی ہیں ــــ وہ مدہ سال کامت سے تعلق رکھتی تھی ــ آذر نواب کی رکھائی نے اور بھی تازیانے کا کام کیا ــ اسے ایسا لگا جیسے وہ ہونٹوں کے اندر ہی آنسوؤں کو روک نہ پائے گی ــ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ــ آذر نواب نے کچھ نہیں کہا، بس دونوں کہنیاں ٹکائے میز سے کھیلتے ہوئے اسے غور سے دیکھتے رہے ــ ایمن نے اپنا

سر پھیر لیا۔ وہ روح میں اتر جانے والی ان آنکھوں کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اچانک اسے سکون کی تازہ ہوا کی زبردست ضرورت محسوس ہوئی اور وہ بغیر کچھ کہے لائبریری سے نکل آئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ چائے پینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ کئی دن سے وہ وقار جنگ کے پاس نہیں گئی تھی۔ سو چا دیں ہو آتے۔

جب وہ ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے کہا "لڑکی تم کافی دن بعد آئی ہو — تمھیں اس کی سزا ملنی چاہیے"

"جو بھی سزا آپ چاہیں" ایمن نے ہنس کر کہا۔ اب وہ وقار جنگ سے کافی مانوس ہو گئی تھی۔

"آج تمھیں میرے لیے اور خود اپنے لیے چائے بنانی ہو گی" انھوں نے کہا۔

"چائے ویسے تو میں ابھی پی کر آئی ہوں۔ لیکن آپ کے ساتھ بھی ضرور ایک پیالی پیوں گی" اس نے کہا۔

وقار جنگ بھی اس کے ساتھ کچن میں چلے گئے۔ ان کا ملازم دو دن سے چھٹی لے کر گاؤں گیا ہوا تھا۔

"پھر آپ کا کام کون کرتا ہے؟" ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

"میں خود ہی کرتا ہوں — اس میں حیرت کی کیا بات ہے" وہ مسکرا کر بولے۔

"آپ نے مجھے کیوں نہیں کہلوایا۔ میں آپ کی مدد کر جاتی"

"تمھیں فرصت ہوتی، تب نا — اگر تمھارے پاس وقت ہوتا تو کیا تم مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آتیں۔؟" وقار جنگ نے اس کے ہاتھ سے پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"عورت کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے کا مزہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ آج جانا ہے"

"دوسرے سب ہی مصوروں کی طرح آپ بھی عورت کو اپنا مرکز خیال بناتے رکھتے ہیں؟" ایمن نے پوچھا۔

"ہمیشہ عورت کو اپنا مرکز خیال تو نہیں بناتا، لیکن عورت کو ایک قابل تعظیم مخلوق ضرور سمجھتا ہوں"

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ کبھی آپ کا واسطہ کسی عورت سے نہیں پڑا" ایمن نے ہنس کر چھینٹا مارا۔

وقار جنگ کچھ دیر آپ مسکراتے ہوئے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ پھر بولے "کس مرد کا واسطہ عورت سے نہیں پڑتا۔؟ ہر مرد کے تصوّر میں کوئی ساتھی عورت ہوتی ہے۔"

"لیکن ہر مرد تو اسے تنظیم کی نظر سے نہیں دیکھتا؟"

"جو عورت کی تنظیم نہیں کرتا وہ اپنی ہتک آپ کرتا ہے ایمن۔"

"لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر عورت تنظیم کے قابل نہیں ہوتی!"

"میں تو بس ایک ہی عورت کو جانتا ہوں۔" ایمن نے چونک کر انھیں دیکھا۔

"چونکو نہیں ایمن ــــ میں واقعی صرف ایک عورت کو جانتا ہوں، جو بہ یک وقت ماں بھی ہے، بیٹی بھی، بہن بھی، بیوی بھی محبوبہ بھی۔ اس کا ہر روپ مقدّس ہے۔ عورت اپنے ہر روپ میں مرد کو کچھ عطا کرتی ہے، بدلے میں کچھ نہیں لیتی۔

"آپ بھول رہے ہیں ــــ وہ مرد سے کچھ مانگتی بھی ہے ــــ اپنے وقار کا تحفّظ۔"

"جو اسے ہمیشہ نہیں ملتا۔" وقار جنگ خالی کپ سنک میں رکھتے ہوتے بولے۔

"اور دراصل یہی چیز عورت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے، یہی اسے کوٹھے تک پہنچا دیتی ہے۔"

ایمن کچھ دیر اپنے ناخن کا پینٹ اکھیڑتی رہی۔ پرانی نسل کے ایک مرد کی زبان سے عورت کے بارے میں ہمدردانہ خیالات اسے کچھ انوکھے لگ رہے تھے۔

"لیکن آج کے زمانے میں زندگی مرد کے لیے بھی اتنی ہی گراں ہے جتنی عورت کے لیے۔" اس نے بات کا رخ بدلا۔

"گراں ہے ــــ ناممکن نہیں۔" وقار جنگ بولے "تم خود اپنی مثال لو۔ اس حویلی اور اس کی گونا گوں ذمہ داریوں نے تمھیں کیوں باندھ رکھا ہے؟ ــ اس لیے تاکہ مردوں کی اس دنیا میں تمھیں تحفّظ چاہیے۔ تمھارے حسن کے پروانے سیکڑوں ہوں گے۔ کتنے مردوں نے تم پر حریص نظریں ڈالی ہوں گی ــ لیکن تم سب سے دور اس حویلی میں بھاگ آئیں۔ کیونکہ تمھیں ڈر تھا کہ کہیں کوئی تمھیں دھوکا نہ دے بیٹھے۔ تمھیں مرد کی سفاکی سے، اس کی ریاکاری سے ڈر لگتا تھا۔"

"کیا سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔؟" ایمن نے گویا خود سے کہا۔

"نہیں، سب ایسے نہیں ہوتے ــ عورت اور مرد میں یہی تو فرق ہے۔ عورت ایثار اور قربانی پر اتر آتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے لیے کیا کر رہی ہے۔ جبکہ مرد ہر قدم پر خود غرضی کا

مظاہرہ کرتا ہے ۔"

"آپ ـــــ آپ زندگی میں کیا ایسی قربانی کسی کے لیے کریں گے ؟" ایمن نے انھیں ٹٹولا ۔

"زندگی دہرائی نہیں جاتی مائی ڈیر ۔" وقار جنگ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے "چلو میں تمھیں اپنی پینٹنگ دکھاؤں ۔"

"اُوہ آپ کا ہاتھ تو جل رہا ہے !" ایمن نے پہلی بار اُن کی بخار سے چڑھی ہوئی آنکھوں پر غور کیا "چلیے آپ لیٹ جائیے ۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو باتوں میں الجھایا ۔"

"نہیں ، مجھے تمھارا آنا اچھا لگا ـــ ہمیشہ اچھا لگتا ہے ۔" وقار جنگ نے کہا ۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں ۔" ایمن نے کہا ۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ـــــ میں ہومیو پیتھک دوا کھاتا ہوں ۔" وقار جنگ بولے ۔

"تو پھر چلیے لیٹ جائیے ۔ دوا میں خود دے کر جاؤں گی ۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے ۔"

وقار جنگ کے بتائے ہوئے بکس سے اس نے انھیں دوا نکال کر کھلائی اور گرم بلانکٹ اڑھا دی ۔

"میں پھر آؤں گی ۔" اس نے کہا ۔

"تم فکر نہ کرو ـــــ میرا ملازم آہی رہا ہوگا ـــــ شب بخیر معصوم ایمن ۔"

"شب بخیر ۔" اور ایمن دھیرے سے دروازہ بند کر کے چلی آئی ۔

حویلی کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا ـــــ جہاں کام چل رہا تھا ۔ وہاں سے سامان منتقل کرنا تھا ۔ وزنی قیمتی فرنیچر اور نازک چینی کا سامان ، حریری پردے اور مخملی قالین ، سب ہی توجہ مانگتے تھے ۔ ایمن کو اب اندازہ ہوا کہ وہ حویلی کتنی بڑی تھی جہاں یہ سب سامان ایسے سما گیا تھا کہ اس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا ، بڑی سرکار نے منتقلی کی مکمل ذمہ داری اس پر چھوڑ رکھی تھی ۔ آذر نواب خود بھی بہت مصروف تھے ۔ ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ مہینوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا منٹوں میں ختم کرنا چاہتے تھے ۔ بلڈنگ میں بہت زیادہ تبدیلیوں کی ضرورت نہیں تھی ۔ بیرونی داغ دوزی کے ساتھ اندرونی سجاوٹ کا کام جاری رہ سکتا تھا ۔ وہ خود گھنٹوں دھوپ میں کھڑے کام کی نگرانی کرتے اور شام کو ایمن کے تیار کیے ہوئے مختلف نقشوں پر بحث کرتے ۔ انھیں ایمن کی صلاحیتوں پر اتنا بھروسا ہو گیا تھا کہ کمروں کی سجاوٹ کا کام انھوں نے ایمن کو ہی سونپ دیا تھا ۔ ایمن کا اپنے والد کے ساتھ کا تجربہ اور ہوم سائنس کی پڑھائی اس کی مدد گار ثابت ہو رہی تھی ۔ دوسرے Interior Decoration میں اس کی اپنی بھی دلچسپی تھی ۔ پیشہ ورانہ ڈیکوریٹر بہت پیسے مانگتے تھے ۔ اس کے بنائے ہوئے

چند نقشوں کو دیکھ کر ہی آزر نواب نے طے کر لیا تھا، وہ باہر سے اس کام کے لیے لوگ نہیں بلائیں گے۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابتدا میں جو کام آسان لگتا ہے، شروع ہونے پر اتنا پیچیدہ ہو جائے گا۔" انھوں نے ایمن کو نقشے کھولتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"پیچیدہ نہیں، دلچسپ کہیے گا۔" ایمن ہنس کر بولی۔ اس نے ہر کمرے کی آرائش کے مکمل نقشے تیار کیے تھے، جس میں دہاں کے رنگ سے لے کر فرنیچر، اپ ہولسٹری، پردوں اور قالینوں تک کی تفصیل اور ان کے اخراجات درج کیے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں اس نے مختلف دکانوں سے معلومات حاصل کی تھیں

اس نے باغ میں کچھ ضروری تبدیلیوں کی رائے دی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ اس کا جوش جھیل کے بارے میں تھا۔

"جھیل کافی بڑی اور خوب صورت ہے۔ اسے بہت اچھی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

اس نے اپنا مجوزہ پلان آزر نواب کو بتاتے ہوئے کہا۔ یہ نقشہ مکمل Lay out کے ساتھ اس نے رنگوں ہی میں تیار کیا تھا۔

بید کے جھنڈوں کو اس نے بالکل نہیں چھوا تھا، جہاں کا قدرتی منظر صناعی کا محتاج نہیں تھا۔ البتہ مشرقی اور جنوبی کناروں کو کنگرے سے گھیر کر پانی میں کافی چوڑی جیٹی نکالی گئی تھی، جہاں بہ یک وقت کئی میزیں لگائی جا سکتی تھیں۔ اور نسبتاً بڑی پارٹی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ ساتھ ہی کچھ دور ایک چھوٹی سی جیٹی سے لگی ہوئی، پانی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں، جن میں زیادہ سے زیادہ چار لوگ بیٹھ سکتے تھے۔

حویلی کے احاطے کا سب سے پسندیدہ مقام ایمن کے لیے یہی تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اس میں اپنا سارا زور تخیل صرف کر دیا تھا۔

آزر نواب گہری سوچ میں ڈوبے مختلف زاویوں سے اس نقشے کو دیکھتے رہے۔ اور پھر انھوں نے ایمن کو دیکھا۔ ایمن نے سوچا کہ آئی شامت۔ اسے پہلے ہی سے اندیشہ تھا کہ اس کی کوششیں آزر نواب کو تمسخر کی دعوت دیں گے۔ وہ اسے ضرور رومانٹک ہونے کا طعنہ دیں گے۔ لیکن خلاف توقع انھوں نے کہا۔

"شاید اس سے اچھا استعمال اس جھیل کا اور کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا۔"

"ایمن کھل اٹھی۔ "لیکن اس میں کچھ عمارتی کام بھی ہے، بہتر ہو گا کہ ہم ایکسپرٹس سے رائے

لے لیں " آذر نواب نے کہا۔ " یہ کام مسٹر باسو کے سپرد کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔"

آذر نواب کی اچانک تعریف نے اسے خوشی سے بوکھلا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ نقشے لپیٹنے لگی۔ اور آذر نواب ایک نقشے پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکاتے اسے دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ جب ایمن نے نقشے لینے کو ہاتھ بڑھا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

" کیا بچپن ہی سے تمہاری یہ لٹ ایسی ہی گستاخ تھی؟" انھوں نے اس کے گال پر جھول آئی ہوئی لٹ کو ہلکے سے چھو کر کہا اور ایمن نے جلدی سے اسے اپنے کان کے پیچھے کر لیا۔ " اور کیا مسکراتے وقت یوں ہی تمہارے گالوں میں اسی طرح منے منے گڑھے پڑ جاتے تھے۔؟"

ایمن کا غذات سمیٹتے ہوئے ہنس پڑی۔ اور اس کے گالوں میں گڑھے ابھر آئے۔

" میں جب چھوٹی سی تھی تو ابا ہمیشہ مجھے گدگدا کر ہنسایا کرتے تھے۔ اور ہنستے ہی میرے گالوں کے گڑھوں کو چوم لیا کرتے تھے۔" آذر نواب کو ہلکے پھلکے مذاق کے موڈ میں دیکھ کر اس نے کہا۔

" یہ کام تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔" آذر نواب نے دھیرے سے کہا " بشرطیکہ ان آنکھوں میں اتنے سوال اور اتنے جواب نہ ہوں۔"

ایمن دم بخود رہ گئی۔ انھوں نے واقعی کچھ کہا تھا یا وہ محض اس کے کانوں کا دھوکا تھا۔ وہ طے نہ کر سکی۔

" مجھے دراصل تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔" آذر نواب بولے۔

" جی۔۔ کون سی باتیں؟"

" پہلے یہ Tapestry کے نمونے دیکھ لیں" آذر نواب نے ایک موٹا سا کیٹلاگ اٹھایا، جس میں ٹیپسٹری کے مختلف نمونوں کے چوکور ٹکڑے لیبل کیے ہوتے تھے۔

" ہم نے طے کیا تھا کہ کمروں کو نمبر دینے کی بجائے مختلف پھولوں کے نام دیے جائیں؟" آذر نواب بولے۔

" جی" ایمن ہمہ تن گوش ہو گئی۔

" میں چاہتا ہوں کہ یہاں عام اونچے درجے کے ہوٹلوں جیسا ماحول نہ ہو، بلکہ یہاں آکر ٹھہرنے والے مہمان، خواہ وہ کسی قومیت کے ہوں اپنائیت محسوس کریں۔ ان کے آرام کا مکمل انتظام ہو۔ یہ حویلی اپنی نوعیت کا واحد گیسٹ ہاؤس ہو جہاں نو دولتیوں کی بھیڑ بھاڑ نہ ہو بلکہ اسے اپنے چنے ہوئے، سنجیدہ لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو، جو یہاں ایک بار ٹھہرنے کے بعد بار بار آنا

چاہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے سر، ہمارے سرپرست صرف بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگ ہی ہوں گے؟"
ایمن نے منہ لٹکا کر کہا۔

"میں نے تو یہ نہیں کہا۔" آزر نواب نے صفائی پیش کی۔"نئی نسل میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تفریح اور دلچسپیوں کے اونچے معیار رکھتے ہیں۔ لہٰذا کمروں کے Decor اور سجاوٹ میں بھی میں چاہتا ہوں کہ اعلا ذوق کو ملحوظ رکھا جاتے۔ حیدر آباد اور حیدر آبادی کلچر کا رنگ اس میں ضرور موجود ہو۔" انھوں نے کپڑوں کے نمونوں کی کتاب ایمن کے آگے بڑھا دی۔

ایمن نے سرسری طور پر ایک نظر ان نمونوں پر ڈالی اور اسے بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔"اسے میں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"شاید تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔" آزر نواب نے کہا۔

"جی ہاں، وال پیپر کا کیٹلاگ ابھی تک نہیں آیا۔ اس کے بعد ہی پردوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال کچھ اور باتیں طے ہو سکتی ہیں۔ مثلاً نرسری۔"

"نرسری؟ — اس کی کیا ضرورت ہے؟" — آزر نواب بولے۔

"ضرورت تو ہے — نہ صرف یہ، بلکہ اسٹاف میں ایک ٹرینڈ نرس کا ہونا بھی ضروری ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے ڈاکٹر؟ اس کا انتظام تو ہے۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں کسی بھی ڈاکٹر کو بلایا جا سکتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کچھ مہمان چھوٹے بچوں کو ساتھ لائیں۔" ایمن نے کہا۔

"اُوہ، یہ سب تم نے کیسے سوچ لیا؟ میرا خیال ادھر نہیں گیا تھا۔" آزر نواب نے بالوں میں انگلیاں دھنساتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ہوٹل مینجمنٹ پر جو کتابیں منگوائی تھیں ان کا پارسل آ گیا تھا۔ آپ تعمیری کام میں مصروف تھے — مجھے جو وقت ملا اس میں میں نے تھوڑا سا پڑھ لیا ہے۔"

"ہوشیار لڑکی!" آزر نواب مسکرا کر بولے۔"تمھاری مستعدی کا یہی حال رہا تو ایک دن تم یہ سارے کا سارا ہوٹل مجھ سے ہتھیا لو گی۔"

آزر نواب کی معمولی سی تعریف بھی اسے کیوں بوکھلا دیتی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"حویلی کی نرسری جہاں آپ نے اپنا بچپن گزارا وہی . . . ."

"ہرگز نہیں" آزر نواب بے چین ہوکر بولے۔ ان کے اچانک بدلتے ہوئے موڈ ایمن کو حیران کر دیتے تھے۔

"وہاں کسی اور بچے کو پاؤں دھرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی" ایمن ان کے لہجے کی درشتگی سے دم بخود ہوکر رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آزر نواب کی انا اس حد تک طوفانی ہوگی۔ اسے آزر نواب کی شخصیت کا یہ پہلو بہت کمزور لگا۔

اس کے بعد آزر نواب نے گفتگو کا دھارا اسٹاف کوارٹرز کی طرف موڑ دیا، جو حویلی کے احاطے میں ہی بنے تھے۔ اس کے لیے مسٹر نکلسن نے بہت خوش نما اور موزوں نقشے دیے تھے۔ حویلی میں ردّوبدل کا کام تقریباً مکمل ہوچکا تھا۔ فرنیچر بن کر تیار تھا۔ جو شہر کے قدیم ترین فرنیچر مارٹ میں بنوایا گیا تھا۔ جو پیریڈ فرنیچر سپلائی کیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی باغ کی نئے سرے سے بندش کی جارہی تھی۔ صبح سے شام تک حویلی میں ایک ہنگامہ بپا رہتا۔ لیکن آزر نواب اس بات کی خاص احتیاط رکھتے کہ ہنگامہ کسی طرح بڑی سرکار کے لیے خلل کا باعث نہ ہو۔ یوں بھی رہائشی حصہ بجائے اتنا خود کفیل اور علاحدہ تھا کہ گیسٹ ہاؤس کی مصروفیات کا وہاں کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ زیادہ مشکل ایمن کو وقت کی کمی کے باعث ہورہی تھی۔ اپنی نئی ذمہ داریوں کے باوجود وہ ہرممکن کوشش کرتی کہ بڑی سرکار کے سونپے ہوئے فرائض میں کوتاہی نہ ہو۔

"حضور خاصہ چن دیا جاتے؟" —— نئے خانساماں نے اجازت لے کر لائبریری میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اُفوہ دس بج گئے" —— آزر نواب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "تم نے بھی تو کھانا نہیں کھایا ہوگا۔؟" انھوں نے ایمن سے پوچھا۔

"کچھ ضروری چیزوں کے بارے میں بات کرنی تھی —میں نے سوچا ٹھہر کر کھالوں گی ورنہ دن بھر آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ایمن نے کہا۔

"سنو" آزر نواب نے خانساماں سے کہا "کھانا ٹرالی پر لگا کر یہیں لے آؤ —— بی بی بھی یہیں کھائیں گی۔"

"میں —— مجھے اتنی بھوک نہیں ہے —— اپنے کمرے ہی میں جاکر کھالوں گی" ایمن

جلدی سے بولی - حالانکہ کھانے کے نام ہی سے اس کے پیٹ میں بھوک اچھلنے لگی تھی۔

"بھوک نہ ہونا اور اپنے کمرے میں کھانا، دو مختلف باتیں ہیں" آزر نواب بولے "کیا میں اسے تمھارا بہانہ سمجھوں کہ تم میرے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتیں؟" تب تک خانساماں حکم پاکر جا چکا تھا۔

"جب تک کھانا آتا ہے، کیوں نہ ایک دو معاملے اور طے کر لیے جائیں" آزر نواب بولے۔

"جی ــ میری ایک رائے اور بھی" آزر نواب کی شہ پاکر امین بولی۔

"کیا؟"

"وہ جو نقشی سرونٹ کوارٹرز کے پاس رکھی ہے" امین نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی اور آزر نواب دماغ پر زور دے کر سوچنے لگے۔

"اچھا۔۔۔ اچھا وہ جس پر ہمارا خاندانی طغرا لگا ہے۔ اسے ہمارے بزرگ استعمال کیا کرتے تھے ــــ وہ تو بہت پرانی ہو چکی ہے"

"جی نہیں ــ میں نے اسے کل ہی دیکھا ہے ــ وہ بالکل اچھی حالت میں ہے۔ ہلکی پھلکی درستگی کے بعد اسے بہت اچھی طرح چمکایا جا سکتا ہے"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" آزر نواب امین کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کل میں نے آزمائش کے لیے اس کے ایک حصے پر پالش لگائی تو اس کے پتیاں کے بیل بوٹے ایک دم نکھر آتے۔ یقین مانیے یہ بڑی خاص چیز رہے گی"

امین کا جوش دیکھ کر آزر نواب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ "میں سمجھ رہا ہوں تمھاری بات ــ تم اس لینڈو کو پھر زندہ کرنا چاہ رہی ہو"

"بے شک۔ خاص طور سے غیر ملکی مہمان اسے بہت پسند کریں گے۔ انھیں اس میں پرانے حیدر آباد کی سیر کرنا اچھا لگے گا"

"سر تسلیم خم ہے۔۔۔" آزر نواب نے سر جھکایا اور ہنس کر بولے۔ امین نے سوچا کہ جب بھی وہ ایسے کھل کر ہنستے تھے تو خاصے آدم زاد نظر آتے تھے۔

"کل منشی صاحب کے سپرد یہ کام کر دو" آزر نواب نے کہا۔

"منشی صاحب تو آج بیمار ہو گئے ہیں" امین بولی۔

"کل نہیں ہوں گے"۔ آزر نواب نے گویا یقین سے کہا "میں ان کی بیماری اچھی طرح جانتا ہوں — جب بھی انھیں انگریزی میں کچھ کام کرنا پڑتا ہے تو وہ بیمار ہو جاتے ہیں"۔

ایمن ہنس پڑی۔ "ہاں کچھ دنوں سے مصروفیت بڑھی تو میں ان کی مدد نہیں کر پا رہی ہوں"۔

"اسی لیے میں نے کل سے ایک انگریزی ٹائپسٹ کو مقرر کر دیا ہے" آزر نواب منشی صاحب کی کمزوری کو جانتے تھے، لیکن ان کی وفاداری اور عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔ اب منشی صاحب زیادہ تر گھریلو دھندوں اور نوکروں سے نپٹا کرتے تھے۔ لیکن خاندان کے پرانے ریکارڈ اور جایداد جاگیر کی تفصیلات انھیں ازبر تھیں۔ اب بھی وہ بڑی سرکار اور آزر نواب کو جھک کر تین سلام کیا کرتے تھے۔ تسنیم پاشا سے البتہ ان کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ اور بشارت نواب سے بھی وہ پریشان رہتے تھے، کیونکہ وہ انھیں لفاظی سے گھما پھرا کر اپنے چکر میں ڈال دیتے تھے کہ منشی صاحب حیران رہ جاتے تھے۔

خانساماں ٹرالی پر کھانا لگا کر لے آیا۔ اس کی خوشبو ہی سے ایمن کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بھوکی ہے۔

تیتر کا سالن آزر نواب کی من پسند ڈش تھی جو نیا خانساماں بہت اچھی طرح بناتا تھا۔ نئے تقرر کیے ہوئے خانساماں سب ہی مشاق تھے انھیں مغلئی اور کانٹی نینٹل کھانے پکانے میں مہارت حاصل تھی۔ آزر نواب دنیا گھوم چکے تھے اور ہر طرح کے کھانوں کی نفاست سے واقف تھے۔ کئی خانساماؤں میں سے صرف پانچ کو انھوں نے چنا تھا۔ اور یہ خانساماں ان ہی میں سے ایک تھا۔ انھیں کوارٹر دیے جا رہے تھے اور وہ ہوٹل کے شروع ہونے کے منتظر تھے۔

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے آزر نواب نے کہا "مس شہاب، مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو برخاست کیا جاتا ہے"۔

ایمن کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔ کیا آزر نواب کا مطلب واقعی وہی تھا جو وہ کہہ رہے تھے؟ ان کی سادیت پسندی سے وہ واقف تھی، لیکن مذاق کا یہ رنگ بالکل انوکھا تھا۔

"بات یہ ہے ایمن کہ سرکار کو اب تمھاری ضرورت نہیں رہی۔ نانا جان ان کی مدد کیا کریں گی"۔ آزر نواب نے وضاحت کی اور ایمن کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ہوٹل کا کام قریب الختم تھا۔ ہر بات تقریباً طے ہو چکی تھی۔ اب شاید آزر نواب چاہتے تھے کہ تجربہ کار منتظم ہاتھوں میں اس کا معاملہ سونپ دیں۔

اس نے اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ حویلی سے اسے کبھی جانا بھی پڑے گا ـــ وہ حویلی اس کے لیے گوشۂ عافیت تھی۔

اب اس نے چشم زدن میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اس مغرور اور خودسر نواب زادے کے آگے عاجزی ہرگز نہیں کرے گی ـــ وہ چھوڑ دے گی حویلی، چلی جائے گی کہیں ـــ لیکن جانے سے پہلے اپنے اس طرح نکالے جانے کی وجہ ضرور پوچھے گی۔

آزر نواب کافی ختم کرکے اپنا سگریٹ جلائے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"عالم پناہ کیا میں اپنے برخاست کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں یا ـــ مجھے اس کی بھی اجازت نہیں ہے؟" امین نے غیر معمولی تحمل کے ساتھ پوچھا۔

"کیوں نہیں" ـــ آزر نواب بڑی خوش اخلاقی سے بولے "وجہ یہ ہے کہ تم محض حویلی کی ایک جنرل اسسٹنٹ ہونے سے کہیں زیادہ قابل ہو۔ کل سے تمہیں اس ہوٹل کا سارا انتظام سونپا جارہا ہے۔ اور تنخواہ میں بھی اضافہ کیا جارہا ہے ـــ بشرطیکہ یہ منظور ہو"

امین ہکا بکا ان کی صورت تکتی رہی ـــ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ روئے یا ہنسے۔ تنخواہ سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جو کچھ ملتا تھا وہی اس کے لیے کافی سے زیادہ تھا ـــ وہ تو آزر نواب کا اس کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ اور اس سے زیادہ یہ یقین کہ اسے حویلی نہیں چھوڑنی تھی جو اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو آزر نواب دیکھیں۔

دو ہاتھوں نے اس کے سسکتے ہوئے شانوں کو تھام لیا۔ وہ اس کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ پہلے تو انھوں نے گھاؤ دیا تھا اور اب گھاؤ ٹٹول رہے تھے۔ اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور خود بھی کھڑی ہوگئی۔ آزر نواب اس کی لبریز آنکھوں میں جھانک کر مسکرا رہے تھے۔

"ایک سنہری آنکھوں والی لڑکی تھی . . . ." آزر نواب نے گویا کوئی کہانی شروع کی ـــ اور امین کو ان کی یہی بات مشتعل کرگئی۔ پھر ان کی مسکراہٹ نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔

وہ ان چند لمحوں میں کس عذاب سے گزری تھی۔ انھیں کیا معلوم۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں سے آزر نواب کے سینے کو پیٹ ڈالا اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ دوڑتی ہوئی لائبریری سے نکل گئی۔

آزر نواب خالی دروازے کو دیکھتے ہنستے رہے۔

بڑی سرکار نے گولکنڈے کے بارے میں لکھتے ہوئے کچھ سوال اٹھائے تھے کہ ابوالحسن تاناشاہ سے

شہنشاہ اورنگ زیب نے کیا اس لیے حیدرآباد کو چھینا تھا کہ بادشاہ سمیت قلعہ کو زبوں حال چھوڑ
یا جائے؟ اورنگ زیب نے فتح کے بعد حیدرآباد کا نام 'دارالجہاد' رکھ دیا تھا۔ کیا اورنگ زیب کی فتح
و واقعی فتح کہا جاسکتا ہے؟ ۔ دکن کی خاک نے جہاں وفادار جاں نثاروں کو جنم دیا وہیں غدّاروں
کے خار بھی اسی دھول سے اُگے تھے۔ حبشی پہرے دار قلعہ کی حفاظت میں سنگ آستاں کی طرح
سے ڈٹے رہے۔ حتّیٰ کہ ان کے سر دھڑ سے جدا کر دیے گئے۔ سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے جس کے
جسم پر دو انچ جگہ بھی زخموں سے خالی نہیں رہی تھی، دکن اور اپنے بادشاہ پر جان نثار کر دی ــــ
ان جیسے جاں بازوں اور وفاداروں کے درمیان شیخ منہاج اور عبداللہ خان جیسے ننگ آدم ننگ
دیں، ننگ وطن بھی پیدا ہوئے تھے، جنھوں نے قلعے کے دروازے کھول کر مغلوں کو اندر آنے
کی دعوت دی تھی۔ جس دروازے سے مغل قلعہ میں داخل ہوئے، اس کا نام کھڑکی تھا۔ ابوالحسن
تاناشاہ جب ان ہی سیڑھیوں سے پابہ زنجیر ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اتر رہا تھا تو اس
کے لبوں پر حافظ کا یہ شعر تھا۔

سرِ ارادتِ ما و آستانِ حضرت دوست
کہ ہرچہ بر سرِ ما می رود ارادۂ اوست

مغلوں نے گولکنڈے میں وہ تباہی مچائی کہ آصف جاہی حکمراں تک اسے پھر نہ سنوار سکے۔
گولکنڈے کے زوال کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ کارومنڈل ساحل پر یورپین اقوام نے سر
اٹھانا شروع کر دیا۔

بڑی سرکار نے یہاں تک لکھا تھا کہ شمشاد بدحواس دوڑی ہوئی آئی اور ان کی کرسی کے
پاس گھٹنے ٹیک کر اس نے کانا پھوسی کی۔ پتا نہیں کون سی بری خبر تھی کہ بڑی سرکار کے ہاتھ سے قلم گر پڑا
اور وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کیا بک رہی ہے" ـــ انھوں نے تیور بدل کر شمشاد سے کہا۔
"آپ کے صدقے . . . میرے آنکھاں پھٹو . . . سچی سرکار"۔

بڑی سرکار اپنی نرم آپا شاہی جوتی پہنے دوپٹا سنبھالتی، شمشاد کے ساتھ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئیں
تسنیم پاشا کے بیڈروم کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی بڑی سرکار اندر داخل ہوئیں، انھوں
نے کلیجا تھام لیا۔ تسنیم پاشا گہری نیند سو رہی تھیں اور پاس ہی نیند کی گولیوں کی شیشی پڑی تھی۔
بڑی سرکار نے ان کی نبض محسوس کی، جو بہت ہلکی چل رہی تھی۔ انھوں نے زندگی میں کبھی اتنی پھرتی

نہیں دکھائی ہوگی۔ وہ تیزی کی طرح اٹھیں اور جاکر فون پر فیملی ڈاکٹر فرگوسن سے فوراً پہنچنے کی تاکید کی۔
"خبردار جو تم تینوں کے سوا کسی اور کو یہ بات معلوم ہوئی" انھوں نے شمشاد سے کہا
"آزر نواب کہاں ہیں ؟"
"انوں، امین بی بی کے ساتھ ہوٹل کے پردے خریدنے کو گئیں سرکار" شمشاد بولی۔
"اور شاہانہ صاحبزادی ؟" انھوں نے پوچھا۔
"انو میجر صاحب کے ساتھ باہر گئے تھے ٹینس کھیلنے کو۔"
"ہوں" بڑی سرکار بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگیں۔ انھیں یقین تھا کہ تسنیم پاشا نے نیند کی گولیاں کھاکر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ تسنیم پاشا کا سرخ و سفید ہاتھ جس میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی مسہری پر سے لٹک کر قالین پر آ ٹکا تھا۔ منہ ہلکا سا کھلا ہوا جس میں موتی جیسے دانت چمک رہے تھے۔ کٹے ہوئے بالوں کی لٹ ماتھے اور چہرے پر بکھری ہوئی ——— وہ اس عمر میں بھی بہت خوب صورت تھیں۔ صرف پسینا بھرے ماتھے اور آنکھوں کے کنارے جھریاں ان کی زندگی کی کچھ منزلوں کا پتا دیتی تھیں۔

بڑی سرکار کولون میں ڈوبے رومال سے ان کا پسینا پونچھ رہی تھیں کہ ڈاکٹر فرگوسن بڑی تیزی سے داخل ہوئے۔ انھوں نے پل بھر میں ہی صورت حال کا جائزہ لے لیا۔

شمشاد کو فوراً گرم کافی تیار کرنے کا حکم دیا۔ فاسد مواد پیٹ سے خالی کرنا ضروری تھا ——— انھوں نے تسنیم پاشا کی ستواں ناک سے ٹیوب اندر داخل کی اور انجکشن تیار کرنے لگے۔ فضا بہت بوجھل تھی۔ لیکن ڈاکٹر فرگوسن کے منجھے ہوئے ہاتھوں نے مریض کو جلد ہی سنبھال لیا۔ کافی پلادی گئی۔

ڈاکٹر فرگوسن نے کافی پی اور سرکار کو اطمینان دلایا کہ "اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔ یہ گولیاں چھوڑے جارہا ہوں۔ تین تین گھنٹے بعد دیتی رہیے گا۔ مریض کی کیفیت فون پر بتا دیجیے گا۔
بڑی سرکار نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور شمشاد ان کے پیچھے ان کا بیگ لیے انھیں چھوڑنے گئی۔

تسنیم پاشا کو ہوش آگیا تھا، لیکن اب بھی وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑی تھیں۔ بڑی سرکار کرسی پر تسنیم پاشا کی مسہری کے برابر بیٹھی تھیں تسنیم پاشا کی بند آنکھوں سے ہی دو بوندیں گر کر تکیے میں جذب ہوگئیں۔ بڑی سرکار نے ان کے ماتھے پر اپنا معطر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ کچھ دنوں سے تسنیم پاشا کا ذہنی اضطراب دیکھ رہی تھیں لیکن انھیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ یوں ٹوٹ جائے گی۔ تسنیم پاشا جس راستے پر گامزن تھیں اس پر روک لگانا بڑی سرکار کے بس میں نہیں تھا۔

"آپا بیگم، مجھے مرجانے دیا ہوتا" تسنیم پاشا کی نحیف آواز آئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو تسنیم پاشا!" بڑی سرکار ان کا سر سہلاتے ہوئے بولیں — اب تم چپ چاپ لیٹی رہو۔"

"نہیں آپا بیگم، مجھے کہنے دیجیے۔ ورنہ میرا کلیجا پھٹ جائے گا" وہ بولیں۔

"تمھیں مجھ پر بھروسا ہوتا تو تم یہ بے وقوفی کرنے سے پہلے ہی مجھ سے کہتیں" بڑی سرکار بولیں۔

"کیا میں دلھن اماں سے کیا ہوا وعدہ بھول گئی تھی"

"نہیں تسنیم پاشا ان کا ہاتھ تھام کر بولیں" آپ نے ہمیشہ مجھے ماں کی طرح چاہا ہے، لیکن میں بہت بہک گئی تھی"

"میں سمجھی نہیں" سرکار بولیں۔

"مجھے پتا نہیں تھا کہ مختار نواب اتنے کمینے نکلیں گے" تسنیم پاشا آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو نحیف ہاتھ سے پونچھتی ہوئی بولیں" وہ مجھے شاہانہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا رہے تھے"

"ہوش میں آؤ تسنیم پاشا — شاہانہ ان کی لڑکی کے برابر ہے"

"اور میں سمجھتی رہی کہ وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں"

بڑی سرکار پہلے ہی تسنیم پاشا کی خوش فہمی کو سمجھ چکی تھیں، موقع کا لحاظ کر کے چپ رہیں۔

"کل پارٹی میں شاہانہ نے انھیں تھپڑ مار کر ان کی رہی سہی امید دل پر پانی پھیر دیا۔ انھوں نے آزر نواب کے بارے میں ایسی ویسی بات کی تھی۔ اور جب میں نے اکیلے میں لے جا کر انھیں بہلانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی بپھر گئے اور مجھے بوڑھی جادوگرنی کہا" — تسنیم پاشا بے اختیار رو پڑیں۔

"مجھے بوڑھی جادوگرنی کہا — انھوں نے کہا ان کی دولت دیکھ کر میں ان پر ڈورے ڈال رہی ہوں"

بڑی سرکار ترحم سے تسنیم پاشا کو دیکھتی رہیں۔

"تم نے مختار نواب کو شروع ہی سے غلط سمجھا تھا تسنیم پاشا وہ اس قابل نہیں تھے کہ تم انھیں منہ لگاتیں" بڑی سرکار نے کہا۔

"میں تنہا تھی آپا بیگم — میں اپنے خاموش اور تنہا بڑھاپے سے ڈری ہوئی تھی۔ جب وہ مرے ہیں تب شاہانہ اور بشارت نواب چھوٹے سے تھے۔ میں ابھی جوان تھی"

"ہم نے تو کوشش کی تھی کہ تمھارا دوبارہ نکاح کرادیں"" بڑی سرکار نے ان کی بات کاٹ کر کہا،" لیکن تم نے پی فیل مچائے اور کسی طرح راضی نہ ہوئیں۔ فاروق نواب نے بھی تو تمھیں بہت سمجھایا تھا۔ محتشم بہت اچھے آدمی تھے۔"

"محتشم نواب نہیں تھے، نوکری پیشہ تھے۔ مجھے اس میں اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی"۔ تسنیم پاشا بولیں۔" آپ نے مجھے مجبور کیا ہوتا آپا بیگم ۔۔۔ آپ ایسا کرسکتی تھیں"۔ تسنیم پاشا نے بڑی سرکار سے شکایتاً کہا۔

"میں نے کبھی تمھاری دل شکنی نہیں ہونے دی۔ تم خود سمجھدار تھیں۔ میں نے اور فاروق نواب نے پھر بھی تمھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی"۔ بڑی سرکار نے کہا۔

تسنیم پاشا نے ٹھنڈی سانس بھری" بے چارے بھائی جان بھی کیا کرتے، غلطی میری ہی تھی"۔

"تسنیم پاشا، زندگی میں انسان جہاں بہت کچھ پاتا ہے، وہاں کچھ کھوتا بھی ہے"۔ بڑی سرکار نے انھیں بچوں کی طرح سمجھایا۔" تم نے جو کچھ کھویا اس کا تو حساب رکھا، کبھی یہ بھی سوچا کہ زندگی میں پایا کیا کچھ؟"

"نہیں آپا بیگم ۔۔۔ مجھے تسلی دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ کاش مجھ میں آپ جتنی ہمت ہوتی"۔ بڑی سرکار نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب ہلکان نہ ہو ۔۔۔ آرام کرنے کی کوشش کرو"۔ انھوں نے کہا۔

"شاہانہ کہاں ہیں؟" ۔۔۔ تسنیم پاشا نے پوچھا۔

"میمر تنویر کے ساتھ ٹینس کھیلنے گئی ہے"۔

"ابھی تک نہیں لوٹی؟" تسنیم پاشا نے کہا" اب اس کی شادی جلدی ہو جانی چاہیے آپا بیگم"۔

"تم اس کی فکر نہ کرو"۔ بڑی سرکار نے کہا" آزر نواب کوئی بچّہ نہیں ہیں۔ آج کل وہ بہت مصروف ہیں"۔ پھر شمشاد کو وہاں بیٹھنے کی ہدایت کرکے وہ اپنی کمرے میں چلی آئیں۔

اپنے رہائشی کمرے کی بڑی سرکار کو برسوں سے عادت تھی اسے بدلتے ہوئے انھیں کچھ بے چینی ضرور ہوئی تھی، لیکن آزر نواب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ بڑی سرکار کے فرنیچر اور اس کی آراستگی میں کوئی فرق نہ آئے اب واقعی وہ وہاں مطمئن تھیں۔ برآمدے میں جہاں ان کی نماز کی چوکی رکھی رہتی تھی، سن کیسر کی خوش بودار بیلیں لیے ہوئے بھینی بھینی ہوا انھیں پسند

آئی تھی۔

اپنی نئی ذمہ داری کے باوجود، ایمن نے بڑی سرکار سے پہلے جیسا ہی ربط برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی ۔ وہ بھی اس کی منتظر رہا کرتی تھیں ۔ وہ جب بھی جاتی تو اپنے لکھے ہوئے صفحات اسے دکھاتیں شاہانہ صاحبزادی، سچ پوچھو تو ایمن کا بدل نہیں تھیں، کیونکہ وہ اردو املا کی بہت غلطیاں کرتی تھیں، اور تھوڑا بہت لکھنے کے بعد ہی بڑی سرکار کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ جماہیاں روکنے کی بہت کوشش کر رہی ہیں ۔ سرکار ان کا موڈ بھانپ کر خود ہی انھیں جانے کے لیے کہہ دیتیں ۔ وہ ایمن کو بھی خود کم ہی بلاتیں، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ فی الحال وہ آذر نواب کا دست راست بنی ہوئی ہے ۔

اسٹاف کو ٹریننگ دے کر تیار ہو گئے تھے ۔ ان میں سے ایک میں ایمن نے رہنا شروع کر دیا تھا، ہوٹل سے نگراں ہونے کے باعث کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی ۔ آذر نواب نے دو منیجروں کا تقرر کیا تھا، جو اونچے درجے کے ہوٹلوں کا کئی کئی سال کا تجربہ رکھتے تھے لیکن آخری ذمہ داری ایمن ہی کی تھی۔

بہت بحث و مباحثے کے بعد ہوٹل کا نام "عالم پناہ" رکھا گیا اور ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کو ایک نجی گیسٹ ہاؤس کے زمرے میں اس کا نام بھجوا دیا گیا ۔ یہاں مہمانوں کے حقوق داخلہ محفوظ تھے بروشیو کی رنگین تصویروں میں ہر کمرہ اچھوتا اور اونچے ذوق کی عکاسی کرتا تھا۔ حیدرآباد میں ہوٹلوں کا رواج عام نہیں تھا ۔ اونچے درجے کے ہوٹلوں کی بہت کمی تھی ۔ حویلیوں اور کوٹھیوں میں پر تکلف مہمان نوازی کو عروج پر پہنچا دیا جاتا تھا ۔ ایک طرح سے ہوٹل بازی معیوب تھی لیکن زمانے کی بدلتی ہوا ہر عیب کو ہنر بنا رہی تھی ۔ ایسے میں 'عالم پناہ' نے بہت جلد اپنا مقام پا لیا۔

ہوٹل کے بننے سے منشی صاحب کچھ خوش نہیں تھے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ حویلی کی بے حرمتی تھی ۔ لیکن آذر نواب نے بھی یہ قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا ۔ وہ ایک زندہ سماج کے قائل تھے۔ حویلی نے وہ دن دیکھے تھے جب اس کا دبدبہ اور رونق بے مثال تھی ۔ لیکن نہ اب وہ لوگ رہے تھے جو اسے اس پیمانے پر آباد رکھتے، نہ وہ ماحول تھا، نہ وہ محفلیں تھیں ۔ ساز کے سریلے سر ختم ہو چکے تھے، اب بس ایک جھنکار باقی تھی جو زندگی کی نشانی تھی، اسی پر رقص کرنا تھا۔ جنھوں نے وقت کے ساز کے بدلتے ہوئے سُر نہیں پہچانے تھک کر بیٹھ رہے ۔

آذر نواب نے اپنے کورٹ آف وارڈز کے سارے ساتھیوں کی ایک میٹنگ بلائی تھی، جس میں بدلتے ہوئے حالات پر تبصرہ ہوا تھا ۔ انھوں نے صاف صاف بتایا تھا کہ وہ دن دور

نہیں جب جایدادیں جاگیریں ضبط ہو جائیں گی ۔ جہاں پھول بکتے تھے وہاں دھول بیچنے کی نوبت آجائے گی ۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ سب جاگیردار، نواب اپنا پیسا پھونکنے کی بجائے اسے بہتر دھندوں میں لگائیں، جس سے ملک اور قوم کا بھی بھلا ہو اور وہ خود بھی مالی طور پہ کمزور نہ ہونے پائیں۔ لیکن صدیوں کے ممنور دماغوں میں یہ بات کہاں سماتی ۔ سن تو سب نے لیا، لیکن بہت کم تھے جو آزر نواب کی باتوں پر چونکے ۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے صرف اس بات کو اہمیت دی کہ میٹنگ کے بعد ڈنر میں مرغی اتنی گلی نہیں تھی ۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاں آج بھی قبر سے ہوا کرتے تھے ۔ بیس بیس پچیس پچیس ہزار کی انگوٹھیاں کوڑیوں کے مول ساہوکاروں کے پاس گروی رکھی جاتی تھیں، چھٹی کی رسمیں ہوتی تھیں مشاعرے اور قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں

قوالی کی ایک محفل میں ایمن کو بھی جانے کا اتفاق ہوا۔

بڑی سرکار کے رشتے کے بھائی نواب ذوالفقار علی خاں تھے ۔ آزر نواب ہی کی طرح انھوں نے سمجھ بوجھ سے کام لیا تھا ۔ ان کے یہاں ناچ رنگ کی کوئی محفل نہیں ہوتی تھی ۔ البتہ بڑے مہذب مشاعرے ضرور ہوتے تھے ۔ نواب صاحب خود بھی فارسی میں تصوف کی شاعری کیا کرتے تھے ۔ اور جب بھی ان کے ہندستانی مرشد (شمالی ہند سے تعلق رکھنے والا ہر شخص حیدرآبادیوں کے لیے 'ہندستانی' ہوتا تھا) ان کے پاس آتے تھے قوالی کی محفل ضرور منعقد کی جاتی تھی ۔ اس زمانے میں اکرام الدین قوال کا بہت چرچا تھا جو امجد حیدرآبادی کا صوفیانہ کلام پیش کرنے میں اپنا جواب آپ تھے۔

بہرحال ہوٹل کے کام میں ایمن کو زیادہ مصروف رہنا نہیں پڑا کیونکہ دونوں مینجر بڑی مستعدی سے کام کرتے تھے ۔ ایمن اب بڑی سرکار کو کچھ زیادہ وقت دے سکتی تھی ۔ اس روز جب بڑی سرکار نے اسے بھی قوالی کی محفل میں چلنے کی دعوت دی تو وہ خوشی سے تیار ہو گئی ۔ آزر نواب چار دن سے ڈانڈیلی گئے ہوئے تھے ۔ تسنیم پاشا کا بھی دعوت نامہ آیا تھا لیکن انھوں نے معذرت کر دی۔ چنانچہ بڑی سرکار ایمن اور شمشاد کو لیے نواب ذوالفقار علی خاں کے یہاں پہنچیں ۔ بڑی سرکار جہاں بھی جانا ہوتا، شمشاد آپا کا دو سیر وزنی چاندی کا پاندان اور خاصدان اور تولیا لیے ان کے ساتھ ہی جاتی تھی کیونکہ سرکار اپنے ہی پاندان کا پان کھایا کرتی تھیں ۔ وہاں رواج ہی ایسا تھا جب لڑکے لڑکی کا رشتہ کیا جاتا تو خاندان، اور 'پاندان' کی بات ضرور پرکھی جاتی ۔ کسی کی

حیثیت کا اندازہ پاندان سے بھی لگایا جاتا تھا۔ گو مہمان خواتین کو بہت ہی نفیس پاندان پان کھانے کے لیے پیش کیے جاتے، لیکن کچھ بیبیاں اپنے ہی پاندان سے گلوری کھایا کرتیں۔
ہال روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مکمل چاندنیوں کا فرش تھا، جس پر جگہ جگہ مسندیں اور بیش قیمت قالین، رنگا و تکیے لگے تھے۔ کمان دار وسیع دروازوں پر جو زنانہ برآمدے میں کھلتے تھے چلمنیں ڈال کر خواتین کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی قیمتی کارچوبی زرکار مسند درمیان میں بچھائی گئی تھی۔ یہ پیر و مرشد کے لیے تھی۔
"ایو سرکار ___ تھوڑے ہندستانی عورتاں بھی آئیں شاید" شمشاد نے چند غرارہ پہنی بیبیوں کی طرف دیکھ کر دبی زبان سے کہا۔
"ہاں" بڑی سرکار نے کہا "نواب بھائی کے صاحب زادے کی شادی لکھنؤ میں ہوئی ہے"
ایمن نے زمردی رنگ کی سادی شیفان کی ساری پہنی تھی اور کانوں میں سبز آویزے۔ وہ آویزے قیمتی تھے اور اس کی ماں کی نشانی تھے۔ ایک آویزہ ڈھیلا ہو گیا تھا وہ کان سے پھسل جاتا تھا۔ ایمن نے اسے کئی بار ٹھیک کروانا چاہا لیکن پھر اس خیال سے اندر رکھ چھوڑا کہ اسے پہننا ہی کتنا ہوتا تھا۔ آج اس نے انھیں پہن لیا کیونکہ سبز ساری کے ساتھ وہ آویزے اور ان میں چمکتا منا سا ہیرا بہت بھلا لگتا تھا۔ اس سادگی میں ہی اس کا حسن نکھر آیا تھا۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں سبز لباس کی وجہ سے سبز گوں ہو رہی تھیں اور گھنے بالوں کی ڈھیلی گوندھی ہوئی کمر سے نیچے جھولتی چوٹی اور گلے میں بڑی سرکار کا دیا ہوا لاکٹ اسے اور بھی جاذب نظر بنا رہے تھے۔ کئی نظریں اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔
خواتین کے اترنے کا انتظام الگ تھا۔ ایمن بھی بڑی سرکار کے ساتھ چلمن سے لگ کر بیٹھ گئی۔ حیدرآباد کی اس طرح کی محفل میں جانے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہر محفل کے آداب جدا تھے ___ قوالی کی محفل میں چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ تصوف کا رنگ جمتا ہے۔ اس لیے خواتین باوضو اور باسر دلوں کو ڈھانکے ہوئے تھیں ___ مردانے میں سبھی نے شیروانیاں اور ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ اکا دکا جنھوں نے سوٹ پہنا تھا انھوں نے رومالوں سے اپنے سر ڈھانپے ہوئے تھے۔ چند وضع دار لوگوں نے اپنی روش نہ چھوڑتے ہوئے پھندنے دار رومی (ترکی) ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں، ورنہ یہ ٹوپیاں بڑی تیزی

سے حیدرآباد میں عنقا ہوتی جارہی تھیں ۔ قوال باادب اپنی مسند پر تیار بیٹھے تھے ۔ مرشد کا انتظار تھا ۔ بالکل مدھم لہجے میں بات چیت ہو رہی تھی ۔

مرشد سفید داڑھی والے ثقہ بزرگ تھے ۔ جیسے ہی وہ نواب صاحب کے ساتھ داخل ہوئے، ہال میں خاموشی چھا گئی ۔ سب ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔

مرشد نے ایک نظر اپنے لیے بچھائی مسند پر ڈالی. آہستہ سے نواب صاحب سے کچھ کہا ۔ نواب صاحب نے بہ نفس نفیس بڑھ کر وہ کارچوبی زرکار مسند اٹھادی ۔ تب مرشد وہاں بیٹھے ۔ نواب صاحب نے ان کے پیچھے آرام دہ تکیہ لگا دیا ۔

قوالوں نے مودبانہ طور پر مرشد سے اجازت لی اور پروگرام شروع کیا:

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے

وہ جب بھی آتا ہے تو میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

حضرت امجد حیدرآبادی کی اس رباعی کے ساتھ ہی سماں بندھ گیا ۔ لوگ اٹھ اٹھ کر قوال کو روپے دینے لگے دستور کے مطابق یہ روپے احتراماً دونوں ہاتھوں سے مرشد کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے ۔ وہ برکت کے لیے انھیں چھو لیتے تھے پھر یہ روپے قوال کو مل جاتے تھے ۔

اچانک ایمن کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی اور وہ ادھر دیکھتی ہی رہ گئی ۔

آذر نواب داخل ہوتے تھے ۔ اس نے انھیں اس ٹھیٹھ حیدرآبادی روپ میں پہلی بار دیکھا تھا ۔ سیاہ اچکن، چوڑی موری والا پاجامہ اور سر پر مخملی ٹوپی ۔ یہ لباس ان پر بہت بیچ رہا تھا ۔ وہ محفل میں موجود ہر شخص سے زیادہ ہینڈسم تھے ۔ نواب ذوالفقار علی خاں کے صاحب زادے انھیں آگے بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے ۔ لیکن آذر نواب دیر سے پہنچے تھے اس لیے انھوں نے پیچھے ہی بیٹھ جانا مناسب سمجھا ۔ وہ شاید شام کی گاڑی سے ڈانڈیلی سے لوٹ آتے تھے ۔

"ایمن بی بی!" شاید بڑی سرکار کچھ کہہ رہی تھیں، لیکن اس نے سنا ہی نہیں ۔

"ایمن بی بی!" اس بار بڑی سرکار نے قدرے بلند آواز سے کہا ۔ اور ایمن چونک پڑی ۔

"جی" اس نے کہا ۔ بڑی سرکار اپنی غلافی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں ۔ ایمن

کا چہرہ گلابی ہوگیا ـــ کہیں سرکار نے اسے تاڑ تو نہیں لیا؟ وہ سٹپٹائی اور اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نکھر آئیں۔ سرکار کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ تھی ۔ انھوں نے بھی آذر نواب کو داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

"یہ روپے چلمن سے ہاتھ بڑھا کر اس سامنے بیٹھے بچے کو دو اور کہو کہ قوّال کو دے دے۔"

چند بچے چلمنوں کے قریب اسی مقصد سے بٹھائے گئے تھے ۔ وہ قوّال تک بخشش پہنچانے کو ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں تھے۔

کافی دیر تک محفلِ سماع گرم رہی۔ سامعین تصوف کے ایک ایک شعر پر سر دھنتے رہے۔ جب تک ان کی یہ کیفیت رہی قوّال وہی مصرع دہراتے جاتے جیسے سن کر ان کو حال آیا تھا ـ یہ بھی روایت سنی گئی کہ ایسے میں قوّالی اچانک روک دی جائے یا مصرع بدل دیا جائے تو حال آنے والے کی موت ہو جاتی ہے۔

"حال" وجد کی انتہائی کیفیت ہوتی ہے جو بعید از قیاس نہیں، اعلیٰ درجے کا کلام انسان کی روح کو چھو جاتا ہے۔ عشق نیازی میں جب صد دامن چاک ہو جاتے ہیں تو عشقِ حقیقی بے شک اس سے افضل چیز ہوتی ہے ملامتِ خلق کے وصف منسوب ہیں کیوں رقص کرتے ہیں۔

"حضور چھوٹے سرکار بول رہیں۔ آپ جب گئے تو آنو بی ساتھ چلنے گئے۔"

یہ گویا آذر نواب کا بڑی سرکار کو اشارہ تھا کہ انھیں بہت دیر تک نہیں جاگنا چاہیے۔

"ان سے کہو ہم چلنے کو تیار ہیں۔" سرکار نے کہا۔

پیغام آذر نواب تک پہنچا دیا گیا ـــ اور جیسے ہی انھیں محفل سے کھسکتے دیکھا، سرکار اور ان کے ساتھ ایمن بھی چلی آئی ۔

زنان خانے کے گیٹ سے نکل کر جب کار مردانے میں پہنچی تو وہاں آذر نواب منتظر تھے ۔ شوفر نے فوراً اتر کر دروازہ کھولا اور وہ بیٹھ گئے۔

"سرکار، آپ شاید اور بیٹھنا چاہ رہی تھیں لیکن آپ کا اتنا جاگنا مناسب نہیں ہے۔" آذر نواب بولے۔

"نہیں ہم خود تمھارے اٹھنے کے منتظر تھے ۔ ہم نے تمھیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا ـ یہ محفل تو صبح تک چلے گی۔" بڑی سرکار نے کہا۔ "ڈانڈیلی میں سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں ـــ! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ بشارت نواب کام پر حاوی ہو گئے ہیں ۔ وہ فیکٹری کے کاموں میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔"

اس خبر نے ایمن کو خوش کر دیا۔

"تم نے کافی دن لگا دیے ڈانڈیلی میں!" بڑی سرکار نے کہا۔

"نہیں تو سرکار ـــــ میں وہاں صرف دو دن رہا، پھر بنگلور چلا گیا تھا"
"تو تم بنگلور سے واپس آرہے ہو؟" ـ سرکار نے پوچھا۔
"جی ہاں، ابھی شام کے پلین سے پہنچا ہوں" آزر نواب بولے
بنگلور کے نام پر ایمن چونکی ــ پرانی یادوں کا دریا سا امڈا اور اس کا دامن تر ہو گیا۔
حویلی پہنچ کر جب بڑی سرکار سونے کو آمادہ ہو گئیں، تو ایمن بھی اٹھی۔
"چلو، میں تمھیں چھوڑ دوں" ـــ آزر نواب بھی اٹھتے ہوئے بولے۔
"میں خود چلی جاؤں گی" ـــ ایمن نے کہا "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں"۔
لیکن آزر نواب نے گویا سنا ہی نہیں اور سیڑھیوں سے اتر کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔
"کوارٹر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" ـــ انھوں نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔
"جی نہیں" ایمن نے مختصر سا جواب دیا۔ ہوٹل کا کام سونپے جانے کے بعد اس کی ملاقات آزر نواب سے بہت کم ہوتی تھی وہ چند لمحے جو دوستانہ فضا میں گزرے تھے، اب خواب ہو گئے تھے۔
کوارٹر کے سامنے پہنچ کر وہ رکے ـ چٹکی ہوئی چاندنی میں وہ صاف ستھرا خوب صورت چھوٹا سا کوارٹر جس کے دامن میں ڈھیر سارے رنگ برنگے پھول تھے ـ نکھرے ہوتے شبنم کے قطرے کی طرح لگ رہا تھا۔ ایمن گیٹ کے پاس ہی رک گئی ـــ وہ آزر نواب کے جانے کا انتظار کرنے لگی ـ اس وقت اس کے سارے احساسات بس ایک ہی نکتے پر مرکوز تھے ـــــ آزر نواب ـ ایسا اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ اسے خطرناک ـــ بہت ہی خطرناک انسان لگتے تھے ـ ان کی مردانہ کشش انھیں اور بھی خطرناک بناتی تھی ـ اپنے کئی بار کے مصمم ارادے کے باوجود وہ ان کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔
وہ جانتی تھی کہ آگے خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کا علاج اس کے پاس کوئی نہیں تھا حویلی نے اسے اپنا لیا تھا کہ وہ اس کے باہر اپنی زندگی کا تصور ہی نہیں کرتی تھی،
وہ نہیں چاہتی تھی کہ آزر نواب اسے اس طرح دیکھیں کہ اس کا رواں رواں ان کے مزید قرب کے لیے چلا اٹھے ـ اور شاید آزر نواب اس کے اس راز سے واقف ہو چکے تھے ـ وہ اس کے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کا اپنے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ لیے لطف اٹھایا کرتے تھے۔
"آج کی تہذیب یافتہ دنیا میں مہمان کو کم از کم کافی کے لیے ضرور پوچھا جاتا ہے" ـــــ

آزر نواب نے ہاتھ سے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

" دودھ ۔۔۔ دودھ نہیں ہے "۔ لیکن ایمن شاید یہ بہت جلد بول گئی ۔ کیونکہ آزر نواب اپنی مسکراہٹ روکنے کو ہونٹ بھینچ لیے۔

" چلیے، یہ اور بھی اچھا ہوا ، ورنہ خواہ مخواہ وقت برباد ہوتا "

" جی ہاں " ۔ ایمن بولی ۔ بڑی آسانی سے جان چھوٹی تھی ۔ " آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ جاکر سورہیے ۔ بہت بہت شکریہ ۔ ساتھ آنے کا "

" جی نہیں آزر نواب ڈھٹائی سے بولے " میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں ۔ نہ مجھے نیند آرہی ہے ۔ وقت کی بربادی کا خیال یوں تھا کہ میں جھیل اور وہاں کا انتظام دیکھنا چاہتا ہوں ۔ مہربانی کرکے ساتھ چلیے "

" اب ، اس وقت ؟؟ " ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

" کیوں نہیں " آزر نواب نے کہا " میں وہ جگہ خاص طور پر چاندنی ہی میں دیکھنا چاہتا ہوں ۔ بھولیے نہیں کہ اس جگہ کو سنوارنے میں کافی پیسا لگا ہے "

انھیں کاروباری ہوتا دیکھ کر ایمن بھی چوکس ہوگئی ۔ چاندنی رات میں جھیل پر ناؤ کی سیر کا آئیڈیا اسی کا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ انھیں سچ مچ دکھا دے کہ ان کے پیسے کا غلط استعمال نہیں ہوا ہے ۔ وہ جگہ اتنی اب مقبولِ عام ہوگئی تھی کہ لوگوں کو اپنی پارٹیوں کے لیے اسے کئی دن پہلے بک کروانا پڑتا تھا۔ یقیناً آزر نواب اس حقیقت سے واقف ہوں گے ، کیونکہ وہ پابندی سے ہوٹل کے اکاؤنٹس کی چیکنگ کرتے تھے جو اکاؤنٹنٹ وقتاً فوقتاً ان کے آگے پیش کرتا رہتا تھا۔

خاموش پیڑوں کے درمیان گزرتے ہوئے وہ گھوم کر جھیل کی طرف چلے۔ فضا میں رات رانی کی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ ایمن بچپن ہی سے اس مہک کی دیوانی تھی اس کے سرھانے دریچے کے باہر رات رانی کی جھاڑی تھی ۔ ایک بار پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ جھاڑی سوکھنے لگی ۔ تب اس کے ابا نے کیا کیا جتن کیے تھے کہ وہ سوکھنے نہ پائے ، اور وہ پھر سے ہری ہوگئی تھی ۔

" تم نے بتایا نہیں کہ تمھارے والد اپنے کام میں کتنے ماہر تھے ! " آزر نواب بولے اور ایمن کو ایسا لگا جیسے وہ بہت دیر سے آزر نواب سے اپنے ابا کی باتیں کر رہی تھی ۔ یہ حقیقت تھی کہ آزر نواب کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے اپنے ابا کو ضرور یاد کیا تھا ۔ لیکن ان کا کوئی تعارف آزر نواب سے نہیں ہوا تھا۔

"بنگلور میں چیف آرکیٹکٹ نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تھا ــ ان کا نام شہاب احمد تھانا؟" ــ آزر نواب بولے۔

"لیکن آپ ــــ کو کیسے پتا چلا کہ وہ میرے والد تھے؟" ایمن نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔

"شاید بڑی سرکار نے کہا ہو گا؟"

"نہیں" ــ آزر نواب نے کہا "زمانے کی ناانصافیوں کا ذکر ہو رہا تھا تو چیف نے تمھارے ابا کا ذکر کیا کہ بہت اونچے درجے کے ہنرمند ہونے کے باوجود وہ ڈرافٹس مین ہی رہے۔ اور پھر انھوں نے تمھارا ذکر کیا کہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جس پر وہ جان چھڑکتے تھے ــ چیف کو تمھارا نام ایمن بہت پسند تھا۔" آزر نواب رک کر پھر بولے۔ "انھوں نے کچھ اور بھی کہا تھا۔"

"کیا؟" ــ ایمن نے خواہ مخواہ ڈر کر پوچھا۔ "انھوں نے کہا کہ وہ بھی بہت ہی بھولی بھالی شکل کی اور پیاری تھی ــــ میں نے ان سے کہا . . ." اور آزر نواب رک گئے۔

"کیا کہا آپ نے؟" ــــ ایمن نے دم بخود ہو کر پوچھا۔

"میں نے ان سے کہا کہ شاید آپ نے اسے اب نہیں دیکھا۔" آزر نواب نے انوکھے معنی خیز انداز میں دھیرے سے کہا اور ایمن ٹھوکر کھاتی کھاتی بچی۔ آزر نواب نے اس کا بازو تھام لیا اور تھامے ہی رہے۔ ان کے اس عمل نے اور بھی اس کے پیر اکھیڑ دیے۔ وہ مزید گہرائیوں میں گرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ انجام اسے بے بس کر دے، وہ خود حالات کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اس نے دھیرے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ لیکن اس کے خیالات کا تار ماضی سے مل گیا تھا۔ جو اس کا اثاثہ تھا ــ اسے کبھی موقع ملتا ہی نہیں تھا کہ کسی کو اپنی ماضی کی یادوں کا حصہ دار بنا سکے ــ وہاں تھا ہی کون ــــ بڑی سرکار کے ساتھ وہ اتنا نکھر نہیں سکتی تھی ــــ وقار جنگ کی باتوں میں وہ اتنی محو ہو جاتی تھی کہ اس کے اپنے ذاتی مسائل کی گٹھری بندھی کی بندھی رہ جاتی تھی۔ آزر نواب تو آزر نواب ہی تھے۔ آج انھوں نے خود ہی اس کے ابا کا ذکر چھیڑا تو وہ خود کو روک نہ سکی۔

"ابا نے قسمت کا گلہ کبھی نہیں کیا ــ دراصل ممی کی موت نے ان سے آگے بڑھنے کی سب خواہشیں چھین لی تھیں۔" وہ گزری ہوئی یادوں تلے دب کر بولی ــ ان یادوں کا ایک ریلا سا آیا جو اسے بہا لے گیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے گویا اپنے آپ سے کہا "ممی کے لیے انھوں نے آرام و آسایش اور دولت خوشی سے چھوڑ دی تھی۔ اور جب ممی نہ رہیں تو میں جانتی ہوں، وہ میری خاطر ہی جیتے تھے۔ میری خاطر ہی جیتے تھے" اس کی آواز بھر آگئی۔ اس بار اس نے اپنے کندھے پر سے آزر نواب کے ہاتھ کو ہٹانے

کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان کا یہ عمل اسے دلاسا دے گیا۔

"قسمت نے ان سے بڑے بڑے امتحان لیے۔ لیکن وہ سب کچھ ہنستے کھیلتے جھیل گئے۔ مگر وہ ممی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ۔۔ نہیں رہ سکتے تھے میں جانتی ہوں"۔۔ اس کے رندھے گلے سے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔

آزر نواب اس کے ساتھ وہیں جٹی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا اجلا سفید رومال اسے تھما دیا۔ وہ غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ کھوئی ہوئی سی اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارے ہوئے بچپن کے لمحوں کا ذکر کر رہی تھی۔

پتا نہیں ماحول کا اثر تھا یا ایمن کے تھکے ہوئے ذہن کی کارستانی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کھوئے ہوئے ماں باپ اور ان کی شفقت کی یاد نے اس کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھڑا دیا تھا ۔۔ وہ آزر نواب کے سنگلاخ شانے پر سر رکھے روتی رہی ۔۔ وہ خاموش رہے ۔۔ وہ چاہتے تھے کہ ایمن اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لے۔ انھوں نے کبھی اسے یوں بے قابو ہوتے، آنسو بہاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ ایک مضبوط اور بلند حوصلہ بلکہ کسی حد تک گھمنڈی لڑکی سمجھتے رہے تھے اب اسے اس طرح ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو انھیں اندازہ ہوا کہ اسے بھی کسی شانے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ان کے دل میں اس کے لیے بے پایاں ہمدردی کا جذبہ جاگا۔ اس کا سر کندھے سے لگائے، ان کا ہاتھ اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتے ہوئے ایک انوکھی مسرت سے دوچار ہو رہا تھا۔ اپنی بانہوں کے گھیرے میں ایمن کو لیے وہ ایک طمانیت سی محسوس کر رہے تھے۔ عورت کے آنسو اگر نمائشی نہ ہوں تو مضبوط سے مضبوط مرد کو بھی پگھلا دیتے ہیں۔ آزر نواب جو اپنے برتاؤ کی سختی سے ہمیشہ ایمن کے استقلال کو توڑنے کی ایک ساری کوشش کرتے تھے اب اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر جھیل رہے تھے۔ یہ ان کا جذبۂ رحم نہیں تھا، کیونکہ انھوں نے ایک بار ایمن سے کہا تھا کہ وہ رحم کے قابل صرف جانوروں اور پاگلوں کو سمجھتے تھے ۔۔ پھر وہ کون سا جذبہ تھا جو ایمن کے درد میں انھیں شریک کر رہا تھا؟

انھوں نے ایمن کو اور بھی اپنے قریب کر لیا اور اس کے سر پر اپنا رخسار رکھ دیا جب اس کی سسکیوں میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو انھوں نے اپنے رومال سے اس کی آنکھیں خشک کیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا سر تھامے دیر تک ان دھلی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت سمندر کی گہرائی تھی۔ انھوں نے دھیرے دھیرے سر جھکا کر اس کی دونوں آنکھوں کو چوم لیا۔ ایمن نے کوئی مزاحمت نہیں کی، بلکہ اس کا سر جھکتے جھکتے ان کے سینے سے جا لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ماحول کے

سنانے میں اسے صرف ایک ہی بات کا احساس تھا کہ وہ وہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ آج اس نے اپنے بے تاب عمل سے آزر نواب پر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر بھی اپنی شکست کا اسے کوئی ملال نہیں تھا ۔ وہ اب اپنی ذہنی حد بندیوں سے عاجز آ گئی تھی۔ اسے آج یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی میں تسکین کی صورت صرف وہی باہیں تھیں جو اسے اپنی تنگ گرفت میں لیے ہوئے تھیں، وہی چوڑا اور مضبوط سینہ تھا جس پر سر رکھے وہ اس کے مالک کی قدرے تیز دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔ وہی دیوانہ بنانے والے مسکراتے ہونٹ جو ابھی وارفتگی سے اس کی آنکھوں پر سرسراتے تھے۔ وہی لمبی مضبوط انگلیوں والے ہاتھ تھے جن کا اتفاقیہ مس اسے گھبرا دیتا تھا، کیونکہ ان کا لمس ہمیشہ اسے ایک انوکھی کمزوری سے دوچار کر دیتا تھا۔

پتا نہیں کب تک وہ آزر نواب کی باہوں کے گھیرے میں خود کو فراموش کیے بیٹھی رہی۔ اچانک کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ گھبرا کے الگ ہو بیٹھی ۔ پہلے تو آزر نواب کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی، جیسے وہ اسے جدا نہیں کرنا چاہ رہے ہوں، لیکن جب ایمن نے زیادہ کشمکش کی تو انھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی ۔

اور اب جب کہ وہ ان سے دور ہو بیٹھی تھی تو چاہتی تھی کہ کوئی حادثہ ہو اور زمین اسے نگل جائے ۔ اس کی بے خودی نعمت تھی، جبکہ اس کی ہوش مندی اس کے لیے عذاب ہو رہی تھی ۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اسے کیسے ختم کر سکتی تھی؟ آزر نواب اس کی اندرونی کشمکش کو چپ چاپ دیکھے جا رہے تھے ۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں کیا تھا، وہ کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی، کیونکہ اس میں ان سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں تھی اس نے خود پر سے بھروسا کھو دیا تھا۔

آزر نواب جو یہ سمجھتے تھے کہ وہ بشارت نواب کو جیت کر حویلی میں اپنی مستقل جگہ بنانا چاہ رہی تھی، اب دل ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دے رہے ہوں گے کہ وہ اپنی کمند اور بھی بلندی پر ڈالنے کی کوشش میں تھی۔

ایک بادل کے ٹکڑے نے چاند کو چھپا دیا تھا ۔ ایمن اس عارضی اندھیرے کی شکر گزار تھی ۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی واپس ہونے لگی۔

”ٹھہرو ایمن ۔“ آزر نواب نے دھیرے سے کہا ۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے ۔ وہ پل بھر کے لیے رک گئی ۔

”مسز آئزاک نے تمھارے لیے کچھ بھیجا ہے۔“

اس کی زبان پھر بھی بند رہی ۔۔۔ حالانکہ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ مسز آئزاک سے

ان کا کیا تعلق تھا؟ وہ ان سے کیسے ملے؟ کیوں ملے؟ لیکن وہ یہ سب کچھ کیسے پوچھے جب زبان ہی ساتھ نہ دے۔

"لیکن وہ چیز اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔" آزر نواب اس کے قریب آتے ہوئے بولے "کل سویرے تمھارے کوارٹر میں پہنچ جائے گی۔"

باقی راستہ بالکل خاموشی سے کٹا۔ صرف پیروں تلے دبتے خشک پتے شور مچاتے رہے۔ اس کا پریشان دماغ مسز آئزاک سے بہت دور تھا۔ ان کی صرف ایک ہی تمنا تھی کہ آزر نواب اسے تنہا چھوڑ دیں — چلے جائیں۔ اپنے کوارٹر کا راستہ وہ اچھی طرح جانتی تھی — وہ کئی بار چاندنی راتوں میں تنہا اس جھیل میں اپنے دکھ ڈبونے کو آ چکی تھی — دکھ جو اس کے اپنے تھے، جو اس کی ساری شخصیت پر چھانے کی کوشش کرتے تھے۔ جنھیں وہ ہمیشہ شکست دے دیتی تھی — انھیں وہ اس جھیل میں دھکا دے دیتی تھی — وہ جب خوش ہوتی تب بھی وہاں آیا کرتی تھی — تب وہ جھیل اسے ایک پیاری سہیلی لگتی — اس کے سکھ دکھ کی ساتھی۔ وہاں پہنچ کر آج اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

کوارٹر آ گیا اور وہ کچھ بغیر کہے سنے لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئی — لیکن آزر نواب نے ایسا کرنے سے پہلے اس کے شانے کو پکڑ لیا۔ وہ کانپ سی گئی، لیکن پھر بھی اس کی نظریں نہیں اٹھیں — آزر نواب کا ہاتھ اپنا سفر طے کرتا ہوا اس کی گردن سے گزر کر اس کے رخسار تک پہنچا، اور انھوں نے دھیرے سے کہا "شکریہ"! — اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا — اور ایمن پلٹ کر بھاگی، اس نے ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور نڈھال سی بستر پر گر گئی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر کپڑے تبدیل کرتی، شب خوابی کا لباس پہن لیتی — وہ اسی طرح بستر پر پڑی رہی اس کی آنکھوں کے آنسو بالکل خشک ہو گئے اس کی جگہ ایک خفت آمیز ڈر تھا جو اس سے کہہ رہا تھا "اب کیا ہوگا؟" اس کی کمزوری نے اسے آزر نواب سے اور بھی دور کر دیا تھا۔ اب اسے شاید حویلی چھوڑنی ہی پڑے گی۔ وہ ان کے عارضی دردمندانہ برتاؤ کے بھرم میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

وہ رات بھر ٹھیک طرح نہیں سو سکی سویرے بوجھل آنکھوں سے جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی ایک خوب صورت سے کاغذ میں لپٹا بڑا سا پیکٹ رکھا تھا۔

"Dear Old Mrs. Issac" ایمن نے سوچا اور جھک کر پیکٹ اٹھا لیا۔ مسز آئزاک نے تحفے کی قیمتی پیکنگ پر ہی کافی پیسا خرچ دیا تھا۔ اس نے بے صبری سے پیکنگ کھولی — وہ

ایک بہت ہی خوب رو مرد کی تصویر تھی، جس کی آنکھوں سے ذہانت اور جبیں سے اقتدار جھلکتا تھا، ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ کے خلوص کو وہ بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ اس تصویر کو دیکھتی ہی رہ گئی جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی ــــ وہ اس کے والد کی تصویر تھی، لیکن اس نے ان کی یہ تصویر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مسز آنزاک اسے اس سے اچھا تحفہ اور کیا دے سکتی تھیں۔؟ یہ تصویر انھوں نے ضرور کہیں گھر ٹھیک کرتے ہوئے پائی ہوگی اور سوچا ہوگا کہ اسے اس کے اصلی حقدار کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ شکرگزاری اور احسان مندی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ تصویر سنبھالے اندر آگئی۔

"عالم پناہ" کا کام بہت اطمینان بخش طور پر چل رہا تھا۔ بلکہ امید سے کچھ زیادہ ہی مہمان وہاں آرہے تھے ـــ وہ شاید حیدرآباد کی منفرد تہذیب تھی، جس نے ہندستان کے نقشے پر اپنا ایک الگ ہی مقام بنالیا تھا۔ جنوبی ہند میں ہوتے ہوئے بھی وہاں کی تہذیب اور سماجی ڈھانچا جنوب کے اور مقامات سے بالکل جداگانہ تھا۔ 'عالم پناہ' پر مہمانوں کی نظر کرم کی اور بھی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ حیدرآباد اب عظیم تر ہندستان کا ایک حصہ بن چکا تھا ـــ وہاں کی سیاسی، ثقافتی، اور تعلیمی سرگرمیاں بڑھ چکی تھیں۔ بڑی بڑی کانفرنسوں اور میٹنگوں کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور ان میں حصہ لینے کو جو ممتاز شخصیتیں وارد ہوتیں، ان کے قیام کے لیے 'عالم پناہ' ہی کو موزوں سمجھا جاتا۔ آذر نواب ہوٹل میں بہت کم آتے۔ کبھی کبھار جب کوئی بہت خاص مہمان وہاں ٹھہرنے آتا تو ان کا وہاں آنا ہو جاتا، لیکن وہاں ان کی موجودگی ہوٹل کی فضا میں بجلی کے کرنٹ کی طرح محسوس ہوتی۔ ہوٹل کے ملازم ان کی سخت گیری سے ڈرے ہوئے رہتے، لیکن ساتھ ہی انھیں یقین بھی رہتا کہ محنت اور ذمہ داری سے کام کرنے والے کو ان سے خائف رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ہر ایک کے تہوار پر اسے ایک سرپرائز پیکٹ خاص آذر نواب کی طرف سے ملنے کا پورا یقین رہتا۔

ہوٹل کے مونوگرام کے ساتھ نئی کٹلری اور کراکری کے پارسل آگئے تھے۔ امین ان کا معائنہ کرکے ہال میں پہنچ ہی رہی تھی کہ کوریڈور میں ٹھٹک گئی۔ ہوٹل میں یوں تو اس کا نئے نئے مہمانوں سے آئے دن سامنا ہوتا رہتا تھا، لیکن، سے چونکا دینے والا مہمان آج ہی آیا تھا۔ اس کے سامنے وہیل چیئر میں ریحانہ بیٹھی تھی۔ امین کو دیکھ کر ان کی بھی آنکھوں میں گرم جوشی اور ہونٹوں پر تبسم آگیا تھا ـــ امین کی نظر آگے بڑھی۔ کاؤنٹر پر آذر نواب رجسٹر میں کچھ ـــــ شاید ریحانہ کا نام لکھ رہے تھے اور ریسیپشنسٹ مسکراتے ہوئے انھیں چابی پیش کر رہا تھا۔ آذر نواب نے شاید ریحانہ کی آمد پر اپنا دورہ ملتوی کر دیا تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ چار دن کے لیے دلی گئے ہوئے ہیں وہ اپنی آنکھوں

میں پہچان کی گرمی لیے ریحانہ کے پاس پہنچی ۔ اس لمحے آزرنواب بھی پلٹے اور ان کا پلٹنا امین کو کتنے میں لانے کو کافی تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ آزرنواب تھے بلکہ اس لیے کہ وہ آزرنواب نہیں تھے۔

امین نے ریحانہ کی کرسی کے دونوں دستوں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے اور انھیں دیکھتی رہ گئی ۔۔ وہ شخص جسے اس نے پیچھے سے دیکھ کر آزرنواب سمجھا تھا، اب مسکراتے ہوئے ہوا میں کمرے کی چابی ہلاتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس میں آزرنواب کی ہلکی سی شباہت ضرور تھی ۔ شاید اس کے بال آزرنواب کی طرح تھے لیکن دہانہ خوش قطع ہونے کے باوجود ان سے بہت مختلف تھا۔ اور وہ آنکھیں ہرگز آزرنواب کی آنکھیں نہیں تھیں ۔ وہ آنکھیں بڑی بڑی معصوم بچوں کی سی آنکھیں تھیں ۔۔ جبکہ آزرنواب کی آنکھیں دل میں خنجر کی طرح پیوست ہو جاتی تھیں ۔۔ وہ آنکھیں انسان کا سکون مسمار کر دیتی تھیں، خود اعتمادی کو درہم برہم کر دیتی تھیں۔

"اقبال، یہ امین ہیں"۔ ریحانہ نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"امین اقبال سے ملو"۔ ریحانہ نے کھوئی ہوئی امین سے کہا اور وہ چونکی۔

"اوہ اقبال ۔۔ اقبال صاحب، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا اور ریحانہ کے پُرمسرت چہرے کو دیکھا۔ وہ بس روشن ہی روشن تھا۔ کہیں کسی احساس محرومی کا اندھیرا نہیں تھا اس پر۔

ریحانہ نے اس کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا "تم کمرے میں آنا ۔ تمھیں بہت کچھ بتانا ہے"۔

امین نے جھک کر ریحانہ کے رخسار پر بوسہ دیا ۔۔ وہ بہت کچھ تو یوں ہی سمجھ گئی تھی، باقی جو کچھ اسے سننا تھا، اس کے لیے وہ ضرور وقت نکال سکتی تھی۔

ہوٹل کا بیل بوائے چستی سے ریحانہ کا سوٹ کیس لیے کھڑا تھا، امین نے پھر ملنے کا وعدہ کیا اور 'عالم پناہ' میں ان کے مکمل آرام کا یقین دلاتے ہوئے ان کے کمرے تک پہنچا آئی۔

اقبال احمد کی فرمائش پر انھیں نچلی منزل پر ہی کمرہ دیا گیا تھا، جس کی پچھلی بالکونی باغ کے حسین ترین گوشے کی طرف کھلتی تھی۔ یہ ہوٹل 'عالم پناہ' کے VIP کمروں میں سے ایک تھا۔

امین کو ریسپشنسٹ نے بتایا کہ آزرنواب نے دلی جانے سے پہلے ہی ہدایت دے دی تھی کہ مسٹر اور مسز اقبال احمد کو وہ کمرہ دیا جائے۔

یہ بات تو امین پر واضح ہو گئی تھی کہ ڈانڈیلی چھوڑنے سے پہلے اس نے ریحانہ کے ساتھ جس شخص کو ریحانہ کے اسٹوڈیو میں دیکھا تھا وہ آزرنواب نہیں بلکہ اقبال احمد تھے ۔۔ خود ریحانہ کے شوہر۔ لیکن اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا ۔ اس میں بظاہر کہیں نہ کہیں آزرنواب کا ہاتھ

ضرور تھا لیکن کہاں ؟ یہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے اب یاد آیا کہ ریحانہ نے اس سے ایک بار کہا تھا کہ اس کے شوہر اور آزر نواب میں کچھ مشابہت ضرور تھی، لیکن پھر بھی جب اس نے ریحانہ کو خود اس کے شوہر کی آغوش میں دیکھا تھا تو فی الفور ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آزر نواب ہی تھے ۔ اس کی یہ غلط فہمی بے جا بھی نہیں تھی کیونکہ اسے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اقبال احمد وہاں پہنچ سکتے تھے ۔ وجہ جو کچھ بھی تھی ۔ اب اسے اپنی جلد بازی پر شرم آتی — آزر نواب اس کی نظروں میں کم از کم ایک الزام سے تو بری ہو گئے — لیکن اس کا اس پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا تھا —— وہ وہیں کھڑی تھی جہاں پہلے تھی۔

امین کا وہ سارا دن مصروفیت میں نکل گیا ۔ بڑی سرکار نے بھی آج اسے کچھ زیادہ دیر بٹھا لیا تھا۔ شام کو ریحانہ اور اقبال لاؤنج میں نہیں نظر آئے تو امین نے بھی ان کے کمرے پر جا کر انھیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا ۔ کھانا بھی اقبال نے کمرے میں منگوا لیا تھا۔

دوسرے دن صبح وہ ریحانہ کے پاس گئی۔

ریحانہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں برش کر رہی تھیں ۔ امین کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور انھوں نے برش ہاتھ سے رکھ دیا۔

"اقبال ابھی گئے ہیں میٹنگ میں ۔" ریحانہ نے کہا "میں کل تمھارا انتظار کرتی رہی اور اقبال بھی" — ریحانہ کی زبان اقبال کے ذکر سے تھک نہیں رہی تھی — اسے خوش دیکھ کر امین بھی خوش تھی۔

"ریحانہ، تمھیں خوش دیکھ کر جانتی ہو میں بھی کتنی خوش ہوں ؟" امین نے برش اٹھا کر ریحانہ کے ادھورے کام کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں، تم نے ہمیشہ مجھے اپنا خلوص ہی دیا ہے ۔ حالانکہ میں نے خود تمھارے ساتھ کبھی کبھی بڑی رکھائی برتی ہے ۔" ریحانہ نے امین کا ایک ہاتھ پکڑ کر آئینے میں اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا "لیکن وہ میری مایوسی اور ناامیدی کا دور تھا امین! اب میں وہ نہیں رہی اب میں نے اقبال کو پا لیا ہے — اور . . . اور . . ."

"اور ؟" امین نے اسے بات پوری کرنے پر اکسایا۔

"اور اب میں ماں بننے والی ہوں امین ۔" ریحانہ کی آنکھوں میں ایک ننھا سا چمک تھی ۔

امین نے ریحانہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی ۔

"واقعی؟ — مبارک ہو! لیکن یہ سب کیسے ہوا ریحانہ؟" امین نے حقیقی خوشی سے کہا۔
"میری تقدیر — یا پھر آزر نواب اس کے ذمہ دار ہیں" ریحانہ نے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے اگلوا ہی لیا کہ اقبال کے بغیر میری زندگی ویران ہے۔"
"ہاں، انھیں ناکیں گھسوانے میں مزا آتا ہے" امین بولی اور دونوں ہنس پڑیں۔
"وہ خود بمبئی گئے — اس سلسلے میں ڈیڈی سے ان کی کچھ اَن بن بھی ہو گئی۔ ڈیڈی چاہتے تھے کہ اقبال خود معافی مانگتے ہوئے میرے پاس آئیں، یا پھر میں ان سے طلاق لے لوں۔ وہ اپنے پیسے سے دوسرا داماد خریدنا چاہتے تھے لیکن ایک دن آزر نواب نے اقبال کو اپنے مہمان کی طرح ڈانڈیلی بلا لیا اور میں نے ڈیڈی سے صاف کہہ دیا کہ اگر اقبال مجھے واپس قبول کرنے تیار ہوں تو میں کسی قیمت پر انھیں نہیں چھوڑوں گی، لیکن —" ریحانہ نے ایکدم تیور بدل کر کہا، "تم مجھ سے ملے بغیر کیوں ڈانڈیلی سے حیدرآباد چلی آئیں — مجھے تمھارا تحفہ مل گیا تھا۔"
اب امین کیا کہتی کہ وہ کیوں ریحانہ سے بغیر ملے آگئی تھی۔
لیکن ریحانہ خود اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی، "You know" اور امین اس نے خوشی سے کہا "کچھ دن میں میں کرچوں کے سہارے چل سکوں گی۔ اس نئے ڈاکٹر کے علاج سے مجھے فائدہ ہو رہا ہے۔"
ریحانہ کی خوشیوں میں دل سے شریک، امین کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔
"بندگی تقصیر" بشارت نواب برآمدے میں بید کی آرامدہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولے۔ وہ دیر سے وہاں آکر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ بڑی سرکار نماز ختم کریں تو انھیں آداب بجالائیں۔ لیکن سلام ان کے منہ پر ادھورا ہی رہ گیا، کیونکہ سلام پھیر کر نماز کی چادر سر سے کھلی تو ان کے سامنے بڑی سرکار نہیں، بلکہ ان کی اپنی والدہ کھڑی تھیں۔
تسنیم پاشا سفید براق ساری اور پورے آستین کے بلاؤز میں ایکدم مختلف نظر آرہی تھیں۔ ان کے بال مصنوعی رنگ سے آزاد سرمئی نظر آرہے تھے۔ سرخ و سفید چہرہ، سرخی اور میک اپ سے مبرا تھا۔ بشارت نواب حیرت سے آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھتے رہے۔ تسنیم پاشا نے مسکراتے ہوئے انھیں دیکھ کر ہاتھ پھیلا دیے اور بشارت نواب ان کے سینے سے لگ گئے۔ پتا نہیں کیوں ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور انھیں ایسا لگا جیسے زندگی میں وہ پہلی بار اپنی ماں سے مل رہے

بشارت نواب کچھ دیر پہلے پہنچے تھے اور جانتے تھے کہ ان کی والدہ اس وقت تک کلب سے واپس نہیں ہوتی تھیں — ویسے بھی اپنی ماں سے لہو کے رشتے کے علاوہ ان کا زیادہ تر اخلاقی اور تہذیبی رشتہ ہی تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی ماں ان سے اور بھی دور ہوتی گئیں۔

ان کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے، کیسے پورے ہوتے تھے انھیں اس کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ ایک آزاد اور بے فکر زندگی کے عادی ہوتے گئے۔ جس نے کبھی زندگی کے جوئے کا بار اپنی گردن پر سہا ہی نہ ہو، اسے راستے کی اونچ نیچ کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا — وہ دنیا کو ایک سیدھی سپاٹ بڑھیا سڑک سمجھتے رہے، جس پر زندگی کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑا جا سکتا تھا، حتّٰی کہ ایک چوراہے پر آزر نواب نے ان کا رخ موڑ دیا۔ اب انھیں ٹھوکر کھانا تھی، گرنا تھا، سنبھلنا تھا — وہ آزر نواب سے چھے سال چھوٹے تھے اور بچپن ہی سے ان کا لوہا مانتے تھے۔ آزر نواب انھیں بچّہ سمجھ کر منہ نہیں لگاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں میں کبھی بے تکلفی پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ کبھی کبھار جب آزر نواب، بشارت نواب کو اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا کر گھوڑا دوڑاتے تو بشارت نواب کا ننھا سینہ فخر اور خوشی سے پھول جاتا — گرمی کی چلچلاتی دوپہر میں آزر نواب نظر بچا کر حویلی سے باہر باغ میں بھاگ آتے تو بے پانو بشارت نواب بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ آزر نواب گرگٹوں کا شکار کرتے، تو بشارت نواب انھیں پتھر چن چن کر دیتے — اس سے زیادہ انھیں آزر نواب نے اپنے قریب نہیں آنے دیا کبھی بشارت نواب کی ہمت ہوتی۔ وہ آزر نواب کی برتری کا اقبال کرتے ہوئے ہمیشہ ان سے خائف رہے — اسے ان کا احساس کمتری بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، کیونکہ انھوں نے کبھی خود اپنا مقابلہ آزر نواب سے کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ان کا میدانِ عمل الگ تھا۔ جب آزر نواب کو کورٹ آف وارڈز بھجوا دیا گیا تو کچھ دن تک بشارت نواب کھوئے کھوئے رہے — شاہانہ صاحبزادی کے ساتھ کھیلنا وہ کسرِ شان سمجھتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ انھیں آزر نواب کا چلا جانا اچھا لگا۔ تب انھیں احساس ہوا کہ آزر نواب ڈکٹیٹر تھے اور وہ خود بلا چوں و چرا ان کا حکم مانتے تھے۔ آزر نواب سے بغاوت کرنے کی حس کبھی جاگی ہی نہیں۔ کسی نظام یا کسی شخص سے بغاوت کرنے کے لیے کسی احساس محرومی اور انا کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی میں کسی مقصد کی ضرورت ہوتی ہے خود مختاری کی ضرورت ہوتی ہے — خود مختار بشارت نواب بھی تھے وہ اپنی پسند کا کھاتے تھے، اپنی پسند کا پہنتے تھے۔ ان کے اپنے مشغلے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ خود مختار وہ ہوتے بھی تو کس بوتے پر ہوتے؟ ان کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا تھا — اور

انھیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کس نعمت سے محروم ہیں۔ اسی لیے جب آزر نواب چھٹی پر آتے، بشارت نواب کا پھر وہی حال ہو جاتا۔ آخر انھوں نے کشمکش چھوڑ دی۔ اور ہمیشہ کے لیے مان لیا کہ آزر نواب کی طرح کے لوگ دنیا میں آتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کا کہا مانا جائے اور اسی میں ان کی بھلائی ہے۔

"اب میں بھی تمھارے ساتھ ڈانڈیلی چلوں گی۔ وہیں رہوں گی"، تسنیم پاشا نے کہا۔

"وہ دنیا بہت چھوٹی ہے ممی"۔ بشارت نواب اپنی ماں کو جانتے تھے۔ "وہاں آپ کا دل نہیں لگے گا"۔

"یہاں کی اتنی بڑی دنیا اب مجھ سے سمیٹی نہیں جاتی"۔ تسنیم پاشا بولیں۔

"پھر وہی قنوطیوں جیسی باتیں ہونے"۔ بڑی سرکار اپنا دوپٹا سنبھالتی آتے ہوئے بولیں۔ انھیں دیکھ کر بشارت نواب کھڑے ہو گئے اور جھک کر سلام کیا۔ بڑی سرکار نے انھیں گلے لگا لیا۔

"تسنیم پاشا تم بشارت نواب کے ساتھ ضرور ڈانڈیلی جاؤ گی۔ لیکن دنیا سے بھاگنے والی باتیں فضول ہیں"۔ بڑی سرکار بیٹھتی ہوئی بولیں۔ "دنیا ہر جگہ وہی ہے"۔

پھر وہ بڑی دیر تک بشارت نواب سے ان کے اور ڈانڈیلی کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ بشارت نواب اب وہ بشارت نواب نہیں تھے جو سوالوں سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوں۔ اب انھوں نے زبردست خود اعتمادی حاصل کر لی تھی۔ جنگل کی کھلی اور تازہ ہواؤں میں ان کی صحت اور نکھر گئی تھی۔ بڑی سرکار کو اندیشہ تھا کہ وہ شہر کے پروردہ، نفاست کے دلدادہ الھڑ اور سادہ، یوں جنگل کے کیسے ہو رہیں گے۔ لیکن اس کے برعکس جنگل نے ہی انھیں انسان بننے کے گُر سکھا دیے تھے، ورنہ وہ تو محض نواب زادہ میر بشارت علی ناں ہی تھے۔

بشارت نواب گھوم پھر کر حویلی کے بدلے ہوئے رنگ کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ پھر سیدھے امین کے کوارٹر کی طرف چلے گئے۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ اب امین حویلی میں نہیں رہتی۔

امین کے کوارٹر کی روشنی کھلی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بشارت نواب کھلے دروازے سے آ کر اس کے پیچھے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

وہ مسز آترائے کا خط پڑھنے میں مصروف تھی۔ انھوں نے اسے ڈھیر ساری دعائیں بھجوائی تھیں۔ لیکن ان کا آدھے سے زیادہ خط تو آزر نواب کی تعریفوں سے بھرا تھا۔ مسز آترائے ایک ہی ملاقات میں ان کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ ان کی شخصیت، شکل و صورت اور اخلاق کی تعریفوں کے

پگ باندھ دیے تھے ۔ انھوں نے پل بھر کے لیے بھی مسز آترآک کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان میں اور خود میں زبردست طبقاتی فرق تھا ۔ مسز آترآک کے ساتھ انھوں نے کچن میں بیٹھ کر ہی چائے پی ۔

"میری ان سے ملاقات اتفاقیہ ہی تھی ۔۔ پہلے تو میں جھجکی کہ اتنا بانکا بھیلا اور امیر نوجوان میرے جھونپڑے میں کیوں آیا تھا ۔ لیکن انھوں نے بتایا کہ وہ یہیں کہیں اپنے کسی دوست کے پاس آئے تھے ۔ میرے بغیچے کے پھول انھیں اچھے لگے تو اندر چلے آئے ۔۔ اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اتنی پیارمنگ لیڈی اس خوب صورت کاٹیج میں رہتی ہے ۔" ایمن رکی اس نے دل میں سوچا کہ کیا وہ بھی سچ مچ یقین کر لیتے کہ آزر نواب کی ملاقات مسز آترآک سے محض اتفاق ہی تھی ۔

"باتوں باتوں میں انھوں نے ذکر کیا کہ تم ان کے ساتھ کام کرتی ہو ۔۔ تب مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی کہ عجیب اتفاق ہے کہ تمھارے افسر سے ملنے کا موقع ملا ۔ انھیں بھی بہت حیرت ہوئی جب انھیں پتا چلا کہ میرا اور تمھارا کیا تعلق ہے ۔ پھر وہ بڑی دیر تک تمھارے اور تمھارے والدین کے بارے میں پوچھتے رہے ۔" ۔۔ آگے چل کر مسز آترآک نے لکھا تھا "نواب صاحب تمھارے ابّا کا فوٹو دیکھنا چاہتے تھے ۔۔ لیکن تم جانتی ہو، ان کی کوئی تصویر نہیں ہے ۔ تمھارے سامان میں ڈھونڈنے پر ان کا ایک گروپ فوٹو ملا ۔ میں نے دکھا دیا ۔۔ وہ فوٹو اپنے ساتھ لے گئے، لیکن دوسرے دن شام کو ان کے شوفر نے میرے لیے بہترین گلاب کے گلدستے کے ساتھ وہ فوٹو لوٹا دیا ۔"

ایمن نے خط بند کر دیا اور سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھا، جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی ۔ اسے یاد آگیا ۔۔ وہ تصویر واقعی اس گروپ تصویر سے نکال کر ان لارج کی گئی تھی ۔ آزر نواب نے تو کہا تھا وہ تصویر مسز آترآک نے اس کے لیے بھوائی تھی ! ۔۔ آخر وہ اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہے تھے ۔ اور کیوں کھیل رہے تھے ؟ اس نے ٹھنڈی سانس بھری ۔

"کہیں یہ جدائی کی ٹھنڈی سانسیں میرے لیے تو نہیں ہیں ؟" بشارت نواب بولے اور وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی ۔

"آپ ! آپ کب آئے ؟" اس نے پلٹ کر پوچھا ۔

"ہم گئے ہی کہاں تھے ؟ ہمیشہ یہیں موجود تھے ۔۔ آپ کے دل میں" بشارت نواب نے دل پر ہاتھ رکھ کر تھیٹریکل انداز میں کہا اور ایمن ہنس پڑی ۔

"یعنی ۔۔ خواہ مخواہ ۔" پھر اس نے انھیں گھورتے ہوئے ۔۔ اپنا سبجیکٹ ۔۔ آپ

شاید کام چھوڑ کر بھاگ آتے ہیں ڈانڈیلی سے ـــــ میں رپورٹ کروں گی آزر نواب کو۔"
"جی، خاکسار اُن ہی کے حکم پر حاضر ہوا ہے۔" بشارت نواب اسی ڈرامائی انداز میں بولے۔
"وجہ نزول؟" ـــ امین نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔
"وہ مجھے یورپ بھجوا رہے ہیں ٹریننگ کے لیے۔" بشارت نواب بولے۔
"یہ تو بہت اچھا ہوا ـــ لیکن آپ کے جانے کے بعد فیکٹری کون سنبھالے گا؟"
" بشارت نواب نے منہ سے کچھ کہے بغیر ہی دونوں ہاتھوں کے پنجے کھول کر انگوٹھے کانوں سے لگا دیے۔ امین کھِل کر زور سے ہنسی۔
"جھبو رسٹھ؟ ـــ چلیے آپ بھی حد کرتے ہیں۔ بچارے کے کان اتنے بھی بڑے نہیں۔"
"کبھی اس محبت کی نظر سے ہمیں بھی دیکھو نا؟" بشارت نواب نے کہا۔
"اچھا یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا کہ آپ کو کس نظر سے دیکھا جاتے ـــ پہلے بتائیے آپ کیا پییں گے؟"
"شربت دیدار پینا تھا سو پی لیا۔" بشارت نواب جھوم کر بولے۔
"آپ بالکل شرارت کے موڈ میں ہیں۔ اب آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔" امین نے کہا۔
"تو چلیے کافی پی لیتے ہیں ـــ کھانا کھا آیا ہوں۔"
امین کافی بنانے کو اپنے چھوٹے سے خوب صورت کچن میں گئی تو بشارت نواب بھی اس کے پیچھے چلے آتے اور وہیں دروازے سے کندھا لگائے کھڑے ہوتے امین کی مصروفیت دیکھتے رہے۔
ہلکے پھلکے ڈریسنگ گاؤن میں اس کا متناسب بدن اور کمر سے نیچے جھولتی، ڈھیلی گوندھی ہوئی چوٹی میں بشارت نواب کی نظر اُلجھتی رہی ـــــ وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے رہے۔
"دیکھنا مریں گی سیکڑوں گوریاں آپ پر" ـ امین نے کھولتا ہوا پانی کافی کی پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔
"لیکن ہم تو کسی اور ہی کے دامِ دل آرا میں گرفتار ہیں۔" بشارت نواب بولے۔
"میں آپ کی شرارت بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" امین نے کہا۔ "سچ بتائیے، کیا سچ مچ ہے کوئی؟" وہ کافی کی پیالیاں ہاتھ میں لیے پلٹی۔

"جب مجنی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو؟" — یکایک بشارت نواب کا انداز سنجیدہ ہو گیا — وہ جب سنجیدہ ہوتے تو امین کو اور بھی ہنسی آتی۔

"سفارش کروں گی آذر نواب سے کہ شہنائی بجوا دیں اس کے گھر۔"

"مجھے شادی کرنی ہو تو اس میں آذر نواب کے دخل کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا ہٹیے، راستہ دیکھیے۔ اور ایکٹنگ چھوڑ کر اپنی خیریت بتلائیے۔" امین نے بات کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر ٹالنا چاہا۔ لیکن بشارت نواب دروازے میں سے نہیں ہٹے۔ اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالیاں لے کر انھوں نے دیوار سے لگی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیں اور امین کی طرف پلٹ کر بولے۔ "امین کیا تمھیں مجھ ایک مسخرے اور شریر بچے کے سوا کبھی کچھ نظر نہیں آتا؟"

امین کو ان کا بدلا ہوا رنگ پریشان کرنے لگا۔

بشارت نواب نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور ہلکے سے جھنجھوڑتے ہوئے بولے "میں کوئی بے وقوف کم سن بچہ نہیں ہوں امین — ایک ہوش مند اور ذمہ دار مرد ہوں۔ اور ایک مرد ہی کی طرح تم سے محبت کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے امین میں تمھیں اپنی زندگی کی طرح چاہتا ہوں" انھوں نے امین کو کھینچ کر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

"بات گھسی پٹی ہے امین، لیکن آج میں تم سے اپنا حق مانگتا ہوں۔ تمھیں یاد ہے تم نے مجھ سے شرط ہار کر مجھے کچھ مانگنے کا حق دیا تھا۔ آج وہ قرض چکا دو امین۔ میں تم ہی کو تم سے مانگتا ہوں — مجھے زندگی کا سفر اپنے ساتھ طے کرنے دو۔ میں تمھیں کبھی نہیں ہراؤں گا۔"

امین وہیں کرسی پر ہکا بکا دھم سے بیٹھ گئی۔ بشارت نواب نے بھی وہیں زمین پر گھٹنا ٹیکے اپنا سر اُس کی گود میں رکھ دیا۔

"ہاں کہہ دو امین — خدا کے لیے ہاں کہہ دو۔" انھوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

امین بشارت نواب سے ہاں کیسے کہتی۔ اسے ان سے اُنس تھا۔ بے حد اُنس تھا لیکن اتنا نہیں کہ خود کو ان کے حوالے کر دیتی — اس نے اپنی الجھن سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا۔

"بشارت نواب . . . ."

"مداخلت کی معافی چاہتا ہوں" — ایک جانی پہچانی آواز نے اور بھی اس کے ہوش

گم کر دیے اور وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی — ساتھ ہی بشارت نواب بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

"چچا جان کا مزاج سخت ناساز ہے — وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔" آزر نواب کا لہجہ برف اور رہی سہی کسر ان کی آنکھوں نے نکال دی — جن میں یخ بستگی کے ساتھ ساتھ ایک حقارت بھی، الزام تھا، غصہ تھا، نفرت تھی — وہ کرسی کا دستہ پکڑے کچھ دیر تک اسے تہمت بھری نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر پلٹ کر چل دیے۔

ایمن وہیں ٹیبل پر دونوں ہاتھ ٹیکے لرزتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل دھونکنی بنا ہوا تھا — وہ ہمیشہ بشارت نواب کے اظہار عشق کو ان کی شرارت اور زندہ دلی پر محمول کرکے ٹالتی آتی تھی۔ لیکن اس کی چھٹی حس نے اسے کئی بار خبردار بھی کیا تھا کہ جسے وہ مذاق سمجھ رہی تھی کہیں حقیقت ہی نہ ہو۔ پھر بھی وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی — انسان فطری طور پر دھوکے باز ہوتا ہے۔ جب وہ کسی اور کو دھوکا نہیں دے پاتا تو خود ہی کو دے دیتا ہے اور اس کے ساتھ اسی دھوکے نے آج اسے ایک ایسی حقیقت سے دوچار کر دیا تھا جس کو اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ بشارت نواب کو ایک بہترین دوست کی طرح پیار کرتی تھی۔ صرف پسند کرتی تھی۔ جس پیار کے وہ طالب تھے وہ اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ وہیں کرسی پر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپے بیٹھ گئی۔ تیز رفتاری سے وقوع پذیر ہونے والے حالات نے اس کے حواس گم کر دیے تھے وہ جانتی تھی کہ رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا — اسے ابھی اور اسی وقت بشارت نواب کو بتانا ہوگا کہ وہ سراب کے پیچھے نہ دوڑیں۔ لیکن عین وقت پر آزر نواب کی آمد اور وقار جنگ کی سخت علالت کی خبر نے اسے نروس کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آزر نواب اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

وہ اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکی۔

"ایمن!" بشارت نواب اس کی کرسی کے پاس ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گئے "کیا میری دلی کیفیت کا اظہار تمھارے لیے اتنا تکلیف دہ ہے۔ بخدا میں تمھارا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔"

اب وہ انھیں کیسے سمجھاتی کہ وہ کیوں رو رہی تھی — وہ انھیں کسی طرح کا الزام نہیں دے رہی تھی۔ محبت کا اظہار ہی تو کیا تھا انھوں نے نفرت کا اظہار تو نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ ان کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ اب وہ ان سے کیسے کہے؟ وہ یک طرفہ محبت کی کسک سے واقف تھی۔ اس نے اپنی محبت کو دل کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لیے نظر — تھا۔ لیکن مرد اور

عورت میں فرق ہوتا ہے۔ عورت کی محبت ہلکی ہلکی مدھم چنگاری ہوتی ہے، جو ڈھیروں راکھ کے نیچے دبی سدا جلتی رہتی ہے۔ یہ وہ لافانی مقدس دیا ہے جسے وقت کی آندھی کبھی نہیں بجھا سکتی، کیونکہ وہ عورت کے مقدس آنچل کی اوٹ میں پنپتا رہتا ہے۔ اسے جلتے رہنا ہے۔ اسے کسی انجام کی تلاش نہیں ہے ——— جبکہ مرد کی محبت ایک بے صبر شعلہ ہے جو انجام کی تلاش میں اپنی بلندیاں کو پہنچ کر بالآخر کہیں کھو جاتا ہے ـــ مرد کو اس شعلے کی آبیاری نہیں کرنی پڑتی۔ کیونکہ وہ اس سے قاصر ہے۔ یہ اس کی بساط سے باہر ہے کہ سدا اس شعلے کو شعلہ بنائے رکھے۔ اس کے لیے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جو صرف ایک عورت ہی دے سکتی ہے۔

امین اور بشارت نواب تقریباً ہم عمر تھے ـــ وہ جانتی تھی کہ ان کی زندگی میں اور بھی سنگ میل آئیں گے۔ عورت کا ذہن مرد کے مقابلے میں جلد بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ ویسے بھی اس نے اپنی کمسنی ہی میں ٹھوکریں کھائی تھیں، جبکہ بشارت نواب نے ابھی ابھی عملی زندگی شروع کی تھی۔ انھیں ابھی آگے بڑھنا تھا۔ دوسروں کو سمجھنے سے پہلے خود کو سمجھنا تھا۔ وہ ان کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی، لیکن حقیقت کا اظہار بھی ضروری تھا، کیونکہ وہ چند دن بعد ہی یورپ سدھار رہے تھے۔

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بشارت نواب سے کن الفاظ میں کہے کہ اسے ان کی محبت منظور نہیں ـــ جب وہ کچھ نہیں بولی تو بشارت نواب نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا " امین میں لاکھ ناتراشیدہ سہی، لیکن اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ میں نے تمھیں کسی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تمھارا امتحان نہیں لوں گا ـــ جو کچھ تمھارے لیے کہنا مشکل ہو رہا ہے، کہنے کی کوشش نہ کرو۔ میں خود سمجھ گیا ہوں۔ کاش ایسا ہو سکتا۔" انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر امین کے ہاتھ چھوڑ دیے اور اٹھ کھڑے ہوئے " اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کون ہے جس نے میری محبت کو کبھی تمھارے دل میں جاگنے ہی نہیں دیا"۔ جیسے انھوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

امین نے چونک کر انھیں دیکھا۔

" لیکن مجھے ڈر ہے امین کہ تم اس شخص کی محبت کبھی نہ پاسکو گی جس کے لیے تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ میں تمھاری پرستش کرتا امین۔ جب کہ تم ہی نے اس کی پرستش کی ہے۔ آزر نواب نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اور جو خود دکھ جھیلتا ہے وہ دوسروں کا بھی دل دکھا کر خوش ہوتا ہے "۔

" بشارت نواب! ـــ امین اپنے راز کو فاش ہوتے دیکھ بپھری۔ " آپ کو کوئی حق نہیں "

"کیا تم آزر نواب سے پیار نہیں کرتیں؟" — بشارت نواب نے بھی اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

امین نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے — وہ اب کچھ اور سننا نہیں چاہتی تھی — اسے ایسا لگا جیسے سر بازار اسے کوڑے لگاتے جا رہے ہوں — وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بشارت نواب نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

امین اندھیرے میں دوڑتی گئی — آدھا راستہ طے کر کے وہ رک گئی — باہر کی خنک ہوا میں اکھڑی ہوئی سانس کو سنبھال کر وہ وقار جنگ کے کاٹیج کی طرف بڑھی — اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے بالوں کو حتی الامکان درست کیا، اور اندر داخل ہو گئی۔

وقار جنگ ڈرائنگ روم میں ہی دیوان پر لیٹے تھے — ان کے خوب رو چہرے پر مُردنی سی تھی اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ پاس ہی ڈاکٹر فرگوسن ان کی نبض تھامے بیٹھے تھے۔ وہیں آزر نواب بھی موجود تھے۔ ان کا چہرہ بھی فکرمند تھا — جیسے ہی امین اندر داخل ہوئی، انھوں نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی — ایک ناگواری سی ان کے چہرے پر آئی اور انھوں نے پھر اپنی نظریں وقار جنگ کے چہرے پر مرکوز کر لیں۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے آزر نواب سے کہا "بخار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا — مجھے کیوں نہیں بلوالیا نواب صاحب؟"

"مجھے خود ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا۔ جب کاٹیج میں روشنی نظر نہیں آئی" آزر نواب نے فکرمندی سے کہا۔

"نمونیا ہے" — ڈاکٹر نے کہا Let us hope for the best اور غیر مطمئن انداز میں شانے اچکا دیے۔

آزر نواب ڈاکٹر کو چھوڑنے کے لیے کار تک گئے — امین وہیں دیوان کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وقار جنگ کا وجیہہ چہرہ ایکدم پیلا ہو رہا تھا۔ ان کی ہنستی، مسکراتی آنکھیں بند تھیں — بلانکٹ کے باہر ان کا ایک ہاتھ نکلا ہوا تھا۔ اس لمبی انگلیوں والے ہاتھ نے کیسے کیسے کینوس سنوار دیے تھے۔ کیا انھوں نے کبھی اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش بھی کی ہوگی؟ — اسے وقار جنگ کی پرکشش جاذب نظر شخصیت کے پیچھے ایک بے چین تشنہ ہیولا سا نظر آتا رہا تھا — اس نے اپنا ہاتھ دھیرے سے ان کے ہاتھ پر رکھ دیا، تاکہ اسے بلانکٹ سے ڈھانپ دے — وقار جنگ کی بند آنکھیں رفتہ رفتہ کھلیں — امین کو دیکھ ان میں پہچان کی گرمی پلٹ آئی — ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ سے کانپے — امین نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کی ہتھیلی کو لے کر ہلکے سے

دبا یا۔ اور ان کا ہاتھ بلانکٹ کے اندر کر دیا۔ وقار جنگ کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی ——— وہ کچھ دیر بڑی اپنائیت سے ایمن کو دیکھتے رہے، پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"انھیں اور تکیوں کی ضرورت ہے۔ بیڈ روم میں سے لے آئیے۔" آذر نواب ڈاکٹر کو چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔

"بیڈ روم ہی میں لے چلیں۔ وہاں انھیں زیادہ آرام ملے گا۔" ایمن نے رائے دی۔

"میں ڈاکٹر کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔" آذر نواب نے رکھائی سے کہا۔

ایمن کے حواس پر ایسی ضربیں لگی تھیں کہ وہ مفلوج سے ہو رہے تھے۔ اس پر آذر نواب کی رکھائی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور وقار جنگ کے بیڈ روم سے تکیے لینے چلی۔ دو فاضل تکیے اسے کپ بورڈ میں مل گئے ہیں۔ لیکن ان پر غلاف نہیں چڑھے تھے۔ اس نے کپڑوں کی الماری میں غلاف ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ الماری میں پہننے والے کپڑے، تولیے، چادریں، سب اتنی خلط ملط پڑی تھیں کہ ایمن نے سب گھسیٹ کر پلنگ پر ڈال دیں۔ بلکہ اس کے پیر کے انگوٹھے پر چوٹ بھی لگ گئی تھی۔ پتا نہیں بکھرے ہوئے کپڑوں کے طوفان میں کیا تھا کہ کھٹ سے اس کے انگو۔ ٹھے پر لگا اور مارے درد کے اس نے اپنا انگوٹھا مسل ڈالا۔ لیکن جب اس کی نظر اس شیشے پر پڑی تو اس کا درد اور تکلیف کا سارا احساس جاتا رہا۔ وہ ریشمی چادر میں لپٹی ایک پینٹنگ تھی جو چادر کے کھلے کونے سے جھانک رہی تھی۔ ایمن نے اسے چادر سے نکالا۔ اس نے پینٹنگ پر سرسری نظر ڈالی۔ وہ تصویر بیشک مصوری کا ایک اعلا نمونہ تھی جس میں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ایک نہایت حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کے بال اس کی کنیز بنا رہی تھی۔ پتا نہیں لڑکی کس بات پر خفا تھی ——— لیکن یہ وقت مصوری کے معائنے کا نہیں تھا اس نے تصویر پلنگ پر پھینک دی اور جلدی جلدی تکیے پر غلاف چڑھانے لگی۔ لیکن نظریں اس کی تصویر پر جمی تھیں — اس کا دماغ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ سے تکیہ پھینک دیا اور لپک کر وہ تصویر پھر اٹھالی۔ وہ تصویر دیکھتی رہی — اس کے ہاتھ کانپے اور منہ سے بے اختیار نکلا "یا خدا!" اس کے سامنے برسوں پہلے کی بڑی سرکار بیٹھی تھیں، خفا سی، جن کے بالوں برسوں پہلے کی شمشاد بنا رہی تھی

کافی دیر بعد، ایمن جب لڑکھڑاتے قدموں سے وقار جنگ کے لاؤنج سے اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگی تو اس کی نظر حویلی کی خاموش بالکونی کی طرف اٹھ گئی ——— وہاں ایک سفید براق ہیولا سنگ مرمر کے ستون کا سہارا لیے ایک ٹک وقار جنگ کے بنگلے کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔

خاموشیاں سب کچھ نگل جاتی ہیں۔ شور میں صرف آواز گم ہوتی ہے، انسان نہیں کھوتا ———

امین کو ایسا لگا جیسے وہ ایک اُداس اور خاموش وادی میں پھینک دی گئی ہو۔ جہاں سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملتا۔ وہ چلّانا چاہتی ہے تو آواز نہیں نکلتی۔ ایک شکنجہ سا اس کے اطراف تنگ ہوتا جارہا تھا — جیسے تیسے وہ اپنے کوارٹر میں پہنچی۔ چھینٹ کے خوش رنگ پردے، پھول دانوں میں لگے پھول، اس کا صاف ستھرا کوارٹر، اس کے ابا کی تصویر، جیسے سب آج سوگ منا رہے تھے۔

ایش ٹرے میں جلے ہوئے سگریٹوں کا انبار دیکھ کر اسے اچانک بشارت نواب کا خیال آیا — وہ جا چکے تھے — اس ایک رات نے اس کا کیا کچھ نہیں چھین لیا تھا۔ وہ بالکل شل ہو کر بستر پر گر پڑی۔ رات کی اداسیاں رنگ لائیں — وقار جنگ صبح کی روشنی نہیں دیکھ پائے۔ بڑی سفاک رات تھی وہ جس نے اس سے ایک دوست اور ایک مشفق چھین لیا تھا۔

امین کی، بڑی سرکار کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ انھیں کسی دردمند کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا درد ان تکلفات سے کبھی کا گزر چکا تھا۔ اس پر برسوں کی دھول جم چکی تھی۔ وہ درد اب ان کا اثاثہ بن چکا تھا۔

آخر کار امین نے جرأت سے کام لیا اور تیار ہو کر بڑی سرکار کے پاس پہنچی۔ حویلی پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی خاموشی سے ہم کلام تھی۔ کوریڈور میں شمشاد بیٹھی بار بار پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ امین کو دیکھ کر اس نے کہا "اندر نکو جاؤ، بی بی — سرکار کا مزاج اچھا نہیں ہے — انوں آرام کر رہیں۔"

امین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ شمشاد کے منع کرنے کے باوجود اس سے ہوتے ہوتے برآمدے میں داخل ہو گئی۔

بید کی کرسی پر تنہا، چپ چاپ بڑی سرکار بیٹھی تھیں۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ امین کچھ دیر ان کے پیچھے کرسی تھامے کھڑی رہی — الفاظ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بڑی سرکار نے بالکل جنبش نہیں کی۔ انھیں شاید احساس بھی نہیں ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ امین مخل ہونا نہیں چاہتی تھی، لیکن طوفان میں گھری کشتی کو بادبان کی ضرورت تھی۔ امین گھوم کر ان کی کرسی کے برابر فرش پر بیٹھ گئی اور کرسی کے دستے پر رکھے ہوئے ان کے ہاتھ پر اپنا گال رکھ دیا — بڑی سرکار کچھ دیر اسی طرح ساکت بیٹھی رہیں — ان کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا — آنسو تو بدنام کرتے ہیں۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

بینکے تو سوزشِ دل بڑھاتے ہیں۔ پھر انھیں کیوں منہ لگایا جاتے؟

بڑی دیر بعد بڑی سرکار نے بہت دھیرے سے کہا۔ اگر وہاں مکمل خاموشی نہ چھائی ہوتی تو ایمن سن بھی نہیں پاتی۔

"کتاب ختم ہوگئی، ایمن بی بی ــــ تم کیوں آئی ہو؟ ۔ اب ہمیں کچھ نہیں لکھنا ہے۔"

ایمن کو آزر نواب کا سخت انتظار تھا۔ وہ آج سارا دن باہر ہی رہے تھے۔ پولو کھیل کر جب وہ واپس آتے تو وہ خود 'عالم پناہ' میں مصروف تھی ــــ نوارد بزرگ فرینچ جوڑے میں شوہر کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرکے اس مہمان کی طبیعت ٹھکانے آنے پر وہ آزر نواب کے پاس پہنچی تو پتا چلا کہ کپڑے تبدیل کرکے وہ کسی میٹنگ میں چلے گئے ہیں۔ آج وہ کچھ اکھڑی سی رہی تھی۔ حالات اور پیچے بعد دیگرے پیش آنے والی وارداتوں نے اسے شل سا کر دیا تھا۔ اور پھر آزر نواب کے برتاؤ نے اور بھی اسے بھتّے سے اکھیڑ دیا۔ کچھ دن سے یہی حال ہوگیا تھا۔ جب بھی وہ کسی کام سے ان کے پاس جاتی تو وہ مل نہیں پاتے تھے۔ کبھی وہ مصروف ہوتے، کبھی باہر جارہے ہوتے یا باہر سے آکر آرام کر رہے ہوتے۔ وہ شاید جان بوجھ کر اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کے یہاں اس کی حیثیت ایک ملازم کے سوا اور کچھ نہیں جسے ہر حال میں ان کے رحم و کرم پر رہنا ہے۔ اس نے بھی قسم کھالی تھی کہ اس روز انھیں ضرور خود سے ملنے پر مجبور کر دے گی، خواہ اسے رات بھر لائبریری کا پہرا کیوں نہ دینا پڑے اسے اب نتائج کا ڈر نہیں تھا۔ بہت ہوگا تو یہی نا کہ حویلی مجھے سدا کے لیے چھوڑنی پڑے، اس نے سوچا۔ اور اب تو اس کے لیے شاید بہتر یہی ہوگا کہ اس ماحول سے دور چلی جائے جہاں اس کے احساسات بوجھل سے بوجھل تر ہوتے جارہے تھے۔ اس میں اب اور سکت نہیں تھی۔ اگر خدا کو یہی منظور تھا کہ اس کی کشتی کے بادبان چھین لے تو یہی سہی۔

لائبریری کی روشنی کی طرف دیکھ کر اس نے کچھ توقف کیا، پھر مصمم ارادے سے آگے بڑھی۔

جب وہ لائبریری میں داخل ہوئی تو آزر نواب نے چیں بجبیں ہوکر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کام میں مصروف ہوگئے۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ان کے وجیہہ خد و خال بڑی صفائی سے اجاگر تھے۔ نیلے سلک کے زردوزی کی کام والے گاؤن کی آستین سے نکلا ہوا ان کا ہاتھ لکھتے لکھتے رک سا گیا تھا۔ کشادہ پیشانی، ستواں ناک اور گھنے ابروؤں کے نیچے سیاہ آنکھیں کچھ اور گہری ہوگئی تھیں ــــ ٹیبل لیمپ کے روشن ہالے

ے اوپر مدھم روشنی ان کے چہرے کو ایک جابرانہ وجاہت بخش رہی تھی۔ وہ ایمن کی طرف ایسی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی گستاخی کا جواز مانگ رہے ہوں۔

ایمن بھی سر سے کفن باندھ کر آئی تھی۔ اس نے ان کی بے رخی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ان کے سامنے ایک کاغذ رکھ دیا۔

"کیسا ہے یہ؟" — آزر نواب نے غرا کر پوچھا۔

"یہ میرے جارج کی برطرفی کا آرڈر ہے۔" ایمن نے بھی بالکل کاروباری انداز میں جواب دیا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"اس پر آپ کے دستخط ہیں۔"

"کیا یہ بتانا بھی ضروری ہے؟"

"میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب آپ نے مجھے 'عالم پناہ' کا نگراں مقرر کیا ہے تو پھر یہ بالابالا کارروائیاں کیوں ہو رہی ہیں؟" ایمن نے کہا۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ اتفاق سے ہوٹل 'عالم پناہ' کا مالک میں ہوں۔" آزر نواب کرسی پر ایک ہاتھ ٹکاتے ہوئے پلٹے۔

ایمن پل بھر کو ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر جھجکی۔ لیکن فوراً سنبھل کر اس نے کہا۔

"میں نے کبھی اس بات کا دعوا نہیں کیا کہ 'عالم پناہ' میری ملکیت ہے۔"

"شکریہ" — آزر نواب نے طنز سے کہا۔ "آپ جا سکتی ہیں۔" بظاہر انھوں نے بات ختم کر دی۔

"میں جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"آپ کو سننا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟" — آزر نواب گھومنے والی کرسی پر جھولتے ہوئے قلم سے کھیلنے لگے۔ لیکن ابرو سے ناراضگی کا بل نہیں گیا۔

"ایسی باتوں سے ڈسپلن خراب ہوتا ہے۔ اسٹاف من مانی کرے گا۔ اور یہ سراسر ظلم ہے — زیادتی ہے۔" ایمن نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"میں سمجھا نہیں کس ظلم کی بات کر رہی ہیں آپ ۔ کیسی زیادتی؟" وہ بظاہر امین کے جذباتی ہیجان سے بالکل لاتعلق تھے۔

"جارج کو بے قصور نکالا جا رہا ہے۔" امین نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"آپ کے خیال میں شراب پی کر ڈیوٹی پر آنا اور جھومتے ہوئے ایک لیڈی کی گود میں ساری پڈنگ اُنڈیل دینا قصور نہیں، بلکہ بہت اونچے درجے کا مذاق ہے؟" آذر نواب کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولے۔

اس انکشاف سے امین سن سی رہ گئی ۔۔۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنا قلعہ نہیں چھوڑا۔

"پھر بھی منیجر کو چاہیے تھا کہ اس بات کو پہلے میری نوٹس میں لاتا" اس نے کچھ ہلتی زمین پر پانو جمانے کی کوشش کی۔

"منیجر کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میں On the spot موجود تھا۔ ایسی باتوں سے عالم پناہ کی شہرت کو کتنی زک پہنچے گی؟"

جارج نے اسے سب کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف اپنی برطرفی کا نوٹس دکھا کر جس پر آذر نواب کے دستخط تھے، امین سے سفارش کی درخواست کی تھی۔ اور امین نے بجائے اس کے کہ اصل معاملے کی تفتیش کر کے کسی نتیجے پر پہنچتی، فوراً اسے کر لیا کہ وہ جارج کی ڈھال بنے گی۔ یہ اس کا کمزور پہلو تھا۔ لیکن اس کی محرک شاید امین کی الجھن بھی تھی ۔۔۔ کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ آذر نواب ہوٹل کے سینیر اسٹاف کو براہ راست بلانے لگے تھے۔

"جارج کو ایک موقع اور دینا چاہیے۔" اس نے کمزور سفارش کی۔

"میں اسے ضروری نہیں سمجھتا ۔۔۔ جب اسٹاف کا تقرر کیا جاتا ہے تو انھیں Conduct Rules کی کاپیاں دی جاتی ہیں۔ اور میں ایسے غیر ذمہ دار لوگوں کو اپنے اسٹاف میں رکھنا پسند نہیں کرتا جنھوں نے ہوٹل کے قوانین کو توڑا ہو۔" ان کی خشمگینی برقرار تھی۔

یہ آخری جھونکا تھا جو امین کے غصے کی مشعل اور بھی مشتعل کر گیا۔ آذر نواب اپنی مدلل بات ختم کر کے پلٹ گئے تھے۔ لیمپ کی دور تک پہنچتی مدھم روشنی میں ان کی دراز متناسب شخصیت ایک مینار کی طرح تھی۔ لائبریری کے قیمتی سیاہ فرنیچر اور اس کے سرخ مخمل کے پس منظر میں ان کا نیلا ڈریسنگ گاؤن اور اس پر کڑھی ہوئی کارچوبی دھک انھیں ایک مکمل بورژوائی رنگ دے رہی تھی۔

"آپ جا سکتی ہیں۔" انھوں نے اسی طرح ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے ہوئے پیچھے کھڑی

ایمن سے کہا۔ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"چلی جاؤں گی"۔ ایمن کے غصے کا باندھ ٹوٹ گیا۔ "میں ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی۔ مجھے خود ایسی قتل گاہ میں نہیں رہنا ہے جہاں انسانوں کے جذبات کو کچل دیا جاتا ہے۔ امارت کے رعب تلے دو محبت کرنے والوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے"۔ دروازے کے ہینڈل پر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اور منہ سے وہی فرسودہ الفاظ نکل رہے تھے جو شاید ہوش و حواس میں اس کی ہنسی کو دعوت دیتے۔ لیکن آج وہ آپے میں نہیں تھی۔ اسے آج غصہ کی شدت میں آزر نواب سے بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ آج سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

"کیا بک رہی ہو تم؟" آزر نواب کھولتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ "تم سمجھ رہی ہو بشارت نواب کو میں نے محض اس لیے یورپ بھجوا دیا کہ تمہارا عشق پروان نہ چڑھنے پاتے۔ مس ایمن تہامی

I care two hoots for that"

ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"یہاں بشارت نواب کا کیا ذکر ہے؟"۔ اس نے انھیں گھورا۔

"تو پھر کس کا ذکر ہے جو تمہیں یوں آپے سے باہر کر رہا ہے۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اور بھی تمہاری اداؤں کا شکار ہے؟"۔ آزر نواب نے گہرے طنز سے کہا۔

ایمن غصے سے باؤلی ہو رہی تھی۔ اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ "ہاں کوئی اور بھی ہے"۔ وہ دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے بول گئی۔ "میں بیگم زمرد محل اور وقار جنگ مرحوم کی بات کر رہی ہوں۔ جن کی محبت کو کفن پوش کر دیا گیا"۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا تاکہ چیتے کی طرح لپکتے آزر نواب کی دسترس سے فرار ہو جائے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ ایسا کر سکتی، ہاتھ کے درد سے بلبلا اٹھی، کیونکہ چشم زدن میں اس کے ہینڈل پر رکھے ہاتھ پر آزر نواب کی گرفت آہنی تھی۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔!" انھوں نے دانتوں تلے کہا "اس کا مطلب ہے تم جانتی ہو"

ایمن کی آنکھیں ان کی برماتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر بند ہو گئیں۔ ہینڈل پر اس کی انگلیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ آزر نواب کے ہاتھ کا شکنجہ اس وقت تک کستا گیا، جب تک اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑ گئی۔

"کیا جانتی ہو تم۔۔۔ کتنا جانتی ہو؟"۔ آزر نواب نے اس کی کلائی پکڑ کر واپس اسے لائبریری میں گھسیٹا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

"بتاؤ تم کتنا جانتی ہو؟ حویلی کے راز کو عام کرنے کی تمھیں جرأت کیسے ہوئی؟" انھوں نے اسے صوفے پر دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

ایمن اس ناگہانی حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکی — نرم گدیلے صوفے میں زخمی چڑیا کی طرح ڈھیر ہوگئی۔ اس نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ آذر نواب کی مغرور، فصیلی چٹان نما ہیئت کے آگے اسے اپنی بےچارگی کا زبردست احساس ہوا اور یہی احساسِ ذلت اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ اس نے اپنا گرا ہوا دوپٹا اٹھاکر کندھوں پر ڈالا اور کانپتے ہاتھوں سے چہرے پر بکھرے بالوں کو استوار کرنے لگی۔

آذر نواب دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے شعلے برساتی نظروں سے گھورتے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ بال ان کے بھی پریشان تھے جنھیں سنوارنے کی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے ڈریسنگ گاؤن کے پلو سرک گئے تھے۔ انھوں نے اندر شب خوابی کی قمیص نہیں پہنی تھی اور ان کا سنگلاخ سیاہ بالوں سے ڈھکا سینہ نظر آرہا تھا۔ ایمن نے انھیں اس طرح بےپروائی سے ملبوس کبھی نہیں دیکھا تھا — اسے بےچارگی کے ساتھ ان سے ڈر بھی لگا۔ وہ ڈرپوک نہیں تھی ڈرپوک ہوتی تو آذر نواب کو کھری کھری کبھی نہ سناتی لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ایک بپھرے ہوئے مرد کی طبعی قوت کے آگے ایک عورت ہمیشہ کمزور ہوجاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکتی تھی کیونکہ آذر نواب رستہ روکے کھڑے تھے۔ رو کر اپنی کمزوری کا اشتہار بننا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ کچھ اس کا ضمیر بھی ملامت کر رہا تھا کہ بڑی سرکار کے مقدس راز کو جو اس پر ظاہر ہوگیا تھا وہ کیوں زبان پر لے آئی اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے سامنے جس کا اس راز سے براہ راست تعلق تھا۔ اس نے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالا تھا اور اب پچھتا رہی تھی جب سانپ پھن پھیلائے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے جانے دیجیے"۔ اس نے بدقت تمام اپنے اندرونی ہیجان کو چھپاتے ہوئے کہا اور بظاہر متانت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانے دوں!" آذر نواب کی بےعیب بتیسی مدھم روشنی میں چمکی — انھوں نے ایمن کے بالوں کے نیچے اس کی گردن پر ہاتھ رکھے، اسے اپنی طرف کھینچا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈالے اسے مکمل طور پر محصور کرلیا۔ "ان سب شبہوں کے باوجود تمھیں جانے دوں جو میرے لیے تمھارے دل میں پلتے آتے ہیں — اور اب زبان پر آنے لگے ہیں۔؟ تم مجھے جابر ظالم اور درندہ سمجھتی ہو نا — بخدا، آج میں تمھارے ہر الزام کو سچ کر دکھاؤں گا"

ایمن کے بالوں کے اندر ان کی انگلیاں رینگنے لگیں۔ "ان سنہری آنکھوں کی معصومیت آج مجھے

نہیں ٹوکے گی ـــ یہ کانپتے لرزتے ہونٹ، تم جانتی ہو میرے لیے نئے نہیں ہیں ـــ ان کے شہد کو میں نے پہلے بھی چکھا ہے۔ میں بخدا آج تمھارے ہر الزام کو سچ کر دکھاؤں گا ـــ بخدا ـــ بخدا!!"

امین نے خود کو ان سے آزاد کرنے کی آخری کوشش کی، لیکن ان بازوؤں کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا آزر نواب کا ہاتھ اس کے بالوں کو کھینچ کر اس کا سر پیچھے جھکا رہا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اب اس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔

"خدا کے لیے ـــ خدا کے لیے" اس نے بے بس ہو کر کہا "میں نے آپ کو کبھی برا نہیں سمجھا" بے اختیار اس کے آنسو بہہ نکلے۔ آہ پر ان چند لمحوں میں ہی حقیقت آشکارا ہو گئی تھی ـــ کیا آزر نواب پر اس کا شدید غصہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ اس کی پہنچ سے باہر تھے؟ ـــ اسے اعتراف تھا کہ اس نے کئی بار ان کی محبت کو دل میں سر اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اسے ختم نہیں کر پائی تھی۔

وہ اس کی جھلمل جھلمل کرتی آنکھوں میں دیر تک دیکھتے رہے۔

"پھر کیا وجہ تھی کہ تم نے میری محبت کو ٹھکرا کر بشارت نواب کو اپنانا چاہا؟" ـــ آزر نواب نے اسے پلکیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اب ان کی آنکھوں میں غصہ کے ساتھ ایک سوال بھی تھا ـــ بہت ہی اہم سوال۔ جو امین کی زندگی کا سب سے اہم سوال تھا۔

امین کی آنکھوں کے سوتے ایکدم خشک ہو گئے ـــ وہ آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھنے لگی ـــ یہ کیا کہہ رہے تھے آزر نواب ـــ وہ کہیں بہک تو نہیں گئے تھے ـ؟؟ ـــ وہ اور محبت ـــ وہ بھی امین سے؟ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا ـ آزر نواب، جن پر ہر لڑکی کی حریص نظریں پڑتی تھیں جو ان کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں حویلی کی ایک معمولی ملازم لڑکی کی محبت میں کیسے گرفتار ہو سکتے تھے ـــ جسے کبھی انھوں نے اپنا اصلی مقام بھولنے نہیں دیا تھا اور جس نے خود بھی ہر قدم پر ان سے دامن بچایا۔ انھیں کڑوی کسیلی باتیں سنائیں!

"کیا تمھارے بشارت نواب نے بھی تمھیں اس طرح پیار کیا ہے؟" وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جھکے "اس طرح ـــ اس طرح ـــ اور اس طرح" امین ان کے مسمریزم کے زیر اثر گنگ سی ہو گئی تھی۔ جس شخص کی محبت کو وہ متواتر اپنے دل میں، نفرت میں بدلنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی ـ وہی اس سے اقرار محبت کر رہا تھا ـــ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ـــ رفتہ رفتہ آزر نواب کی گرفت ہلکی ہوئی، پھر بھی اس نے خود کو ان سے جدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ـــ اس کے ہاتھ پاؤں کی قوت گویا سلب ہو چکی تھی ـ بس ایک دل تھا کہ دھڑکے جا رہا تھا ـ اس کی سپردگی کا اثر آزر نواب پر کچھ اور ہی ہوا ـ انھوں نے امین کو پھر اپنی بانہوں میں لے لیا ـ لیکن اب ان کی

گرفت میں غصّے کی آگ اور سزا کی کرختگی نہیں تھی۔ ان کے لبوں کی درشتگی، نرمی اور وارفتگی میں بدل گئی۔
اس کی بند آنکھوں پر، لبوں پر، ماتھے پر، رخساروں پر ان کے لبوں کا لمس سرسراتا رہا ــــ اور ایمن کے وجود
پر جادو بن کر چھاتا رہا۔

"تم میری ہو امین، تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا" آزر نواب نے اس کا سر شانے سے لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔

ایمن اسی لمحے کو، اس بے پناہ لمحے کو اپنی زندگی کا حاصل بنا لینا چاہتی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا
جیسے وہ آزر نواب کی آواز نہیں، اس کی اپنی آرزو کی گونج تھی، جو اس کی روح کے کونے کونے سے
ٹکرا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس کا ہر دروازہ بند کر لینا چاہتی تھی جو حقیقت کے جھنجوڑنے
والے ہر اس جھونکے کو روک دے جو اسے اس کے خواب سے جگا سکتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت اس وقت
نرالی تھی ــ اسے آزر نواب کے الفاظ کا ہرگز یقین نہیں تھا نہ وہ خود کو ان کی محبت کے سراب کا شکار بنانا
چاہتی تھی۔ وہ تو اس ایک لمحے کو اپنی زندگی کا حاصل بنا لینا چاہتی تھی جو بہت جلد اس کی گرفت سے پھسل
جانے والا تھا۔ جواب اسے تاحیات کبھی میسّر نہ ہوگا۔ وہ لمحہ جو اس کی یک طرفہ محبت کا انجام تھا۔ وہ بس کچھ
دیر اور ان بانہوں کے گھیرے میں چند یادگار سانسیں لینا چاہتی تھی۔ جنھیں کئی بار اس نے اپنے تخیّل میں
محسوس کیا تھا۔ آزر نواب سے بدگمانی کی وہ دیوار جو اس نے بڑی کوششوں سے کھڑی تھی ــ وہ کیسے یقین
کر لیتی کہ پل بھر میں ڈھے گئی ــ

آزر نواب نے اپنا رخسار اس کے سر پر رکھ دیا اور رہ رہ کر اس کے بال چومتے جا رہے تھے۔
"میرے خواب ــــ میرے خواب کی تعبیر!" ــــ وہ گویا خود سے مخاطب تھے۔ لیکن ان کے
انھی الفاظ نے ایمن کو خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں گھسیٹ لیا۔ وہ اچانک ہوش میں آ گئی ــــ اس
نے پوری قوت سے آزر نواب کو دھکیل دیا۔ اور لڑکھڑا کر ٹیبل کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا چہرہ
پلٹا لیا، تاکہ اس پر امڈتی ہوئی رنگوں کی ہولی وہ نہ دیکھ پائیں۔

اس کے ہوش سنبھلتے دیر نہ لگی۔ اس کا غصہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک دردناک
احساس نے لے لی تھی کہ کس طرح اس نے اپنے حواس اور خودداری کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور آزر نواب
کے ہاتھوں میں موم کی گڑیا بن گئی تھی۔

کیسے کیسے ذہنی مرحلوں سے گزر کر اس نے خود پر قابو پایا تھا جو آزر نواب کے ذرا چھوتے ہی کھو گیا اسے
آزر نواب سے بھی شکایت تھی کہ انھوں نے صرف شکست خوردہ دیکھنے کے لیے اس کی دکھتی رگ کو چھوا تھا۔
وہ اپنے ہی محسوسات کے بوجھ تلے کانپتی رہی اور آزر نواب اسے خود پر قابو پانے کا وقت

ے کر شانت سے اسے دیکھتے رہے۔

"خود سے کشمکش چھوڑ دو ایمن"۔۔۔ آخر کار انھوں نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا
سان کو کبھی نہ کبھی حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے"۔۔۔ انھوں نے تھوڑی پکڑ کر اس کا سر اٹھایا۔ "تم جانتی ہو
مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔ گو کہ تم نے ہمیشہ ہی میری محبت کو اپنے دل میں گھونٹ دینے کی کوشش کی ہے۔
س کی وجہ غالب تمھاری وہ بے بنیاد بدگمانی ہے جو جان بوجھ کر تم نے میرے بارے میں اپنے دل میں
پیدا کی ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔۔۔
تمھیں مجھ سے نفرت ہوتی تو ہمارے دل اتنی دیر تک ایک ساتھ نہیں دھڑکتے۔

انھوں نے یہ بات اتنی نرمی سے کہی کہ ایمن کی ہمت پلٹ آئی۔ اس نے دھیرے دھیرے نظریں
اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور ان کے ہاتھ سے اپنے چہرے کو آزاد کرتی ہوئی بولی۔

"نواب صاحب! آپ کو اپنی ایک اور فتح مبارک ہو۔ پتا نہیں آپ نے کتنے ماتھے اپنی چوکھٹ
پر گھسوا دیے ہوں گے۔ جی ہاں۔۔۔ میں نے بھی آپ سے محبت کی ہے۔ آپ یہی چاہتے تھے نا۔۔۔
میرا اقرارِ شکست۔ اب آپ کی انا کو قرار آگیا ہوگا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی: "اب مجھے جانے دیجیے راستہ چھوڑ دیجیے میرا۔"

"کیا بک رہی ہو ایمن؟"۔۔۔ آذر نواب نے اپنا بازو راستے میں حائل کر دیا۔ "کس کا اقرار
شکست اور کیسی انا؟ یہی تمھارا وہم اور بدگمانی ہے جسے تم نے ہمیشہ اپنے دل میں یقین کی طرح پالا
ہے کہ ہر امیر خاندان کے مرد کا آوارہ ہونا لازمی ہے۔ تمھارے خیال میں ہر غریب کی ہر چھوٹی بڑی تکلیف
کے ذمہ دار امیر ہی ہیں۔ پیسا اگر خدا نے مجھے دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے کسی کا گلا کاٹ کر
تو پیسا نہیں چھینا۔۔۔ میں نے اس پیسے سے کسی کی عزت نہیں لوٹی"۔۔۔ اب آذر نواب کی گرفت بھی اس
کے شانے پر سخت ہو گئی۔

"آپ اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ آپ نے مجھے ہمیشہ کھلونا بنا کر کھیلنا چاہا"۔۔۔

"تم نے مجھے موقع ہی کب دیا کہ اپنی محبت کا سنجیدگی سے اظہار کر پاتا۔ اس صورت میں میں تم
سے صرف کھیل ہی تو کر سکتا تھا۔ تمھارا برتاؤ مجھے اکساتا تھا۔"

"میں اب اور آپ کا کھلونا نہیں بنوں گی"۔۔۔ ایمن نے اپنے احساسِ ہزیمت کی پردہ پوشی کرتے
ہوئے کہا: "مجھے جانے دیجیے۔ ورنہ میں چلّانا شروع کر دوں گی۔"

"چلّاؤ"۔۔۔ آذر نواب نے اسی طرح اس کا راستہ روکے کہا۔ "کوئی تم ہی سے پوچھے گا کہ
اتنی رات گئے، تم میرے پاس کیوں آئی تھیں۔"

امین ٹھٹک گئی ــــ "میری نیت صاف تھی"۔

"یہ ضروری نہیں کہ میری نیت بھی صاف ہو"۔ آزر نواب ہونٹ سکیڑ کر بولے۔

"یہ بلیک میل ہے"۔ اس نے انھیں گھور کر کہا۔

"جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے"۔ آزر نواب بولے۔

"یہاں یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــ ابھی تو تم نے اپنی محبت کا اقرار کیا ہے"۔ وہ بناوٹی حیرانی سے بولے۔

"مجھے انکار نہیں ہے"۔ امین نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن میری محبت بے لگام نہیں ہے کہ سر بازار رسوا ہوتی پھرے"۔

"میں یہی تو چاہتا ہوں امین کہ تمھاری محبت بھی میری ہی طرح بے لگام ہو جاتے ــــ تمھاری راتوں کی نیند بھی اسی طرح حرام ہو جاتے جیسی تمھاری وجہ سے میری ہو گئی ہے ـ میں نے بہت دن تک خود کو دھوکا دیا ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں، صرف تمھاری کشش ہے جو مجھے باولا بناتی ہے"۔ آزر نواب سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "جس شکست کی تم بات کرتی ہو وہ دراصل تمھاری فتح ہے امین ــــ ادھر آؤ"۔ آزر نواب اس کی کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے ٹیبل کی طرف لے گئے۔ اور دراز کھینچ کر اس میں سے کچھ نکالا۔

"پہچانتی ہو اسے؟" انھوں نے کہا۔

امین چونک پڑی ــــ ان کی لمبی انگلیوں کے ہاتھ میں ایک گوشوارہ چمک رہا تھا ــــ جو اس ایر رنگ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی ــ جو اس کے ڈھونڈھنے پر بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس کی مرحوم ماں کی نشانی تھی، جو اسے بہت عزیز تھا۔ اس نے بے اختیار اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن آزر نواب نے گوشوارہ دینے کی بجائے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولے۔

"یہ اس رات کی نشانی ہے جب تم نے مجھے اپنا سمجھ کر میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا، اس روز تمھارا یہ ایر رنگ میری اچکن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ جسے میں کئی بار چاہتے ہوئے بھی تمھیں نہ لوٹا سکا، کیونکہ یہ جھیل کے کنارے اس رد پہلی رات کا ضامن تھا جب تمھاری سنہری آنکھیں پہلی بار بے نقاب ہوتی تھیں اور مجھ سے کہا تھا لو ہم تمھارے ہوئے"۔

ایمن سر جھکائے سنتی رہی حالانکہ وہ سننا نہیں چاہتی تھی کیونکہ آزر نواب کے الفاظ پھر اس کے دل کی دھڑکن سے کھلواڑ کرنے لگے تھے۔

"تم میرے احساسات پر چھاتی گئیں ۔۔۔ کئی بار میں نے تمہارے سر کو اپنے تکیے کے برابر محسوس کیا ہے۔ کئی بار تمہارے ہاتھوں نے میری ٹائی کی گرہ درست کی ہے۔ کئی بار جب اسی ٹیبل پر میں نے تھک کر سر ٹکا دیا ہے تو تمہاری انگلیوں کو اپنے بالوں میں محسوس کیا ہے۔ لیکن عین اس وقت جب میں مطمئن ہونے لگا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے جگہ بن رہی ہے۔ میں نے تمہیں بشارت نواب کے ساتھ تمہارے کوارٹر میں دیکھا۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ میرے دل کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔؟ اور پھر چچا جان گزر گئے۔ میں ان کی بہت عزت کرتا تھا ایمن۔"

"میں ۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اس راز کا ذکر کر دیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" ایمن نے موقع پاکر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

آزر نواب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "معافی کی ضرورت نہیں ایمن دراصل اس ذکر سے میری زندگی کا سب سے بڑا ۔۔۔ میں اسے حادثہ ہی کہوں گا ۔۔۔ منسلک ہے۔" وہ ایمن کو لیے وہیں کوچ پر بیٹھ گئے۔ وہ پھر ان کی باتوں کی روانی میں بہہ گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ آزر نواب کے ہاتھ سے کھینچنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی نظریں آزر نواب کے ہینڈسم چہرے پر چڑھتے اترتے رنگ دیکھ رہی تھیں۔ اس کا وجود پھر ان کی باہوں کے لیے تڑپنے لگا

"چچا جان سے چھین کر سرکار کو ابا حضور سے بیاہ دیا گیا۔ ابا حضور اور چچا جان گو سوتیلے بھائی تھے، پھر بھی ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ابا حضور شکی مزاج بھی بہت تھے۔" آزر نواب نے اپنی انگلیاں بالوں میں دھنسا کر کہا۔ یہ ہمیشہ ان کے اندرونی ہیجان کا اظہار ہوتا تھا۔ ایمن نے بے اختیار ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہلکے سے دبایا، جیسے ذہنی طور پر ان کا ساتھ دے رہی ہو ۔۔۔

آزر نواب کہتے گئے :

"شادی کے بعد بدقسمتی سے کسی طرح ابا حضور کو سرکار اور چچا جان کے بارے میں پتا چل گیا اور ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ وہ ہمیشہ ہی چچا جان سے حسد کرتے تھے۔ اب اس حسد میں نفرت بھی شامل ہوگئی۔ وہ سرکار کے ماضی کو زندگی بھر معاف نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ ۔ ۔ ۔" آزر نواب کچھ رک کر آگے بڑھے۔ "حتیٰ کہ انھوں نے خود مجھے اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دیا۔"

امین ایسے چونکی جیسے کسی نے اچانک اس کے پیروں تلے سے فرش گھسیٹ لیا ہو۔
آزر نواب نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر سر دیوان کی بیک سے ٹکا دیا۔۔ ان کے وجیہہ چہرے پر دلی تکلیف کے آثار تھے۔

"انھوں نے کبھی مجھے ایک باپ کی گرم جوش محبت نہیں دی ۔۔۔ وہ دے ہی نہیں سکتے تھے وہ مجھے آستین کے سانپ کی طرح پالتے رہے۔ مجھے گورنس کے حوالے کر دیا گیا۔ سرکار کو حکم نہیں تھا کہ میری نرسری میں قدم رکھیں ۔۔ میں سرکار کی، مجھے کلیجے سے لگانے سے محرومی اور نظروں کی بے تابی کیسے بھول سکتا ہوں؟۔ ایک مہربان گورنس نے انھیں ایک بار چوری چھپے مجھ سے ملنے کا موقع دے دیا۔ سرکار مجھے کلیجے سے چپٹا کر اتنا روئیں کہ مجھے حیرت ہے یہ حویلی کیسے ان کے آنسوؤں میں بہنے سے بچ گئی۔۔ ابا حضور کو اس بات کی خبر ہو گئی۔۔ اس گورنس کو تو خیر فوراً برخاست کر دیا گیا لیکن سرکار پر جو بیتی وہ وہی جانتی ہوں گی۔ میں نے اپنی نرسری کی چار دیواری میں بہت تنہا بچپن گزارا ہے امین" آزر نواب نے کرب سے آنکھیں بند کر کے کہا۔ جیسے یادِ ماضی ان کے لیے عذاب تھی۔" وہ عالیشان نرسری مجھے جیسے کوئی بد دعا بن کر چمٹی ہوئی تھی۔ وہاں میں نے بچوں کے کھیل کبھی نہیں کھیلے۔ اب تمھاری سمجھ میں آیا ہو گا کہ 'عالم پناہ' کی نرسری کے لیے میں نے اتنی سختی سے مخالفت کیوں کی تھی۔

امین سب کچھ سمجھ رہی تھی۔۔ ایک تنہا، اداس پیارا سا بچہ اس کی نظروں میں ابھرا۔
"۔ ۔ ۔ ۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور معصوم کھلکھلاتے بچے اس منحوس فضا میں سانس لیں جس نے بہت کم عمری میں ہی میرے دل کو بغاوت، درشتگی اور احساسِ محرومی سے دوچار کر دیا تھا۔"

"بڑے نواب صاحب آپ کو آسانی سے عاق کر سکتے ہیں پھر بھی انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔؟"
امین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔

"یہ ان کا کامپلیکس تھا۔ خدا نے انھیں اور کوئی اولاد نہیں دی تھی ۔۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ دنیا کو یہ بات معلوم ہو ۔۔۔ وہ اسے اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ انھیں اپنی خاندانی عزت کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ جن محفلوں میں لوگ اپنے بچے ساتھ لاتے، وہاں وہ مجھے بھی شان و شوکت سے اپنے اکلوتے چہیتے بیٹے کی طرح لے جاتے ۔۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ مجھ پر جان نچھاور کرتے تھے اس بات کا چرچا بھی بہت تھا۔ صرف میں ہی جانتا تھا کہ وہ محض ان کا تصنع تھا ۔۔ میں سہما سہما ان کی انگلی پکڑے محفل میں داخل ہوتا سب کو بندگی کرتا اور دھڑکتے دل سے ان کے برابر بیٹھا رہتا۔ لوگ میری تہذیب اور شائستگی کی تعریف کرتے تو ابا حضور مسکرا کر شفقت سے میری طرف دیکھتے رہتے ۔ لیکن واپس حویلی

پہنچتے ہی ان کی خشمگینی عود آتی۔ میری انا کو سخت دھکا پہنچتا اور میں چاہتا کہ جلد سے جلد اُن کی نظروں سے دور ہو جاؤں ــــ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، میرے ڈر کی جگہ نفرت لینے لگی۔ میں نے اپنے اردگرد ایک حصار باندھنا شروع کر دیا، جہاں کوئی مجھے نہ چھو پاتے۔ میرے دل میں صرف سرکار بھر کی جگہ تھی ــــ انھوں نے رو رو کر اپنی جوانی کاٹی ہے۔ ایمن، لیکن ان کی رگوں میں بھی سلیمان جاہ کا خون تھا ــــ انھوں نے میری تعلیم پر آنچ نہ آنے دی۔ نہ انھوں نے میرے دل میں انسانیت کا خون ہونے دیا ــــ شاید یہی وجہ تھی کہ ریحانہ سے مجھے اتنی ہمدردی ہو گئی تھی۔"

ریحانہ کے نام پر ایمن سیدھی ہو بیٹھی ــــ "ریحانہ کچھ دن تک ہمارے ہوٹل کی مہمان رہ چکی ہیں۔" اس نے کہا "ان کے شوہر بھی ساتھ آئے تھے۔"

"جانتا ہوں۔" آزر نواب نے اس کے چہرے پر آئی لٹ کو ہلکے سے جھٹکا دیتے ہوئے مسکرا کر کہا "اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ریحانہ سے منسلک کرکے تم نے مجھے اتنا غصہ دلا دیا تھا کہ جی چاہا تھا تمھیں پیٹ دوں۔ اب تمھیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ــ تم نے دیکھا ہوگا کہ اب ریحانہ اقبال کے ساتھ کتنی خوش ہیں۔ ریحانہ کے سلسلے میں آدھا قصور ریاض صاحب کا تھا ــــ اور وہ مجھے بھی ضرور بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔"

"آپ کو"؟ ــــ ایمن نے چونک کر پوچھا۔

"لیکن میں نے انھیں اولاد کی محبت سے مجبور انسان سمجھ کر معاف کر دیا۔"

"میں کبھی نہیں۔" ایمن نے حیران ہو کر کہا۔

"بتاتا ہوں ــ تم یہ تو جانتی ہو کہ ٹمبر فیکٹری میں ریاض صاحب کا بھی کافی پیسا لگا ہوا ہے ــــ وہ موقع خاص طور سے ایسا تھا کہ اگر ریاض صاحب اپنا پیسا نکال لیتے تو مجھے پریشانی ہو سکتی تھی کیونکہ میں نے نئی مشینری کا آرڈر دے دیا تھا اور مجھے پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ ریاض صاحب نے میری مجبوری سے فائدہ اس طرح اٹھانا چاہا کہ میں ریحانہ سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤں ــــ اتفاق سے میری شکل شاید اقبال سے کچھ کچھ ملتی ہے۔ وہ اپنے پیسے کے بھرم میں اقبال کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اور شاید اپنی بیٹی کو بھی۔ محض اس وجہ سے کہ ہم دونوں میں مشابہت ہے وہ سمجھ رہے تھے کہ ریحانہ اب اقبال کو بھول جائے گی۔ وہ اقبال کو بھی سبق پڑھانا چاہتے تھے کہ مالدار خسر سے ٹکر لینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اقبال نے ڈھٹائی سے ان کا مقابلہ کیا تھا ــــ مجھے ریاض صاحب کی حرکت نے بہت طیش دلایا تھا، لیکن ساتھ ہی ریحانہ سے مجھے ہمدردی تھی کیونکہ اس میں ان کا قصور صرف ان کی نادانی تھی۔ اسی لیے ایک طرف تو میں ان کے ذہن کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتا رہا دوسری طرف اقبال کو سمجھاتا رہا ــــ

پھر ایک دن میں نے چپکے سے انھیں ڈانڈیلی بلالیا۔ اور نتیجہ تم دیکھ رہی ہو"۔ آزر نواب نے فاتحانہ احساس کے ساتھ اسے مسکرا کر دیکھا۔ ایمن کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"لیکن سرکار کی جنرل اسسٹنٹ کی مدد کے بغیر شاید میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو پاتا"، آزر نواب کا جنرل اسسٹنٹ کہنا آج اس کے غصّے کا باعث نہیں ہوا ــــ بلکہ وہ ہنس پڑی۔

آزر نواب شوق سے اس کے گالوں میں ظاہر ہوئے گڑھوں کو دیکھتے رہے "تمھارے گالوں کے گڑھوں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے تمھارے ابّا کے نقش قدم پر چلوں"۔

"میں چلی جاؤں گی"۔ ایمن نے اپنے چہرے پر چڑھتی گلابی لہر کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں جانا ہوتا تو کبھی کی چلی گئی ہوتیں ـــ اب تم کہیں نہیں جاؤ گی ایمن شہاب"۔ آزر نواب نے اس کی ہتھیلی کھول کر اسے لبوں تک لے جاتے ہوئے کہا۔

"اس رات شادی میں تم میرے تھکے ہوئے دماغ کے لیے خوشبودار ہوا کا تر و تازہ جھونکا تھیں۔ میں خود کو روک نہ پایا"۔ آزر نواب سے وہ پہلی ملاقات وہ دس جنم میں بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ "پھر میں کبھی ذہنی طور پر تم سے جدا نہ ہو پایا"۔ آزر نواب اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "حالانکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ کبھی کسی عورت سے قریبی مراسم ہرگز نہیں رکھوں گا۔ میں نے تمھیں بھی بس معطر جھونکا سمجھا تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ خواب تھا ــــ دیکھا اور بھلا دیا۔ شاید میں اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر دوبارہ تم مجھے ڈانڈیلی میں نہ مل جاتیں"۔ آزر نواب نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا ــــ وہ کھوئے ہوئے انداز میں اپنے دل کے راز کھولتے جا رہے تھے۔

"میں تمھاری ان سنہری آنکھوں کے دام میں پھنستا گیا۔ تمھیں پانے کی، تمھیں اپنانے کی آرزو بڑھتی گئی۔ تمھاری ذہانت اور سلجھے ہوئے ذہن نے اور بھی مجھے جیت لیا ـــ لیکن تمھارے دل میں میری طرف سے سو شبہات تھے۔ ڈر تھا، بدگمانیاں تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا کہ تم ان سب رکاوٹوں سے گزر کر میرے بہت قریب آگئی ہو، لیکن فوراً تم پھر سرحد کے پار جا کھڑی ہوتیں اور میں جہاں تھا وہیں لوٹ جاتا۔ بتاؤ ایمن"۔ انھوں نے اپنے سینے پر اس کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے پوچھا "یہ کھیل آخر کب تک چلتا رہے گا؟"۔

کیا کہہ رہے تھے آزر نواب یہ؟ - کیا جواب دے سکتی تھی وہ ان کے سوال کا، جب کہ وہ خود اپنے لیے ایک مجسّم سوال بن کر رہ گئی تھی۔ اس نے شکر کیا کہ کم از کم اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت ابھی

معدوم نہیں ہوئی تھی ۔ اس نے آذر نواب سے محبت کی تھی اور جواب میں ان کی محبت کو پا بھی لیا تھا۔ لیکن شاید یہیں ان کا راستہ کہیں اندھیرے میں کھو جاتا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی ـــ شاید وہ جو کچھ کہنے والی تھی اس کے لیے ہمت اور بے جگری سے سوچنے کی اشد ضرورت تھی۔ وہ آذر نواب سے الگ ہو کر بیٹھی ہوئی بولی۔" بات اتنی کھل چکی ہے کہ کچھ چھپانے کی کوشش بیکار ہے،" وہ ہمت سے آگے بڑھی" ہاں، میں نے آپ سے محبت کا اقرار کیا ہے اور مجھے زندہ رکھنے کے لیے یہ ایک احساس کافی ہے ۔ لیکن محبت تو دل کی ٹھوکر ہے ۔ اس ایک ٹھوکر پر حقیقت کو نہیں تولا جا سکتا۔ آپ یکیسے بھول رہے ہیں کہ شاہانہ صاحبزادی سے آپ کی شادی طے ہے، بلکہ حویلی میں اس کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی ہیں "۔ اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا" کیا میں ـــ میں اتنا گر سکتی ہوں کہ شاہانہ صاحبزادی سے آپ کو چھین لوں ـ اتنی خودغرض بن جاؤں ؟"

"بی بی ایمن شہاب،" آذر نواب نے نہایت رسانی سے کہا ۔" کیا شاہانہ صاحبزادی سے میری شادی آپ نے طے کی ہے ؟ ۔ ادباً گزارش ہے کہ ابھی آپ کو اتنا حق حاصل نہیں ہوا ہے کہ میرے معاملے آپ طے کریں "

ایمن کچھ نہیں سمجھی۔

"اس حویلی میں شادی ضرور ہو رہی ہے ـــ اور شاہانہ ہی کی ہو رہی ہے، لیکن میرے ساتھ نہیں ـــ اسے میں نے ہمیشہ اپنی چھوٹی نٹ کھٹ بہن ہی سمجھا ہے ۔ اپنی ذمہ داری سمجھا ہے ۔ شاہانہ کی شادی سیمبر تنویر سے ہو رہی ہے "۔

ایمن کا دل خوشی سے اچھل کر حلق سے آ لگا۔ لیکن اس نے اپنا سر جھکا لیا تاکہ آذر نواب اس کی آنکھوں کی بے تابی نہ دیکھ پائیں ـ وہ اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں کو دوپٹے میں چھپاتے ہوئے بولی۔

"لیکن ـــ شاید ... بڑی سرکار ... ان کی اجازت کے بغیر ..." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی ۔

"تم سمجھتی ہو سرکار جانتی نہیں ہیں ۔ ؟ انھوں نے خود ہی مجھ سے ایک لڑکی کے بارے میں بات کی تھی جس کا چمپئی رنگ ہے ـــ لمبے لمبے بال ہیں ـــ سنہری، دیوانہ بنانے والی آنکھیں ہیں ـــ جو ذہین ہے دنیا بھر کے کام کر لیتی ہے ـــ اور ..." انھوں نے دھیرے سے کہا۔ "... اور جو ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں .... " وہ اس پر جھکے۔

ایمن ان کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی آذر نواب بھی ۔ اس کے

دل میں اچانک وہاں سے بھاگ جانے کی خواہش جاگی، لیکن آذر نواب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"کیا اب مجھے اجازت ہے ـــــ کہ ملزموں کے کٹہرے سے نکل آؤں؟" انھوں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا سرا اونچا کر کے کہا۔
ان کی نظریں میں۔جواب دینا ضروری نہیں تھا۔ ایمن اپنی پناہ گاہ خوب پہچانتی تھی۔ وہ آذر نواب کے سینے سے جالگی۔
پو پھٹ رہی تھی۔ دریچے سے باہر باغ میں دگ مھرنے لگا تھا۔ وسیع سبزلان پر جا بجا خوش رنگ پھول سر اٹھانے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فضا ننھی کلیوں کی خوش بو سے معطر ہوگئی۔